AUGUST 2010

خواتین اور دوشیزاؤں کے

خواتین ڈائجسٹ

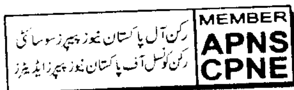
ناولٹ نمبر

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37 - اردو بازار کراچی





زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 500 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 4000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 5000 روپے

اگست 2010

جلد 38 شمارہ 4

قیمت 40 روپے



خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس مہینے میں رمضان المبارک کے مقدس مہینے کا آغاز ہو رہا ہے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں ہی پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ وقت کے الٹ پھیر نے ایک بار پھر یہ ساعتیں یکجا کر دی ہیں۔

14۔اگست وہ تاریخ ساز دن جب اللہ تعالیٰ نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک عظیم نعمت، ایک علیحدہ وطن سے نوازا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنہرا باب رقم ہوا اور وہ کام جو ناممکن نظر آتا تھا، مسلمانوں نے اپنے عزم، حوصلے، استقامت اور اتحاد سے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ممکن کر دکھایا۔

قدرت کی مہربانیاں بھی شامل حال رہیں۔ وہ کون سی نعمت ہے جو پاکستان کو حاصل نہیں۔ زرخیز زمینیں، دریا، سمندر اور محنت کش غیور عوام لیکن افسوس کہ پاکستان حاصل کرتے وقت ہم ایک قوم تھے۔ پاکستان کی تعمیر کرتے وقت ہم یہ بھول کر رنگ، نسل اور زبان کی بنیاد پر ٹکڑوں میں بٹ گئے۔

حال ہی میں جو فضائی حادثہ پیش آیا ہے، اس میں سینکڑوں جانیں لقمۂ اجل بن گئیں۔ دوسری طرف سیلاب کی صورت حال ہے۔ اس میں ہزاروں جانیں ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ آج وطن عزیز ہر طرف سے مشکلات اور بحرانوں میں گھرا ہوا ہے۔ زخموں سے چُور چُور ہے۔

رمضان المبارک کی خصوصی دعاؤں میں پاکستان کے تحفظ اور بقا کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن پاک کو محفوظ و مامون رکھے۔ اور ہم سب کو رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عید نمبر،

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔

عید نمبر میں مہندی کے ڈیزائن، عید کے پکوان اور دیگر سلسلوں کے ساتھ قارئین سے خصوصی سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ وطن عزیز کی موجودہ صورت حال میں بے شمار گھرانے مصائب میں مبتلا ہیں۔ خوشی کے اس موقع پر ہم اپنے طور پر ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

2۔ عید کے لوازمات چوڑیاں، مہندی، نئے کپڑے، عمدہ پکوان آپ کو ان میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟

3۔ کوئی ایسی نمکین ڈش جو آپ کے مہمان بہت پسند کرتے ہوں۔ اس کی ترکیب لکھیے؟

ان سوالوں کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں پچیس اگست تک موصول ہو جائیں۔

محمود خاور کی برسی،

وقت ایک طویل مسافت طے کر چکا ہے لیکن کچھ لوگ دنیا سے رخصت ہو جائیں تب بھی ان کا کام انہیں زندہ رکھتا ہے۔ محمود خاور بھی ایسی ہی ہستی تھے۔ آج بھی ان کی محبت اور ان کی یادیں ہمارے دلوں میں تابندہ ہیں۔

20۔اگست کو محمود خاور کی برسی کے موقع پر آپ سب سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- عنیزہ سید، نعیمہ ناز، نمرہ بخاری اور نسیم ارشد کے ناولٹ،
- بیلی راجپوتاں کی ملکہ۔ نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- محبت خواب سفر۔ رخسانہ نگار عدنان کا ناول،
- ایف ایم 101 کے پروڈیوسر ریحان اسعدی سے باتیں،
- حریم دل و جاں تو۔ مقدس مشعل کا مکمل ناول،
- قانتہ رابعہ اور نادیہ جہانگیر کے افسانے،
- مشہور ڈراما نگار، شاعر سید وصی شاہ سے ملاقات،
- باتیں کتابوں کی۔ نئی کتابوں پر تبصرہ،
- اس کا ہنر ہیں۔ مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

شب قدر کی فضیلت کا بیان

(سورۃ قدر میں) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ۔

''ہم نے اس (قرآن مجید) کو شب قدر میں اتارا اور تو نے کیا سمجھا کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس میں فرشتے 'روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) کے ساتھ اپنے رب کے حکم سے ہر بات کا انتظام کرنے کو اترتے ہیں۔ اور صبح تک یہ سلامتی کی رات قائم رہتی ہے۔''

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص رمضان کے روزے ایمان اور احتساب (حصول اجر وثواب کی نیت) کے ساتھ رکھے 'اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اور جو لیلۃ القدر میں ایمان و احتساب کے ساتھ نماز میں کھڑا رہے 'اس کے بھی پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

شب قدر کو رمضان کی آخری طاق راتوں میں تلاش کرنا

ہم سے عبداللہ ابن یوسف نے بیان کیا' کہا کہ ہم کو امام مالک نے خبر دی ' انہیں نافع نے اور انہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اصحاب کو شب قدر خواب میں (رمضان کی) سات آخری تاریخوں میں دکھائی گئی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سب کے خواب سات آخری تاریخوں پر متفق ہو گئے ہیں۔ اس لیے جسے اس کی تلاش ہو'وہ اسی ہفتہ کی آخری (طاق) راتوں میں تلاش کرے۔''

یہ مبارک رات رمضان شریف کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے اور یہ ہر سال مستقل ہوتی رہتی ہے۔ شافعیہ نے اکیسویں رات کو ترجیح دی

ہے اور جمہور نے ستائیسویں رات کو، مگر صحیح تر یہی ہے کہ اسے ہر سال کے لیے کسی خاص تاریخ کے ساتھ متعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہر سال منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ ایک پوشیدہ رات ہے۔

علماء نے کہا کہ اس رات کے مخفی ہونے میں یہ حکمت ہے کہ اس کی تلاش کے لیے کوشش کی جائے۔ اگر اسے معین کر دیا جاتا تو پھر اس رات پر اکتفا کر لیا جاتا۔

مختلف آثار میں اس رات کی کچھ نشانیاں بھی بتلائی گئی ہیں، مگر وہ آثار بطور امکان ہیں، بطور شرط کے نہیں ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں اس کی ایک علامت بارش ہونا بھی بتلایا گیا ہے۔ مگر کتنے ہی رمضان ایسے گزر جاتے ہیں کہ ان میں بارش نہیں ہوتی حالانکہ ان میں لیلتہ القدر کا ہونا برحق ہے۔ پس بہت دفعہ ایسا ہونا ممکن ہے کہ ایک شخص نے عشرہ آخیر کی طاق راتوں میں قیام کیا اور اسے لیلتہ القدر حاصل بھی ہو گئی۔ مگر اس نے اس رات میں کوئی امر بطور خوارق عادت نہیں دیکھا۔ اس لیے حافظ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں یعنی ہم یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ لیلتہ القدر کو وہی پہنچ سکتا ہے جو کوئی امر خارق دیکھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل بہت فراخ ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا "یا رسول اللہ! میں لیلتہ القدر میں کیا دعا پڑھوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ یہ دعا بکثرت پڑھا کرو۔

"یا اللہ! تو معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے، پس تو میری خطائیں معاف کر دے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

"میں نے کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ رات پہلے انبیا کے ساتھ بھی ہوا کرتی تھی کہ جب وہ انتقال کر جاتے تو وہ رات اٹھا دی جاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ وہ رات باقی ہے۔"

اور امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے جو انہوں نے موطا میں نقل کیا ہے کہ مجھے پہنچا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی عمریں کم ہونے کا احساس ہوا جب کہ پہلی امتوں کی عمریں بہت طویل ہوا کرتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو لیلتہ القدر عطا فرمائی، جس سے آپ کی اُمت کو تسلی دینا مقصود تھا جن کی عمریں بہت چھوٹی ہیں اور یہ رات ایک ہزار مہینے سے بہتر ان کو دی گئی۔" (ملخص)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا ذکر فرمایا جس نے ایک ہزار مہینے تک اللہ کی راہ میں جہاد کیا تھا۔ اس کو سن کر مسلمانوں کو بے حد تعجب ہوا، اس پر یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی۔ مفسرین نے کہا ہے کہ پہلے زمانے میں ایک شمسون نامی نبی تھے، جو ایک ہزار ماہ تک اللہ کے دین کے لیے جہاد فرماتے رہے اور اس تمام مدت میں انہوں نے اپنے ہتھیار جسم سے نہیں اتارے، یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس طویل عمر کے لیے تمنا ظاہر کی، تاکہ وہ بھی اس طرح خدمت اسلام کریں۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی اور بتلایا گیا کہ تم کو صرف ایک ایسی رات دی گئی جو عبادت کے لیے ایک ہزار ماہ سے بہتر و افضل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(شب قدر کو) تلاش کرو۔"

تشریح : جس کی صورت یہ کہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں جاگو اور عبادت کرو۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے اور فرماتے۔

"رمضان کے آخری عشرہ میں شب قدر کو تلاش کرو۔"

تشریح : آخری عشرہ کی طاق راتوں میں جاگو اور عبادت کرو۔

لوگوں کا جھگڑا

عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں شب قدر کی خبر [illegible] تشریف لا رہے تھے کہ دو مسلمان آپس [illegible] جھگڑا کرنے لگے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ [illegible] نے فرمایا۔

[illegible] میں آیا تھا کہ تمہیں شب قدر بتادوں لیکن فلاں اور فلاں نے آپس میں جھگڑا کرلیا۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا۔ اور امید یہی ہے کہ تمہارے حق میں یہی بہتر ہو گا۔ پس اب تم اس کی تلاش (آخری عشرہ کی) نویا سات یا پانچ (کی راتوں) میں کیا کرو۔"

آخری عشرہ کی عبادت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ "جب (رمضان کا) آخری عشرہ آتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تہبند مضبوط باندھتے (یعنی اپنی کمر پوری طرح کس لیتے) اور ان راتوں میں آپ خود بھی جاگتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگایا کرتے تھے۔"

تشریح : کمر کس لینے کا مطلب یہ کہ آپ اس عشرہ میں عبادت الٰہی کے لیے خاص محنت کرتے۔ خود جاگتے گھر والوں کو جگاتے اور رات بھر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سارا عمل تعلیم امت کے لیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔ اے ایمان والو! اللہ کے رسول تمہارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی اقتدا کرنا تمہاری سعادت مندی ہے یوں تو ہمیشہ ہی عبادت الٰہی کرنا بڑا کار ثواب ہے لیکن رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت الٰہی کرنا بہت ہی بڑا کار ثواب ہے۔ لہٰذا ان ایام میں جس قدر بھی عبادت ہوسکے غنیمت ہے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرنا' اور اعتکاف ہر ایک مسجد میں درست ہے

یعنی اعتکاف کے لغوی معنی کسی چیز کو اپنے لیے لازم کرلینا اور اپنے نفس کو اس پر مقید کردینا اور شرعی معنی میں کسی بھی مسجد میں کسی مقرر آدمی کی طرف سے کسی مخصوص طریقہ کے ساتھ کسی جگہ کو لازم کر لینا اور یہ اعتکاف اجتماعی طور پر واجب نہیں ہے۔ ہاں کوئی اگر نذر مانے یا کوئی شروع کرے مگر درمیان میں قصداً" چھوڑ دے تو ان پر ادائیگی واجب ہے۔

اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا شرط ہے جو آیت قرآنی 2/ البقرہ 187) سے ثابت ہے۔ یعنی حنیفہ نے عورتوں کے لیے اعتکاف جائز رکھا ہے اس صورت میں کہ وہ اپنے گھروں کی ان جگہوں میں اعتکاف کریں جو جگہ نماز کے لیے مخصوص کی ہوئی ہوتی ہیں۔ امام زہری اور سلف کی ایک جماعت نے اعتکاف کو جامع مسجد کے ساتھ خاص کیا ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا بھی تقریباً" ایسا ہی اشارہ ہے اور یہ مناسب بھی ہے تاکہ **معتکف** با آسانی ادائیگی جمعہ بھی کر سکے۔ رمضان شریف کے پورے آخری عشرہ میں اعتکاف میں بیٹھنا مسنون ہے۔ یوں ایک دن ایک رات یا اور بھی کوئی کم مدّت کے لیے بیٹھنے کی نیت کرے تو اسے بھی بقدر عمل ثواب ملے گا۔

سنن ابو داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ "یعنی **متعکف** کے لیے سنّت ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت کے لیے نہ جائے اور نہ کسی جنازہ پر حاضر ہو اور نہ اپنی عورت کے قریب جائے اور کسی حاجت کے لیے اپنی جگہ سے باہر نہ نکلے مگر جس کے لیے نکلنا بے حد ضروری ہو۔ جیسا کہ کھانا پینا یا قضائے حاجات کے لیے جانا۔ اگر **معتکف** ایسے کاموں کے لیے نکلا اور مسجد سے خارج ہی وضو کر کے واپس آگیا تو اس کے اعتکاف میں کوئی خلل نہ ہوگا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک برابر رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اعتکاف کرتی رہیں۔

صرف ایک رات کے لیے اعتکاف کرنا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"میں نے جاہلیت میں یہ نذر مانی تھی کہ مسجد حرام میں ایک رات کا اعتکاف کروں گا۔"

آپ نے فرمایا "اپنی نذر پوری کر۔"

تشریح: نذرونیاز جو خالصاً "اللہ کے لیے ہو اور امر جائز کے لیے جائز طور پر مانی گئی ہو اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ اعتکاف بھی ایسے امور میں داخل ہے اگر کوئی غلط نذر مانے جیسا کہ ایک شخص نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تھی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باطل قرار دیا۔ اس طرح دیگر غلط نذر و منت بھی توڑی جانی ضروری ہیں۔ غیر اللہ کے لیے کوئی نذر و منت ماننا شرک میں داخل ہے۔

عورتوں کا اعتکاف کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ میں آپ کے لیے (مسجد میں) ایک خیمہ لگا دیتی اور آپ صبح کی نماز پڑھ کے اس میں چلے جاتے تھے۔ پھر حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی عائشہ رضی اللہ عنہا سے خیمہ کھڑا کرنے کی (اپنے اعتکاف کے لیے) اجازت چاہی' عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اجازت دے دی اور انہوں نے ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔ جب زینب بنت حجش رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو انہوں نے بھی (اپنے لیے) ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔

صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی خیمے دیکھے تو فرمایا "یہ کیا ہے؟" آپ کو ان کی حقیقت کی خبر دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم سمجھتے ہو یہ خیمے ثواب کی نیت سے کھڑے کیے گئے ہیں؟"

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینہ (رمضان) کا اعتکاف چھوڑ دیا اور شوال کے عشرہ کا اعتکاف کیا۔

یعنی عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اعتکاف نہ کرے اور بغیر اجازت اعتکاف کی صورت میں خاوند کو حق ہے کہ وہ عورت کا اعتکاف ختم کرا دے اور اعتکاف کے لیے مساجد میں خیمہ لگانا درست ہے اور عورتوں کے لیے افضل یہی ہے کہ وہ مساجد میں اعتکاف نہ کریں اور معتکف کے لیے اپنی جگہ میں داخل ہونے کا وقت نماز فجر کے بعد کا وقت ہے۔ یہ اوزاعی کا قول ہے لیکن ائمہ اربعہ اور ایک جماعت علما کا قول یہ ہے کہ سورج غروب ہونے سے قبل اپنے مقام میں داخل ہو۔

معتکف کا مسجد کے دروازے تک جانا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیوی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خبر دی کہ وہ رمضان کے آخری عشرہ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے مسجد میں آئیں تھوڑی دیر تک باتیں کیں پھر واپس ہونے کے لیے کھڑی ہوئیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہیں پہنچانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ جب وہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے دروازے سے قریب والے مسجد کے دروازے پر پہنچیں تو دو انصاری آدمی ادھر سے گزرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی سوچ کی ضرورت نہیں' یہ تو (میری بیوی) صفیہ بنت حیئ ہیں۔"

ان دونوں صحابیوں نے عرض کیا "سبحان اللہ! یا

رسول اللہ!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"شیطان خون کی طرح انسان کے بدن میں دوڑتا رہتا ہے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں تمہارے دلوں میں وہ برا خیال نہ ڈال دے۔"

تشریح : اس حدیث سے ثابت ہوا کہ معتکف [illegible] کام کے لیے مقام اعتکاف سے باہر نکل سکتا [illegible] حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس لیے [illegible] رہ گئی تھیں۔ کہتے ہیں ان کا مکان بھی [illegible] تھا بعض روایتوں میں ان کو دیکھنے والوں کے متعلق ذکر ہے کہ انہوں نے آگے بڑھ جانا چاہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقت حال سے آگاہ فرمانے کے لیے ان کو بلایا۔ معلوم ہوا کہ کسی گمان شک کو دور کردینا بہرحال اچھا ہے۔

صرف رات بھر کے لیے اعتکاف کرنا

عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"میں نے جاہلیت میں یہ نذر مانی تھی کہ مسجد حرام میں ایک رات کا اعتکاف کروں گا۔"

آپ نے فرمایا "اپنی نذر پوری کر۔"

تشریح : نذرونیاز جو خالصتاً اللہ کے لیے ہو اور امر جائز کے لیے جائز طور پر مانی گئی ہو اس کا پورا کرنا واجب ہے اعتکاف بھی ایسے امور میں داخل ہے اگر کوئی غلط نذر مانے جیسا کہ ایک شخص نے پیدل چل کر [illegible] کی نذر مانی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باطل قرار دیا۔ اس طرح دیگر غلط نذرو منّت بھی [illegible] ضروری ہیں۔ غیر اللہ کے لیے کوئی نذر و منت ماننا شرک میں داخل ہے۔

عورتوں کا اعتکاف کرنا

عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ میں آپ کے لیے (مسجد میں) ایک خیمہ لگا دیتی اور آپ صبح کی نماز پڑھ کے اس میں چلے جاتے تھے۔ پھر حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی عائشہ رضی اللہ عنہا سے خیمہ کھڑا کرنے کی (اپنے اعتکاف کے لیے) اجازت چاہی عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت دے دی اور انہوں نے ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔ جب زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو انہوں نے بھی (اپنے لیے) ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔

صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی خیمے دیکھے تو فرمایا "یہ کیا ہے؟"

آپ کو ان کی حقیقت کی خبر دی گئی۔ آپ نے فرمایا۔

"کیا تم سمجھتے ہو یہ خیمے ثواب کی نیت سے کھڑے کیے گئے ہیں؟"

پس آپ نے اس مہینہ (رمضان) کا اعتکاف چھوڑ دیا اور شوال کے عشرہ کا اعتکاف کیا۔

یعنی عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اعتکاف نہ کرے اور بغیر اجازت اعتکاف کی صورت میں خاوند کو حق ہے کہ وہ عورت کا اعتکاف ختم کرا دے اور اعتکاف کے لیے مساجد میں خیمہ لگانا درست ہے اور عورتوں کے لیے افضل یہی ہے کہ وہ مساجد میں اعتکاف نہ کریں اور معتکف کے لیے اپنی جگہ میں داخل ہونے کا وقت نماز فجر کے بعد کا وقت ہے۔ یہ اوزاعی کا قول ہے لیکن ائمہ اربعہ اور ایک جماعت علما کا قول یہ ہے کہ سورج غروب ہونے سے قبل اپنے مقام میں داخل ہو۔



ہمارا مُلک

انشا جی

ہمارا ملک

ایران میں کون رہتا ہے؟
ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔
انگلستان میں کون رہتا ہے؟
انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے۔
فرانس میں کون رہتا ہے؟
فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔
یہ کون سا ملک ہے؟
یہ پاکستان ہے۔
اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟
نہیں' اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔
اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔
اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔
اس میں یہ قوم رہتی ہے۔
اس میں وہ قوم رہتی ہے۔
لیکن پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔
سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔
پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟
غلطی ہوئی۔ معاف کردیجئے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ' بڑا دانش مند' مہربان اور انصاف پسند۔ اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اسے بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جمجاہ کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دور دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے اور اخبار آزاد تھے کہ جو چاہیں کہیں' جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو' خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی تھی' کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی جو لوگ لکھ پتی تھے' دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے حسن انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اچھالتے اچھالتے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک بلکہ بعض اوقات بیرون ملک بھی چلے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لیے جارہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش اسے ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے یا اس کی کامرانی کے لیے چلّے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں عفو و درگزر کا مادہ ازحد تھا' اگر کوئی آکر شکایت کرتا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائیداد ہتھیالی ہے یا فلاں کارخانے پر قبضہ کرلیا ہے تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو' وہ کمال سیر چشمی سے اسے معاف کردیتے تھے۔ بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بکیں لے کر تارک دنیا ہوگیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں' اب بھی زندہ ہے' واللہ اعلم بالصواب



1 اصلی نام؟
محمد ریحان اسعدی۔
2 پیار کا نام؟
ریحان۔
3 تاریخ پیدائش اور شہر؟
14 اپریل کراچی۔
4 برج / ستارہ؟
پہلے فسٹ پھر اپرج/Aries۔
5 تعلیمی قابلیت؟
ایم اے انٹرنیشنل ریلیشنز۔
6 بہن بھائی اور آپ کا نمبر؟
3 بہنیں بڑی ہیں 3 چھوٹی، میرا نمبر تیسرا۔
7 شادی کب ہوگی 'Love' Arrange؟
انشاء اللہ ارینج ہی ہوگی اور جلد ہی ہوگی۔



ایف ایم 101 کے پریزنٹر

باتیں ریحان اسعدی سے

شاہین رشید

7 ریڈیو پہ متعارف کرانے کا سہرا؟
اپنے سر ہی ہے۔ آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گیا۔
8 پہلا پروگرام کب کیا؟
پہلا پروگرام شام کے وقت کیا تھا' ڈی جے ارشد حسین کے ساتھ۔
9 کتنے سال سے آواز کی دنیا میں ہیں؟
تقریباً "نو سال۔
10 پہلی کمائی کیا تھی اور کیا کیا تھا؟
ایف ایم سے ہی پہلا چیک ملا تھا مگر یہ نہیں بتاؤں گا کہ کتنا تھا بہت خوشی ہوئی تھی اور گھر میں سب کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر گیا تھا۔

11 زندگی میں کیا بننا چاہتے تھے اور کیا بن گئے؟
میں پائلٹ بننا چاہتا تھا مگر افسوس کہ بن نہ سکا۔
12 کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟
نہیں' کیونکہ میں چیزوں کو بہت پہلے سے جج نہیں کر پاتا۔
13 اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتے ہیں؟
اس وقت جب وہ لوگ جن پر آپ کو بہت زیادہ بھروسہ ہو' وہ آپ کی فیلنگ کو نہ سمجھیں اور شک کریں۔
14 زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟
مجھے تو لگتا ہے کہ میرے پاس اپنے لیے بھی وقت

نہیں ہے۔

15 آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟

شاید میرے دوست۔

16 اگر دعا سے کوئی شخصیت مل سکتی تو کس کو مانگتے؟

یہ تو بہت مشکل سوال ہے اور پھنسانے والی بات ہے۔ مگر کسی نہ کسی کو ضرور مانگتا۔

17 اگر بازار سے خوشیاں ملتی تو کون سی خوشی خریدتے؟

جلیبیاں خریدتا (قہقہہ) بہت مشکل سوال ہے۔

18 اپنے موبائل فون سے سب سے زیادہ کالز اور ایس ایم ایس کس کو کرتے ہیں؟

کوئی ایک نہیں ہے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ دوستوں کو کرتا ہوں۔

19 جب آپ نیا پین استعمال کرتے ہیں تو پہلے کیا لکھتے ہیں؟

میں نے عموماً" نئے پین سے آٹوگراف ہی دیے ہیں کیونکہ جو مجھ سے آٹوگراف مانگتا ہے اپنا پین دیتا ہے جو میرے لیے نیا ہوتا ہے۔

20 کسی رانگ نمبر سے دوستی ہوئی؟

رانگ نمبر زندگی میں آئے بہت ہیں اور کسی نہ کسی سے دوستی بھی ہو جاتی ہے۔

21 کوئی ایسی غلطی جو آپ دہرانا چاہتے ہیں؟

غلطی انسان کہاں دہراتا ہے۔

22 کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟

امی اور اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھ کا۔

23 کبھی سوچا کہ آج سے دس سال بعد آپ کہاں ہوں گے؟

اگر اللہ نے زندگی دی تو آواز کی دنیا سے ہی کہیں نہ کہیں منسلک ہوں گا۔

24 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟

غصے میں کھانا پینا تو نہیں چھوڑا' البتہ غصے میں اپنے ساتھ زیادتی کر جاتا ہوں۔

25 بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے۔ لڑکیاں یا لڑکے؟

منحصر ہے اس بات پر کہ آپ کی فرینڈشپ کیسی ہے۔

26 کس قسم کی تقریبات میں جانے سے گھبراتے ہیں؟

بہت زیادہ رش والی تقریبات میں۔

27 گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟

یہ ہوتی ہے کہ گھر والے خیریت ضرور دریافت کریں کہ آپ سارا دن گزار کر واپس آئے ہیں آپ خیریت سے ہیں۔

28 ایک بات جس کا آپ ہمیشہ خیال رکھتے ہیں؟

میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ میری ذات سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔

29 موت سے ڈرتے ہیں؟

نہیں بالکل نہیں۔

30 اگر پاور میں آگئے تو کیا کریں گے؟

پاکستان کے تعلیمی مسائل حل کروں گا۔

31 بیوی کی شخصیت میں کیا چیز خوب صورت ہونی چاہیے؟

مختصراً" یہ کہ بیوی کو سراپا خوب صورت ہونا چاہیے اور انڈر اسٹینڈنگ ہونا چاہیے۔

32 کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟

فارم ہاؤس یا کوئی بھی پکنک کی جگہ پر۔

33 ایک محبت جو بھول نہیں سکتے؟

وہ محبت ہی کیا جو بندہ بھول جائے۔

34 کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟

کبھی نہیں۔

35 لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ کیا بولتے ہیں؟

اللہ کے ای ایس سی والوں کو ہدایت دے۔

36 ڈرائیونگ کے وقت کون سی میوزک سنتے ہیں؟

غزلیں۔

37 کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟

مجھے لگتا ہے کہ شہرت وقت سے پہلے مل گئی ہے۔

38 لوگ ملتے ہیں تو پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟

سچ بتاؤں لوگ بے ساختہ کہتے ہیں۔ اوہو..... اتنا لمبا لڑکا۔

سائنس کی بہترین ایجاد؟
موبائل فون بہترین ایجاد ہے۔
آئینے میں دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے؟
کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل ہے جس پر شیشہ لگا
تو پہلی نظر میری اپنے آپ پر ہی پڑتی ہے۔
چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟
لوگ آپ کی بات کو سمجھ نہ رہے ہوں' انڈر
اسٹینڈ نہ کر رہے ہوں تب دل چاہتا ہے ان پر چیخنے
چلانے لگو۔

45 کن چیزوں پہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟
اپنی ڈریسنگ پہ اور اپنی ہر خواہش پر دل کھول کر خرچ کرتا ہوں۔

46 اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟
میں بہت نرم طبیعت کا انسان ہوں' چاہتا ہوں کہ میرے مزاج میں تھوڑی سختی آجائے۔

47 کس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ سے یا اے ٹی ایم کارڈ سے۔
اے ٹی ایم کارڈ سے۔



ستاروں پر یقین رکھتے ہیں یا ہاتھ کی لکیروں پر؟
لوں پہ یقین نہیں رکھتا۔
آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟
نہیں' نہیں بالکل مختلف نہیں ہے۔ ہم ریڈیو کے ہیں۔ شوبز کے لوگ نہیں ہیں کہ ہمارے لیے لمز ہوں۔
کیا دعا سے قسمت بدل سکتی ہے؟
لکل بدل سکتی ہے اس پر مجھے کامل یقین ہے۔

48 کھانا کہاں کھانا پسند کرتے ہیں ڈائننگ ٹیبل پہ یا چٹائی پہ؟
زیادہ اچھا تو لگتا ہے ڈائننگ ٹیبل پہ مگر کبھی کبھی چٹائی پہ بیٹھ کر بھی کھا لیتے ہیں۔

49 حکومت سے لائف ٹائم کیا سہولت لینا چاہیں گے۔ پیٹرول' میڈیکل یا خون؟
ان تینوں میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ پورے پاکستان میں امن وامان کی سہولت مانگوں گا۔

50 کس خواہش کے پورا ہونے تک آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں؟
خواہشات ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو بتایا نہیں جا سکتا۔
51 ایک سوال جو خدا سے روزانہ کرتے ہیں؟
ہمارے لب ہوں گے کم اس دنیا کے غم۔
52 بیگ یا بریف کیس میں کیا چیزیں لازمی رکھتے ہیں؟
موبائل فون' والٹ' چابیاں وغیرہ۔
53 ناشتے میں کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟
پراٹھا۔
54 بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟
پانی کا گلاس اور پانی..... بس اور کچھ نہیں۔
55 کیا آپ وقت کی پابندی کرتے ہیں؟
میں وقت کی پابندی کا بہت قائل ہوں اور چاہتا ہوں کہ دوسرے بھی اس پر عمل کریں۔
56 آپ کی کون سی عادت گھر والوں کو پسند نہیں؟
میں ہر بات کو بہت لائٹ لیتا ہوں۔
57 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟
نہیں' مجھے یاد نہیں کہ میں نے کوئی بہت قیمتی چیز اپنے لیے خریدی ہو۔
58 دوسرے ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتے ہیں؟
امن و امان کی صورت حال کو نوٹ کرتا ہوں اور لوگوں کے رویّوں کو۔
59 کن چیزوں کو بھول جانے پر دوبارہ گھر آتے ہیں؟
عموماً "موبائل فون کو۔
60 کبھی رشوت دے کر کام کروایا؟
کبھی موقع ملا نہیں / قہقہہ۔
61 پاکستان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟
کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس قابل کرے کہ میں اپنے آپ کو پاکستان کے لیے وقف کردوں۔
62 اپنی کن باتوں پر کنٹرول نہیں ہے؟
ایسا کچھ نہیں ہے' مجھے اپنے غصے پہ ہی کیا ہر چیز پہ کنٹرول کرنا آتا ہے۔
63 کوئی عجیب و غریب خواہش؟
میرا دل چاہتا ہے کہ لوگوں سے کہیں دور جا کر صرف اپنے آپ سے ملاقات کروں۔
64 اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟
کچھ نہیں اللہ تعالیٰ نے ایک مکمل انسان بنایا ہے۔
65 زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟
اللہ تعالیٰ نے سب ہی نعمتوں سے نوازا ہے۔
66 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟
سچ بتاؤں دس سے کم نہیں دیتا۔
67 غصے میں کیا کرتے ہیں؟
میں خاموش ہو جاتا ہوں یا جس جگہ بیٹھا ہوتا ہوں' وہاں سے اٹھ جاتا ہوں یا گھر سے باہر چلا جاتا ہوں۔
68 کبھی پولیس سے پالا پڑا؟
بالکل پڑا بچپن میں ڈبل سواری پہ بیٹھا تھا تو پولیس نے پکڑ لیا تھا اور بڑی مشکل سے چھوڑا تھا۔
69 ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی ہوتی ہے؟
اصل پیار تو وہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت کوئی غرض کوئی توقعات نہیں ہوتیں۔
70 گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟
جب وہ کسی کام کا کہہ دیں تو میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔
71 نصیحت جو بری لگتی ہے؟
تم ہر چیز کو بہت لائٹ مت لیا کرو۔
72 فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں؟
لوگوں کا اور ان کے رویّوں کا جائزہ لیتا ہوں۔
73 کس چیز کے بغیر نہیں رہ سکتے؟
والدین کے بغیر۔
74 کس شخصیت سے آپ خوفزدہ رہتے ہیں؟
نہیں' میری زندگی میں کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے۔
75 اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟
اچھی تو یہ کہ نرم مزاج آدمی ہوں' رویے میں لچک رکھتا ہوں اور بری یہ کہ لوگوں پر بھروسہ جلدی کر لیتا ہوں۔
76 دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟
شام کا۔

77 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتے ہیں؟
شام کے وقت۔
78 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
کہ میں کسی پرفضا مقام کی سیر کروں۔
79 اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟
سب کچھ ہی پسند ہے۔
80 گھر کے کس کونے میں سکون محسوس کرتے ہیں؟
عموماً" اپنے بیڈروم میں۔
81 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
بھوک برداشت نہیں ہوتی' اونچی آواز میں بولتا ہوں کہ کھانا جلدی دیں۔
82 پسندیدہ سیاست دان؟
میرا خیال ہے کہ سب ہی اچھے ہیں۔
83 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟
تو غصہ آتا ہے۔
84 پہلی ملاقات میں شخصیت کی کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟
بولنے کا اسٹائل دیکھتا ہوں اور باڈی لینگوئج دیکھتا ہوں۔
85 آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اتنا اچھا اور اتنا خوب صورت بنایا ہے۔
86 کن کھانوں کو دیکھ کر بھوک چمک اٹھتی ہے؟
بریانی کو دیکھ کر تو دل چاہتا ہے کہ پوری دیگ آجائے میرے سامنے۔
87 جھوٹ کب بولتے ہیں؟
جب میرے جھوٹ سے کسی کو فائدہ ہو رہا ہو۔
88 اگر آپ کو ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟
توبہ... کبھی ایسا کچھ نہیں سوچا میں نے۔
89 [illegible]
[illegible]
90 [illegible] سرے کرتے ہیں؟
[illegible]

91 پیسہ کس شکل میں جمع کرتے ہیں؟
میرے ساتھ یہی بڑا مسئلہ ہے کہ پیسہ مجھ سے جمع نہیں ہوتا' جو آتا ہے خرچ ہو جاتا ہے۔
92 اس فیلڈ کی سب سے بڑی برائی؟
کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ لوگ ہمیں عام انسان کی طرح نہیں سمجھتے۔ اگر ہم ان سے بات نہ کریں تو سمجھتے ہیں کہ ہم بہت مغرور ہیں۔
93 چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟
ایک دم ریلیکس..... سو کر گزارتا ہوں؟
94 لڑکیاں کب بری لگتی ہیں؟
لڑکیاں کس کو بری لگتی ہیں؟ (قہقہہ)
95 کون سے الفاظ یا محاورے زیادہ استعمال کرتے ہیں؟
ایسا کرو گے تو کون آئے گا۔
96 اگر کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟
میں اس سے جا کر پوچھوں گا کہ کیوں گھور رہی ہو۔
97 موسم کس کے ساتھ انجوائے کرتے ہیں؟
ابھی تک تو گھر والوں کے ساتھ انجوائے کرتا ہوں۔
98 کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش یہ میرا ہوتا؟
سعودی عرب' مجھے بہت پسند ہے۔
99 اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ کیا کہتے ہیں؟
"اف۔
100 بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے ہیں؟
اگر صبح جلدی اٹھ جاؤں تو نیند جلدی آجاتی ہے' ورنہ کروٹیں بدلنی پڑتی ہیں۔
101 زندگی کب بری لگتی ہے؟
میرا نہیں خیال کہ کسی کو زندگی بری لگتی ہو گی۔ زندگی تو اللہ کی طرف سے حسین تحفہ ہے۔
102 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
انسان کو زوال ہے تو اس کے کام کو بھی زوال ہے۔ کیونکہ ہر عروج کو زوال ہے۔





مشہور ڈرامہ نگار، شاعر

سیّد وصی شاہ

شاہین رشید

تخلیق کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس کی ہر صنف اپنے اندر مکمل جہان سمیٹے ہوئے ہے اور اتنی ہی یکسوئی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسی لیے یہاں ہر میدان میں اپنا آپ منوانا اتنا آسان نہیں اسی لیے یا تو کوئی صرف شاعر ہوتا ہے یا نثر نگار یا پھر ڈرامہ رائٹر لیکن بیک وقت تینوں اصناف میں لکھنا آسان نہیں۔ ایسا ہی ایک نام وصی شاہ کا ہے۔ جو نہ صرف مقبول شاعر ہیں بلکہ بہت اچھے ڈرامہ رائٹر بھی ہیں۔ ۔ ان کی اصل وجۂ شہرت ان کی شاعری ہے۔ مگر کہانی نویسی میں بھی ان کا ایک مقام ہے۔ آج کل آپ ان کا ڈرامہ سیریز "تعلق" دیکھ رہے ہیں اور حال ہی میں ان کا ڈرامہ



یریل ”تھوڑی سی وفا چاہیے“ ختم ہوا ہے۔ اس سیریل نے ناظرین میں بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ ان کی ڈرامہ یریز ”لباس“ کو بھی ناظرین نے بے حد پسند کیا تھا۔

”کیسے ہیں وصی شاہ! آپ اچھے شاعر ہیں بلکہ بہترین ارامہ نگار بھی‘ آج کل کیا کیا انڈر پروڈکشن ہے اور کیا مکمل ہے؟“

”مکمل کام میں حال ہی میں ”تھوڑی سی وفا چاہیے“ مکمل ہوا ہے ایک سیریز ”تعلق“ آن ایر ہے۔ انڈر پروڈکشن ں عبداللہ کادوانی کے لیے ایک سیریل ہے۔ ایک ہمایوں سعید کے لیے اور ایک حسن ضیاء صاحب کے لیے سیریل ہے۔“

”یہ بتائیے کہ کیا آپ نام بدل کر بھی لکھتے ہیں..... جیسے ارم وصی‘ صائمہ وصی.....؟“

(بے ساختہ ہنستے ہوئے) ”میں نہیں جانتا یہ خواتین کون ہیں ۔ چند دن پہلے بھی کسی نے کہا کہ کیا ارم وصی آپ کی بیگم ہیں تو میں نے یہی کہا کہ نہیں میری بیگم کا نام تو زارا ہے۔ ویسے آپ بتائیں کہ ان کا سیریل کون سے چینل سے آرہا ہے؟“

"حیرت ہے..... ارم وصی اور صائمہ وصی کا سیریل "ہم" چینل سے آن ایئر ہے..... اور چونکہ ماشاءاللہ آپ آج کل خاصا لکھ رہے ہیں اس لیے گمان یہی ہوا کہ آپ ہوں گے۔"

"نہیں، نہیں..... میں بالکل بھی بہت زیادہ نہیں لکھ رہا۔ یہ دونوں سیریل اور سیریز جو آن ایئر ہیں تقریباً" ڈیڑھ سال پرانے ہیں "تھوڑی سی وفا چاہیے" اور "تعلق" دونوں کو لکھے ہوئے تقریباً" ڈیڑھ سال ہو گیا ہے اور چونکہ دونوں ایک ساتھ چل رہے ہیں تو آپ کو لگا کہ میں بہت لکھ رہا ہوں ورنہ دیکھا جائے تو میں نے کافی عرصے سے کوئی نئی چیز نہیں لکھی اور پی ٹی وی سے میرا آخری سیریل سال پہلے "چھت" کے نام سے آن ایئر ہوا تھا۔"

"آپ کی شاعری بھی عوام میں پسند کی جارہی ہے اب تک شاعری میں کتنی کتابیں لکھ چکے ہیں۔"

"میں اب تک تین کتابیں لکھ چکا ہوں۔ "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، مجھے صندل کردو" اور "میرے ہو کر رہو" کم کم لکھنے کی جو پالیسی شاعری میں ہے' وہی پالیسی لکھنے میں بھی ہے۔"

"فراز کی طرح آج کل آپ کے نام کی بھی ایس ایم ایس پہ بہت شاعری آتی ہے۔ آپ کے نام سے شاعری آپ کی ہی ہوتی ہے یا کسی اور کی!"

"لوگوں کی محبت ہوتی ہے کہ میرے نام سے بھیج دیتے ہیں۔ اس میں کچھ شاعری میری ہوتی ہے اور اکثر میری نہیں بھی ہوتی۔"

"اکثر نہیں ہوتی تو آپ نے کبھی احتجاج کیا؟"

"نہیں..... احتجاج کیا کرنا۔ لوگوں کی محبت کا یہی طریقہ ہوتا ہے' جب عوام آپ سے محبت کرتے ہیں تو کسی خاص دائرے میں رہ کر نہیں کرتے' وہ شرارتیں بھی کرتے ہیں' چھیڑتے بھی ہیں اور بعض اوقات ایک حد سے گزر بھی جاتے ہیں۔ یہ ان کی محبت کا طریقہ ہوتا ہے۔"

"آپ کا ایک ڈرامہ "تعلق" ——— جس میں ایک شخص کی یادداشت سر پر چوٹ لگنے سے کھو جاتی ہے۔ پھر چوٹ لگتی ہے تو واپس آجاتی ہے اور پھر چوٹ لگتی ہے تو چلی جاتی ہے۔ نیورو فزیشن کا کہنا ہے کہ سر پر چوٹ لگنے سے یادداشت کا جانا ممکن تو ہے مگر واپس آنا ممکن نہیں ہے..... مگر آپ کے ڈرامے میں گئی' آئی اور پھر گئی۔ تو.....؟"

"آپ نے اگر ڈرامہ غور سے دیکھا ہو تو میں نے دو ڈاکٹروں جو کہ نیورو سرجن تھے' ان سے ریسرچ کر کے باقاعدہ ٹرمنالوجی نوٹ کر کے لکھا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ یادداشت جا بھی سکتی ہے آ بھی سکتی ہے تو ہم نے دونوں اتفاق کو ایک جگہ جمع کر لیا تو چونکہ یہ بہت ٹیکنکل بات تھی تو میں نے دو نیورو سرجن سے پوچھ کر یہ ڈراما لکھا تھا۔"

"کیا ڈراموں کا اثر ناظرین پہ ہوتا ہے؟"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ ناظرین پہ اثر ہوتا ہے..... ایک ایک لفظ کا اثر ہوتا ہے اور کس حد تک ہوتا ہے' یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا چونکہ ڈراموں کا اثر سوسائٹی پہ ہوتا ہے اس لیے میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ میرے ڈرامے سنجیدگی لیے ہوئے ہوں اور کوئی نہ کوئی بات عوام کے ساتھ شیئر کی جاسکے' اپنی تحریروں سے کوئی نہ کوئی پیغام دیا جاسکے۔"

"کوئی ہے ایسی مثال آپ کے پاس کہ آپ کے ڈراموں کا اثر ہوا ہو کسی پر؟"

"ڈرامہ سیریز "لباس" کے دوران اور "تھوڑی سی وفا چاہیے" کے دوران بہت سے لوگ ایسے ملے ہیں' جنہوں نے کہا کہ آپ کی وجہ سے' آپ کی تحریروں کی وجہ سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے اور اپنی زندگی میں تبدیلیاں لائے ہیں "تھوڑی سی وفا چاہیے"..... کے لیے لوگوں نے کہا ہم نے اس ڈرامے کو دیکھا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ زندگی کا یہ بھی ایک رخ ہے اور جس رستے پر ہم چل رہے تھے اس کا یہ انجام بھی ہو سکتا ہے' بے شمار لوگ ملتے ہیں' جنہوں نے کہا کہ آپ کے ڈراموں سے ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔"

"گویا تحریروں کا اثر ہوتا ہے؟"

"بالکل ہوتا ہے اور صرف میری تحریروں کا نہیں ہر اچھی تحریر کا اثر ہوتا ہے' خواہ وہ تحریر "خواتین ڈائجسٹ

میں شائع ہوا یا اخبار میں شائع ہوا یا ڈرامے کی شکل میں ٹی وی اسکرین پہ ہو۔ اس کا اثر ہوتا ہے' پوزیٹو اثر بھی ہوتا ہے اور نگیٹو اثر بھی ہوتا ہے۔"

"کتنا عرصہ ہوا لکھتے ہوئے اب تک کتنا کچھ لکھ چکے ہیں؟"

"مجھے اس فیلڈ میں آئے ہوئے تقریباً" پندرہ' سولہ سال ہو گئے ہیں اور ان سولہ سالوں میں بہت کچھ لکھا ہے' اب تو اتنا یاد بھی نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ پہلا ڈرامہ "آہن" تھا۔"

"آپ کے ڈرامے سنجیدگی لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی مزاح بھی لکھا؟"

"نہیں..... کیونکہ مزاح کو ایک آدھ ٹریک تک تو ہینڈل کر لیتا ہوں لیکن چونکہ میرا رجحان سنجیدگی کی طرف زیادہ ہے تو اس لیے پھر سنجیدہ ڈرامے ہی لکھتا ہوں۔ حالانکہ مجھے مزاحیہ ڈرامے دیکھ کر مزہ آتا ہے۔ بہت اچھے رائٹر ہیں 'جو بہت اچھا مزاح لکھ رہے ہیں مگر خود لکھنا میرے لیے ذرا مشکل کام ہے بس یوں سمجھ لیں کہ رجحان نہیں ہے۔"

"آج سے پانچ چھ سال پہلے پڑوسی ملک کے ڈراموں نے ناظرین پر ایک سحر طاری کر دیا تھا۔ کیا اب اس میں کمی آئی ہے یا یہ سحر برقرار ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ کم ہوا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ڈرامے ہوا کے اوپر بنائے ہوئے ڈرامے تھے اس طرح کی کوئی بھی چیز جب سوسائٹی میں آتی ہے تو وقتی طور پر تو اس کی پذیرائی ہوتی ہے۔ لیکن لازمی بات ہے کہ ایسے ڈراموں کی کہانیوں کا تعلق نہ زمین سے ہوتا ہے نہ آسمان سے اور نہ ہی انسان کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ ہی انسانی نفسیات سے کوئی تعلق ہوتا ہے تو وہ پھر زیادہ دیر تک لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں رکھ سکتا۔"

"مگر اس وقت تو لوگ چاہتے تھے کہ ہمارے چینلز سے بھی ایسے ہی ڈرامے ہوں؟"

"بالکل چاہتے تھے' میں مانتا ہوں کہ لوگوں کی خواہش ہوتی تھی کہ ہمارے یہاں سے بھی ایسے ہی ڈرامے پیش کیے جائیں..... ہم نے اس سلسلے میں بہت جدوجہد کی ہے اور آج ہمارا ڈرامہ جو واپس آیا ہے' لوگ پہلے کی طرح ہمارے ڈراموں کو پسند کرنے لگے ہیں' اس کے لیے ہم نے بہت محنت کی ہے۔ ڈرامے کی بقا کی جنگ لڑی ہے۔ جب ہم سے کہا جاتا تھا کہ ہمیں بھی ایسا ہی ڈرامہ لکھ کر دیں..... تو ہم نے انکار کیا' اپنے ڈرامے کی روایات کو برقرار رکھا..... اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر بہترین لکھنے والے' بہترین ڈائریکٹر اور اچھا کام کرنے والے جب سنجیدہ ڈرامے کی طرف آئیں گے تو ویورشپ میں اضافہ ہو گا اور ہماری ان کے ڈراموں سے جان چھوٹ جائے گی۔"

"سوپ کا تصور تو ادھر سے ہی آیا ہے ناں؟"

"سوپ کا تصور تو مغرب سے آیا ہے اور یہ کوئی برا تصور نہیں ہے۔ البتہ "ڈھینو ڈھینو" کر کے جو ڈرامے بنتے تھے۔" یہ انڈیا سے آیا ہے ڈیلی لائف پہ ڈراما بنانے کا تصور مغرب سے آیا ہے اور سوپ ہمارے یہاں بھی چل چکے ہیں۔ اگرچہ ڈیلی نہیں چلتے تھے لیکن "سونا چاندی" جیسے سیریلز سوپ ہی ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح فاطمہ ثریا بجیا کے تحریریں جو گھریلو موضوعات پر ہی ہوا کرتی تھیں وہ بھی سوپ کے ہی موضوعات ہوا کرتے تھے۔ تو ہمارے یہاں بھی یہ مختلف شکل میں موجود رہا ہے میں اس کے بالکل بھی خلاف نہیں ہوں۔"

"ہمارے ملک کے فنکار دو چار ڈراموں میں کام کرنے کے بعد ہی کہنا شروع ہو جاتے ہیں کہ انہیں انڈیا کے ڈراموں اور فلموں میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی ہے۔ ہمارے ملک کے رائٹرز بھی بہت اچھے ہیں۔ مگر ہم نے ان کے بارے میں کبھی نہیں سنا کہ انہیں پیشکش ہوئی ہو..... آپ کو کوئی آفر آئی؟"

"نہیں..... میرے ساتھ تو ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا کہ مجھے کوئی آفر آئی ہو۔ البتہ شاعری کے حوالے سے میں نے وہاں کے لوگوں کے ساتھ کافی کام کیا ہے اور کر بھی رہا ہوں۔ سکھوندر سنگھ جن کے گائے گئے گانے کو آسکر ایوارڈ ملا تھا انہوں نے میری شاعری گائی ہے تو شاعری کی سطح پر کافی کام ہوا ہے اور ہو بھی رہا ہے لیکن ڈرامے کے لیے آفر نہیں

آئی۔"

"دل چاہتا ہے کہ آپ کی تحریریں ڈراموں کی شکل میں بھی آئیں انڈیا کی اسکرین پہ؟"

"میں بڑا مطمئن اور موڈی سا آدمی ہوں لیکن اگر بڑے پلیٹ فارم سے آفر آتی ہے تو کس کا دل نہیں چاہے گا کہ وہ کام کرے۔ لیکن اس کے لیے کوشش کرنا' پلان کرنا یا سوچنا اس کے لیے میں نے کبھی کوشش نہیں کی نہ ہی توجہ دی۔"

"پاکستانی فلم کے لیے لکھا آپ نے؟"

"ہاں.... ریما کے لیے ایک فلم کی کہانی میں نے لکھی تھی مگر وہ کسی وجہ سے لیٹ ہو گئی ہے۔ ایک فلم کے لیے بات چیت چل رہی ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"جیسا کہ آپ بتا رہے ہیں کہ ڈرامہ سیریل "تھوڑی سی وفا چاہیے" اور ڈرامہ سیریز "تعلق" سال ڈیڑھ سال پہلے لکھا تھا' تو کبھی ایسا ہوا کہ آپ کی تحریر آوٹ آف ڈیٹ ہو گئی ہو اور آپ نے پھر دوبارہ اسے لکھا ہو؟"

"نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا" تھوڑی سی وفا چاہیے "میں "نیب کو بھی موضوع بنایا گیا ہے تو نیب اگر پرانا بھی ہو جائے گا اور کوئی نیا ادارہ بھی بن جائے گا تو بھی بنیادی کہانیاں جو انسانی نفسیات پر ہوتی ہیں اور انسانی نفسیات جس میں محبت نفرت جھوٹ اور سازش سب کچھ ہی شامل ہے 'وہ ازل سے ایک جیسی رہی ہے ..... اور بات ہے' مثلاً "جب میں نے لکھا تھا تو "نیب" کافی فعال ادارہ تھا۔ اور اب پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ لیکن عموماً "موضوعات پرانے نہیں ہوتے..... اگر آپ بڑے شعراء کو دیکھیں' جیسے غالب' میر تقی میر' علامہ اقبال اور منٹو کو دیکھیں تو ان لوگوں نے انسانی نفسیات اور انسانی نفسیات کی جہتوں پر کام کیا ہے' یہی وجہ ہے کہ ان کا کام کبھی بھی آوٹ ڈیٹ نہیں ہوا..... سال ڈیڑھ سال تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اگر اچھی تحریر ہو خواہ غالب کی ہو' منٹو کی ہو یا بانو قدسیہ کی ہو۔ وہ تو دو سو سال بعد بھی آوٹ ڈیٹڈ نہیں ہوتی۔"

"ابھی تک آپ نے جن ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کیا ہے ان میں کس کے ساتھ کام کر کے اچھا لگا اور آپ مطمئن ہوئے؟"

"تین لوگوں کے ساتھ میں نے کام کیا ہے' ان میں شاہد ظہور صاحب ان کے ساتھ کام کر کے اچھا لگا لاہور سے جو میرا کام ہوا' جیسے "چھت" اور "ملنگی" جو پی ٹی وی سے آن ایئر ہوئے۔ پھر احمد کامران ہیں۔ ان کے ساتھ بھی میں نے کافی کام کیا ہے وہ بہت ہی شاندار آدمی ہیں۔ بہت ٹیلنٹڈ ہیں پھر یاسر نواز کے ساتھ "تھوڑی سی وفا چاہیے" میرا پہلا سیریل ہے' ان کے ساتھ کام کر کے بھی بہت اچھا تجربہ ہوا اور بھی لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ زیادہ کیا ہے۔"

"ہماری سینئر رائٹرز حسینہ معین' بانو قدسیہ' اشفاق احمد' امجد اسلام امجد وغیرہ۔ سال میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو سیریز یا سیریل لکھا کرتے تھے' جبکہ آج کل کے رائٹر ایک ساتھ کئی کئی سیریل لکھ لیتے ہیں۔ ایسا کیسے ممکن ہے یا ممکن ہے؟"

"میرے لیے تو مشکل ہے' میں تو ایک وقت میں ایک ہی سیریل لکھتا ہوں' سال میں تین چار سیریلز لکھ لیتا ہوں۔ لیکن ایک وقت میں ایک ہی لکھتا ہوں' ایک ساتھ لکھنے سے کام بہت متاثر ہوتا ہے؟"

"اب آپ کی شاعری کی طرف آتے ہیں۔ آپ کی شاعری بہت رومینٹک ہوتی ہے۔ یہ آپ کی ایج کا تقاضا ہے یا زندگی میں بہت سارے عشق کیے آپ نے؟"

(ہنستے ہوئے) "بہت سارے عشق تو نہیں کیے لیکن میں ایک رومینٹک آدمی ہوں .... میں زندگی کو ایک خاص طرح کی رومانویت سے دیکھتا ہوں۔ ایک خاص انداز میں دیکھتا ہوں۔"

"لڑکیاں آپ کی شاعری کو بہت پسند کرتی ہیں۔ فون کالز تو آتی ہوں گی؟"

"بس جی اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے اور لوگوں کی محبت ہے' لازمی بات ہے کہ جو آپ کے فین ہوتے ہیں وہ آپ سے بات بھی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی تعریف بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

"بیگم پریشان تو نہیں ہوتیں؟"

”نہیں..... کیونکہ میں اس معاملے میں ایک محتاط آدمی ہوں اور رومینٹک شاعری کرنا ایک الگ بات ہے ' خواتین سے بات کرنا ایک الگ بات ہے۔“

”آپ اپنے کام کو کب انجوائے کرتے ہیں ”شاعری کر کے یا ڈرامہ نگاری کر کے؟“

”شاعری تو ایک الہامی سی کیفیت ہوا کرتی ہے اور ڈرامے میں بھی بعض اوقات ایسے لمحے آتے ہیں لکھتے ہوئے کہ وہی نشہ 'وہی لطف ملتا ہے 'جو شاعری میں ملتا ہے لیکن شاعری تو مکمل کام ہے جس کا اپنا سرور ہے۔“

”ایوارڈز 'اعزازات ملے آپ کو؟“

”بے شمار ایوارڈز مل چکے ہیں اور ابھی حال ہی میں بہترین کمپیئر کا پی ٹی وی ایوارڈ ملا ہے مجھے بڑا اچھا لگا طارق عزیز صاحب کے ہاتھوں سے ایوارڈ لینا' باقی لوگوں کی محبت کسی بھی انسان کے لیے ایک بنیادی ایوارڈ ہوتا ہے۔ اور مجھے بے شمار لوگوں کی بے پناہ محبت حاصل ہے۔“

”کوئی ایسی تحریر جو آپ نے بہت دل سے لکھی ہو لیکن ڈائریکشن کی وجہ سے وہ ناکام ہو گئی ہو' آپ کو اس کا افسوس بھی ہوا۔“

”میں اس کا ضرور ذکر کرتا لیکن پھر لازمی بات ہے کہ اس میں اس ڈائریکٹر کا نام بھی ضرور آئے گا یہ مناسب نہیں لگتا کہ کسی کی دل آزاری کی جائے' لیکن ایسا ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں ہی ایسا ہوا ہے کہ بہت دل سے وہ تحریر لکھی تھی' مگر وہ رزلٹ نہیں آیا جو آنا چاہیے تھا۔“

”چلیں جی' آتے ہیں کچھ اپنی نجی زندگی کی طرف' کچھ بتائیں؟“

”21 جنوری 1973ء میں میں سرگودھا میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا کپڑے کا بزنس تھا' جب میں آٹھ سال کا تھا تو میرے والد کا انتقال ہو گیا میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور میرے ماموں کی ایک بیٹی کو میری والدہ نے گود لے لیا تھا' اس لحاظ سے میری ایک بہن بھی ہے' میری تعلیمی قابلیت بی کام ہے بی کام پارٹ ون میں پورے پنجاب میں میں نے ٹاپ کیا تھا۔ میری فیملی یعنی میرے والدین پڑھے لکھے تھے اور میرے نانا بہت اچھے شاعر تھے۔“

”شادی کب ہوئی' پسند سے؟ کیسی ہیں؟“

”شادی کو ساڑھے دس گیارہ سال ہو گئے ہیں اور میری پسند سے ہوئی ہے ..... سگھڑ خاتون ہیں میرا اور بچوں کا بہت خیال رکھتی ہیں۔“

”آپ کی تحریروں کو ڈرامائی شکل میں پسند کرتی ہیں؟“

”ہاں پسند کرتی ہیں۔ ڈرامے دیکھتی ہیں میرے اور بے لاگ تبصرہ بھی کرتی ہیں۔“

”لکھنے میں مدد دیتی ہیں؟“

”نہیں..... انہیں پڑھنے کا شوق ہے تو تبادلۂ خیال رہتا ہے' ڈسکشن رہتا ہے ہم دونوں کے درمیان۔“

”کھانے پینے کے شوقین ہیں آپ؟“

”بہت زیادہ نہیں' جو مل جائے صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتا ہوں۔ بہت قناعت پسند ہوں انسان کو ہر معاملے میں قناعت پسند ہونا چاہیے۔“

”بچے کتنے ہیں؟“

”بچے میرے ماشاء اللہ سے چار ہیں' ایک بیٹی اور تین بیٹے' بیٹی کا نام دُعا ہے پھر بیٹا احمد' جاسم اور شہرام ہے۔“

”مزاجاً“ کیسے ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ میں سافٹ آدمی ہوں۔ مگر بیگم کو اس بات سے اتفاق نہیں ہے' وہ سمجھتی ہیں کہ میں سافٹ نہیں ہوں بلکہ غصے کا تیز ہوں۔ تو یہ ان کا خیال ہے۔“

”بہت شکریہ وصی شاہ صاحب آپ نے ہمیں ٹائم دیا۔“

”آپ کا اور آپ کے ادارے کا بھی شکریہ کہ آپ نے میرا انٹرویو کیا۔“





رُخسانہ نگار عدنان

قسط ۵۲

میوزک، تیز شور اور اس کے سُر تال کے ساتھ قدم اٹھاتی ماڈلز..... مختصر مگر بے حد مہنگے کاسٹیومز میں ملبوس ریمپ پر چلتی ایک سے بڑھ کر ایک قیامت چال اور حاضرین کی توجہ..... سب ایک مذاق، ایک کھوکھلا بدنما مذاق لگ رہا تھا جیسے اس وسیع و عریض ہال کا ہر منظر انسان کی زندگی کی اصل حقیقت پر قہقہے لگا رہا ہو۔

"تم کھو جاؤ بے شک گم ہو جاؤ ان مناظر کی رنگینی میں، ان شوخ رنگوں کی قوس قزح میں..... ان خوشبو اُڑاتے لباس اور رنگین پیراہن میں دل کو کھینچتے ان خوب صورت جسموں کے خدوخال میں..... جنون اور عشق کی مستیوں میں تم لاکھ خود کو گم کرو، گم بھی کچھ ایسا کہ خود کو ڈھونڈنے سے بھی نہ مل پاؤ مگر میں، میں تمہیں بتاؤں اس ساری خوب صورتی اس سارے دلکش مناظر کی حقیقت سیاہ، بھیانک تاریک اندھیروں کا سفر..... اکیلے پن اور تنہائی کے اٹوٹ بندھن سے جڑا خالی پن اور بے مائیگی کا احساس..... کیا..... موت اور صرف موت، جوان سارے



رنگوں، خوشبوؤں، سُر تال سب کو گم کردے گی۔ جیسے کبھی تم ان میں گم ہو کر رہ گئے تھے اور مجھے بھول گئے تھے۔
عائشہ بخاری کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر سارے ہال کو بتائے۔ ایک شور قیامت اٹھادے، بے شک سب اسے پاگل دیوانی اور خبطن سمجھیں مگر دو چار.....یا شاید ایک آدھ.....ایک آدھ اس سچی حقیقت کو جان لے..... جیسے وہ جان گئی تھی اس لمحۂ خاص میں.....اس زندگی کی اصل حقیقت صرف موت ہے۔
وہ سیل فون مٹھی میں جکڑے، جہاں کھڑی تھی۔ پکڑ کر وہیں بیٹھتی چلی گئی۔
اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا اور کان ہر آواز سے بے بہرہ ہوتے جا رہے تھے۔
"مم.....مجھے جانا چاہیے ابھی اور اسی وقت.....میں اگر چیخ بھی لوں چلا چلا کر ان سب ہوس پرستوں کو کھوکھلے جسموں اور بھدے مناظر پر مر مٹنے والی ان بے حس نظروں کو میرے چلانے سے کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔ کسی ایک آدھ کو بھی نہیں اور یہ حقیقت کا پردہ تو صرف اس کی نگاہ سے اٹھتا ہے، جس کو اصل دکھانے کا فیصلہ کیا جا چکا ہو اور اس کی نگاہ سے فی الوقت یہ پردہ اٹھ چکا تھا۔
وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
" ابھی کچھ اور مجھے خود کو بہت مضبوط رکھنا ہے کم از کم وہاں پہنچ جانے تک"۔ اس نے خود کو خود ہی سمیٹا اور چند قدموں پہ کھڑی میڈم یاقوت کے پاس جا کر آہستگی سے ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، ان کو متوجہ کرنے کے لیے۔
عائشہ بخاری My's کی ایک عام ایمپلائی اور اس جرات سے میڈم یاقوت کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے، اس بھرے مجمع میں..... مگر وہ تو جیسے ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی۔ ہر ڈر، خوف، ہراس سب دل سے نکل چکا تھا۔
شاید زندگی میں پہلی بار اس نے موت کی حقیقت کو جانا تھا اور یہ حقیقت اسے کتنا طاقت ور بنا گئی تھی کہ پہلی بار اسے میڈم یاقوت سے لمحہ بھر کو بھی خوف نہیں آیا، کہ ذرا سا ڈر بھی نہیں۔
"میڈم! میں گھر جا رہی ہوں۔" اس نے اسی طرح ہاتھ ان کے کندھے پر جماتے بے حد مدھم آواز میں کہا اور اسے پتا تھا اس Peak time Event پر یہ احمقانہ ترین بات کرنے پر میڈم کا ردعمل کتنا شدید ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود اسے اب کسی بھی بات کی پروا نہیں تھی۔
"میرے فادر کی ڈیتھ ہو گئی ہے میم And I Have to go۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔
لمحہ بھر کھڑی ان کے شدید ردِعمل کا انتظار کرتی رہی پھر دوسرے لمحے مڑ کر تیزی سے اس ہجوم میں جگہ بناتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔
یہ رات تو بقول میڈم یاقوت کے ان کی ساری زندگی کی ریاضت کا حاصل تھی اور وہ اس حاصل میں کس قدر محو تھیں کہ انہیں میرے آنے یا جانے سے کچھ بھی فرق نہیں پڑنے والا، انہوں نے مڑ کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔
اور اب مجھے بھی مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں.....جس ایک شخص کی سانسوں کی ڈور نے مجھے اس دلدل میں، اس گورکھ دھندے میں پھنسا رکھا تھا۔ آزادی سے چلتے پھرتے رہنے کے باوجود بھی ان دیکھی زنجیروں سے جکڑی تھی، آج وہ ساری زنجیریں ٹوٹ گئیں۔
"گڈ بائے میڈم یاقوت اینڈ یور ایمپائر.....فار ایور۔" اس نے مڑ کر آخری نظر اسی طرح پتھر کا بت بنی میڈم یاقوت پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"تو تم آہی گئے اور تمہیں آنا تو تھا' تم خود سے تو کبھی نہ آتے.... میں تمہیں بستر مرگ پر بھی بلاتی تو تم کبھی نہ آتے محمود عالم۔

تم میں اتنی جرات تھی ہی نہیں کہ تم اپنا مکروہ چہرہ خود سے دیکھتے۔ تمہیں خود کو دکھوانے کے لیے بھی مجھے ہی تم کو آئینہ دکھانا پڑا اور تمہارا آئینہ' تمہارا غرور تمہارا فخر تمہاری یہ شاندار بیٹی.... جو چند گھنٹے پہلے سب کچھ گنوا چکی ہے۔

تمہاری عزت' تمہاری جھوٹی شان' تمہارا وہ غرور اور گھمنڈ جو تمہیں خود پر اپنی دولت اور خاندان پر بہت تھا.... سب سب کچھ اب میری مٹھی میں ہے۔

چند سال پہلے جب میں نے تمہیں یوں بے بس ولاچار ان کانپتی ٹانگوں اور لرزتے قدموں کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے ہونے کی تمنا کی تھی.... تو محمود عالم وہ صرف تمنا ہی نہیں تھی' پورا منصوبہ تھا تمہاری تباہی کا.... اور آج' آج وہ منصوبہ وہ تمنا سب پورا ہوا۔

تم یاس وحسرت اور لاچاری کی تصویر بنے اپنے اسی دوست کے کندھے کا سہارا لیے میرے سامنے کھڑے ہو' جس کی گواہی کے بل بوتے پر تم نے محض تین دستخطوں کے عوض مجھے حاصل کیا اور مجھے برباد کر ڈالا.... برباد۔ ورنہ آج تمہارے پہلو سے قدم ملائے تمہارے کندھے پر بازو حمائل کیے۔ یہاں یہ محب مصطفیٰ نہیں۔ تمہارا جوان بیٹا ہوتا۔ دائم جسے یہ اس کی ہتھیارن بیوی نے مکروہ طریقہ سے مجھ سے چھین لیا۔

تم میں ذرا بھی جرات ہوتی تو میں اتنے برس آبلہ پائی کا سفر طے نہ کرتی۔

تمہاری محبت کے جھوٹے خواب کا ایسا کانٹوں بھرا سفر.... محمود عالم یہ محبت تھی' یہ اذیت کی انتہا.... کبھی ملتے تم تو تمہارا گریبان پکڑ کر ایک بار تو ضرور پوچھتی۔

"تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا.... کیوں؟" انہیں لگا آج ان کا برسوں کا ضبط ٹوٹ جائے گا.... آج سب کچھ اس ریلے میں جذبات کے اس طوفان میں بہہ جائے گا' آج کچھ بھی نہیں بچے گا۔ محمود عالم نہ تم نہ میں' نہ یہ محبت نہ اس کے جھوٹے خواب نہ اور یہ لمبا سفر۔

تھک گئی ہوں ان پیروں کے چھالوں کے ساتھ چلتے چلتے اور دیکھو میری بے بسی میرا پہلو بھی تو خالی ہے.... سب کچھ حاصل.... اور بالکل خالی۔

مجھے دیکھو میرے پاس بھی تو کچھ نہیں ہے میں تو بالکل تہی دامن ہوں.... سب کچھ حاصل کر کے بھی کنگال.... تمہاری طرح۔

لیکن نہیں' نہیں میں تمہاری طرح نہیں ہوں.... ہو بھی نہیں سکتی وہ تو تم ہو.... میرے پاس تو لائبہ ہے دائم...." یکدم ان کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

"لائبہ.... لائبہ کہاں ہے سویٹی میری جان کہاں ہو تم؟" وہ دیوانہ وار اپنے سے محض تین قدم کے فاصلے پر کھڑے محمود عالم کو نظر انداز کر کے مڑ گئیں۔

"جسے کبھی خود کے سامنے یوں لاچار کھڑا کرنے سے بڑی کوئی خواہش ہی نہیں تھی۔ آج وہ خواہش پوری ہوئی تو لگتی بے معنی سی لگنے لگی۔

اور ہمیشہ سے ایسا ہی تو ہوتا آیا ہے' خواہش پوری ہونے کے بعد کس قدر بے مزہ سی لگنے لگتی ہے' لمحے کے

چوتھائی حصے کی ذرا سی خوشی اور بس۔
ان کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔
اتنے برسوں کی یہ حسرت، یہ خواہش آج مجسم ہو کر سامنے آئی تو کیسی بے معنی سی لگنے لگی تھی کہ یہ تو ہونا ہی تھا اور بس۔
"کیا خواہشیں اسی طرح سے پوری ہو جاتی ہیں کہ وہ تو ہونا ہی ہوتی ہیں۔" پلٹتے ہوئے انہوں نے لحہ بھر کو سوچا اور بس۔
"نیلم!" کس نے انہیں اتنے برسوں اتنی صدیوں بعد اس نام سے پکارا تھا۔
وہ جسم میں روح اور سینے میں دل رکھتے ہوئے بھی لمحے کے اسی چوتھائی حصے میں جیسے پتھر بن کر گڑی رہ گئیں۔
"نیلم..... نیلی!" اس زور کا جھٹکا تھا، شاید وقت کے پہیے نے الٹا گیئر لگایا تھا کہ زمین آسمان پاتال کم از کم ان کے وجود ان کی ذات کا آسمان زمین پاتال سب زلزلے کی زد میں آ گئے تھے۔
اور وہ مڑ کر پیچھے دیکھ لیتیں تو وہ پتھر ہو چکی ہوتیں۔
"نیلم..... مم معاف کر دو مجھے۔" لڑکھڑاتی لرزتی آواز میوزک کے اس شور اور وقفے وقفے سے ردھم میں بجتی تالیوں کے بیچ بھی صاف سنائی دے گئی کہ ان کے جسم کا ریشہ ریشہ اس ایک جملے کو سننے کے لیے صدیوں سے سماعت بنا ہوا تھا۔
خواہشیں یوں بھی پوری ہوتی ہیں؟ ایک ہی پل میں زندگی کو حسرت بنانے والی دو خواہشیں ایسے پوری ہو گئیں۔

یہ معجزہ تھا تو بھی اس کو دیکھنے کے لیے وہ مڑ نہ سکیں۔
"ایک بار خدا کے لیے نیلم! مجھے معاف کر دو۔"
اس ہاتھ کا لمس جس نے سالوں پہلے انہیں کیسے پامال کیا تھا۔ سرسراتے اندھیروں اور گرم مہینوں کی تند لو دیتی راتوں میں اور سردیوں کی دھوپ بھری دوپہروں کے تاریک گوشوں میں اور وہ پامال ہوتی چلی گئیں۔
مگر اب نہیں!
کبھی یہ لمس حاصل تھا۔ حاصل زندگی، مگر اب کچھ بھی نہیں۔
لمحے کا چوتھائی حصہ ہی تو تھا..... وہ تو ایک عمر کو ہرا آئی تھیں تو یہ چوتھائی حصہ کیا چیز تھا..... وقت کی یہ معمولی سی ساعت انہیں چت نہیں کر سکتی تھی۔
"فرمایئے!" بے تاثر لہجے میں مڑ کر کہتے ہوئے انہوں نے بہت جتا دینے والے انداز میں کندھے پر دھرا، محمود عالم کا کپکپاتا ہاتھ ایک جھٹکے سے پرے کیا تھا۔
"اور مسٹر مائنڈ یو..... یہاں شاید ہال میں کوئی نیلم موجود ہو۔ مگر مجھے یاقوت کہتے ہیں..... یاقوت اس ساری ایمپائر کی بلا شرکت غیرے مالک ہوں..... انڈر اسٹینڈ!"
ان آنکھوں میں جن میں ہمیشہ محمود عالم نے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھا تھا یا پھر بے بسی کی انتہا..... آج یہ نفرت اور ایسی شدید نفرت کہ انہیں لگا اس ریلے میں وہ ساری محبت اس کی یادیں اور وہ کسک..... سب کچھ کھو دینے کا ملال سب بہہ چکا ہے انہوں نے آنے میں دیر کر دی۔
"پلیز..... فارگیو می۔" ان کی آنکھوں میں اپنی ہی بے بسی پر پانی جھلملانے لگا۔

"But for what" وہ اس وقت بے گانگی کی انتہا پہ کھڑی تھیں۔
"جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا۔" وہ لرزتی آواز میں بولے۔
"تم..... تم میری بیٹی کے ساتھ مت کرو۔"
"کیا کیا تھا آپ نے میرے ساتھ.....؟" وہ ایک قدم چل کر عین ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں، نظریں جماتے ہوئے۔
"پلیز..... نیلم!" وہ گڑگڑائے۔
اب اپنے منہ سے اپنا جرم یا گناہ خلوت میں اکیلے پن میں بول دینا آسان ہے مگر یوں اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھلے کوئی متوجہ نہ ہو مگر اس جھوٹی انا کا بت پاش پاش نہ ہو جاتا، اس اعتراف کو سالوں انہوں نے اپنی بے اعتنائی کا لہو دے کر پروان چڑھایا تھا۔
"تم جانتی ہو..... خدا کے لیے۔" وہ بے ربط ہو کر گڑگڑائے۔
"کس خدا کے لیے؟....." آج تو ان کے پاس سارے ہتھیار تھے اور کوئی بھی کند نہ تھا۔
"آپ مانتے ہیں خدا کو؟"
"دیکھو..... تم..... میرا تمہارا جو بھی حساب کتاب۔" وہ بائیں طرف سے سینہ دبا کر بمشکل بولے۔
"آپ شاید ان کے دوست ہیں..... دوست ہی ہوں گے جو ایسے..... بلکہ ہر ایسے کڑے وقت میں سہارا دینے کو کھڑے ہوتے ہیں۔" وہ اسی تند لہجے میں مصطفیٰ سے بولیں "مسٹر انہیں یہاں یہ شاندار میلہ آئی مین فیری واک دکھانے کے لیے لانے کے بجائے انہیں کسی اسپتال لے کر جائیں۔"
"بلکہ نہیں اسپتال کیوں، آپ کے اپنے گھر میں اس طرح کے عالم نزع میں بے بس و لاچار انسانوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک ماہر مسیحا کے روپ میں راہزن موجود ہے۔ اس کے پاس لے جائیں..... اور سوری ! ہمارے شو میں کسی ایسی ایمرجنسی کے لیے ایمبولینس کی سہولت نہیں ہے۔ ایکسکیوزمی!"
وہ نفرت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں مگر زبان پر ایسی نفرت نہیں تھی، طنز اور جتا دینے والے مار ڈالنے والے تیکھے جملے۔
"نہیں..... یوں نہیں جاؤ نیلم میری عزہ....." وہ ایک قدم آگے بڑھے اور درد کی شدت نے انہیں جکڑ لیا۔ مصطفیٰ انہیں سنبھالتے سنبھالتے بھی لڑکھڑا گئے۔
"تو آپ عزہ سے ملنے آئے ہیں سوری! وہ تو ریمپ پر ہیں وہ دیکھیں ان کے لاسٹ اسٹیپ کیا قیامت ہے۔ دیکھیں، پورا ہال مبہوت ہے، ایسی سر اٹھاتی جوانی اور ایسا معصوم حسن..... آپ بھی دیکھیے اور لطف اٹھائیے میں تھوڑا بزی ہوں سوری....."
کہہ کر وہ رکی نہیں اور محمود عالم کے سامنے، اسپاٹ لائٹ کے ساتھ چلتی واک کے اختتامی قدم اٹھاتی، عزہ کی شبیہ دھندلا سی گئی۔
یوں بھی انہوں نے ایسی بے حجاب..... اتنے مختصر لباس میں اپنی عزہ کو کب دیکھا تھا، جو اسے فوراً سے پہچان لیتے۔
انہیں تو یہ شبیہ بھی کسی اور ہی کا عکس لگ رہی تھی۔
ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا، دوسرے پل مصطفیٰ کا سہارا ہونے کے باوجود وہ کھڑے قد کے ساتھ زمین بوس ہوتے چلے گئے۔

پاس ہی کھڑے دو چار لوگ ان کو پکڑنے کے لیے لپکے۔
اور باہر کی طرف جاتی میڈم یاقوت نے مڑ کر زمین پر پڑے اس شخص کو دیکھا' جو آج ان کے لیے قطعی اجنبی تھا...... اور یہ منظر اس کی شکست کا یہ منظر بھی تو ان کے منصوبے کا حصہ تھا...... بلکہ سب سے شاندار حصہ۔
اور افسوس ان کے پاس اس شاندار حصے سے لطف اٹھانے کے لیے وقت نہیں تھا۔
لائبہ نے ان کی ساری فتح کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ وہ فتح جس کے لیے انہوں نے یہ سارا میلہ سجایا...... وہ خود بھی مزہ نہیں لے سکیں' اگرچہ اس سارے منظر کا ایک ایک جزو ان کے حسب خواہش پوری ترتیب کے ساتھ وقوع پذیر ہوا تھا مگر پھر بھی کمی سی رہ گئی۔
وہ باہر نکلتے ہوئے بے چینی سے پھر سے لائبہ کا سیل ملا رہی تھیں' جو حسب سابق ناٹ ریسپانسڈ' کی ٹیپ چلا رہا تھا۔
اب ان کی جھنجلاہٹ فکرمندی میں بدل چکی تھی۔ ایک طرف کھڑے اپنے پرسنل اسسٹنٹ کو کچھ سمجھا کر وہ پارکنگ کی طرف بڑھ گئیں۔
اب انہیں باقی کے شو سے کوئی دلچسپی رہ بھی نہیں گئی تھی۔
اور یہ ان کی پروفیشنل لائف کا پہلا شو تھا' جو انہوں نے پرسنل انٹرسٹ میں کیا تھا اور وہ اس سے اتنی جلدی فیڈ اپ بھی ہو گئی تھیں۔
انہیں صرف عزہ کی واک سے دلچسپی تھی اور عزہ اب ریمپ سے جا چکی تھی ان کا انٹرسٹ بھی ختم ہو گیا۔
گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے ڈرائیور سے چلنے کو کہا اور خود لائبہ کے بارے میں سوچنے لگیں۔



"ڈاکٹر صاحب! میں بالکل نہیں جانتا میں گھر پہنچا تو یہ بے ہوش تھیں۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔
"یہ یونہی بے ہوش نہیں ہوئی ہیں مسٹر! انہیں اچھی خاصی بے ہوشی کی دوا سنگھائی گئی ہے معاملہ سیریس بھی ہے اور قانونی بھی۔" ڈاکٹر کا اعتراض اس کے خدشہ کے عین مطابق تھا۔
"اب میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں صبح کو جاب کے لیے نکلتا ہوں اور کچھ دیر پہلے گھر پہنچا تو یہ اس حالت میں تھیں۔" وہ کچھ اٹک اٹک کر بولا۔
"آپ کے گھر میں اور کون ہوتا ہے؟" ڈاکٹر معائنہ سے زیادہ تفتیش میں دلچسپی لے رہا تھا' اور تنزیل کا جی چاہ رہا تھا کچھ اٹھا کر اس کے سر پہ مار دے۔
"صرف میں اور میری سسٹر!" وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔
"پلیز ڈاکٹر صاحب! آپ ان کو چیک تو کریں...... مجھے یہ بالکل ٹھیک نہیں لگ رہیں۔" اس نے ڈاکٹر کی توجہ لائبہ کی طرف دلانے کی کوشش کی۔
"یہ ٹھیک ہیں بھی نہیں مسٹر...... آپ کا نام؟" وہی تنبیہی افسروں والا انداز۔
"طالب!" وہ اپنا نام بولتے ہوئے رہ گیا۔
جونیئر ڈاکٹر اٹینڈنٹ کے ساتھ لائبہ کو اسٹریچر پر ڈالے' آئی سی یو کی طرف لے گئے۔
"نو سر! ڈونٹ وری! میں بھلا اپنی سسٹر کو چھوڑ کر — اس حالت میں کہاں جاؤں گا پلیز! آپ ذرا اسے اچھی

طرح سے۔" وہ چہرے پر زمانے بھر کی مظلومیت اور معصومیت لا کر بولا تو ڈاکٹر سرہلا تا ادھر چلا گیا' جدھر لائبہ کو لے جایا گیا تھا۔

"موقع اچھا ہے نکل لینا چاہیے۔ یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔" ان کے جانے کے چند لمحوں بعد اس نے سوچا اور کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

اردگرد رش کم تھا۔ یوں بھی آدھی سے زیادہ رات ہو چکی تھی اس وقت رش بالعموم کم ہو ہی جاتا تھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وہ ابھی کاریڈور کے دروازے سے باہر نکلنے لگا تھا کہ ایک عام سے شخص نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

"مم...... میں ذرا پانی پینے جانا چاہتا تھا۔ وہ سامنے......"

اس نے سامنے لگے کولر کی طرف اشارہ کیا تو تنزیل پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سرہلا تا پانی پینے چل پڑا۔



"میڈم یاقوت کہاں ہیں؟" اس نے کچھ بے چینی سے ڈرائیور سے پوچھا۔

"جی معلوم نہیں اندر ہوں گی۔" وہ لاعلمی سے بولا۔

"اندر تو کہیں بھی نہیں ہیں۔ میں دیکھ آئی ہوں۔" وہ لب چبا کر بولی۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

وہ ان کی پی ایس عائشہ کہاں ہیں' انہیں تو پتا ہو گا۔" اسے یکدم خیال آیا تو بولی۔

"معلوم نہیں جی...... مگر شاید وہ بھی جا چکی ہیں۔" وہ اندازے سے بولا۔

عزہ کھڑی کچھ سوچتی رہی اب کیا کرے۔

"چلیں جی!" ڈرائیور اس کی اتنی گہری سوچ سے کچھ اکتا کر بولا۔

"ہوں...... ہاں ٹھہرو۔" وہ کوئی فیصلہ نہیں کرپا رہی تھی۔

"گھر جائے یا ڈرائیور کے ساتھ اسی فلیٹ میں۔"

وہ پھر سے میڈم یاقوت کا نمبر ملانے لگی مگر حسب سابق کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔

وہ فنکشن ادھورا چھوڑ کر چلی گئیں مجھ سے ملے بغیر...... کچھ کہے بغیر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" عجیب سی بے چینی تھی جو اسے مسلسل لاحق تھی۔

تیسری بار نمبر ملانے پر بھی نتیجہ وہی رہا۔ ڈرائیور مودب کھڑا رہا۔

پارکنگ میں گاڑیوں کے دروازے ایک مستقل شور کے ساتھ بند کھل رہے تھے' وہ ہوٹل کے نسبتاً" تاریک گوشے میں کھڑی تھی۔

"میں نے دائم کو دیکھا تو تھا مگر ایک لمحے کے لیے پھر وہ کہیں چلا گیا یا شاید وہیں تھا میری نظروں سے اوجھل۔"

وہ پھر سے دائم کا نمبر ملاتے ملاتے رہ گئی۔

"چلو۔" اس نے فیصلہ کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"ابھی فی الحال فلیٹ پر چلتی ہوں یوں بھی اتنی رات کو گھر جانا...... معلوم نہیں وہاں کیا حالات ہوں...... صبح پاپا سے بات کر کے پھر جاؤں گی اور شاید میم فلیٹ پر پہنچ چکی ہوں۔" وہ کچھ مطمئن سی ہو کر بیٹھ تو گئی مگر اس کا دل مسلسل مضطرب تھا۔

"یہ کیسی بے چینی ہے' اتنا کامیاب شو کرنے کے بعد بھی کیمروں کی فلیش لائٹس' اسپاٹ لائٹ میں خود کو فوکس کروانا کس قدر امیزنگ اور پر لطف تھا مگر اس کے باوجود بھرپور خوشی کا احساس کیوں نہیں..... سمجھ میں نہیں آرہا دل اس قدر بے چین کیوں ہے۔ اندر ہی اندر بیٹھا جارہا ہے۔ گھر میں سب خیریت ہو۔" آخری سوچ حقیقتاً" پریشان کردینے والی تھی۔

"اتنے دنوں سے جو سب تمہاری اس بچکانہ خواہش کا تناؤ جھیل رہے ہیں ان کی خیریت طلب کرنا..... کچھ عجیب نہیں عزہ بی بی!" اندر ہی سے کوئی ڈپٹ کر بولا۔

اس نے کچھ پریشان ہو کر محمود عالم کا نمبر ملایا۔

"کال ریسیو ہو گئی تو کیا کہوں گی۔" وہ عجیب مشکل میں گرفتار تھی اگر نہیں ریسیو ہوتی تو پریشانی..... ریسیو ہو گئی تو کیا جواز پیش کرے گی' اپنی اس حرکت کا.....

تین چار بار نمبر ملانے پر بھی کال ریسیو نہیں کی گئی۔

وہ اور بھی پریشان ہو گئی۔

"دیکھو سنو۔ مجھے میرے گھر ڈراپ کردو۔" وہ بالآخر حتمی فیصلے پر پہنچ کر بولی۔

"وہ جی ہمیں میڈم کا حکم ہے کہ آپ کو فلیٹ پر ڈراپ کریں۔ وہاں سے وہ خود آپ کو جہاں لے جانا چاہیں گی۔ لے جائیں گی۔" وہ مؤدبانہ مگر انتہائی انداز میں بولا اور غصہ کی لہر سر اٹھا کر رہ گئی۔

وہ لاکھ اس کو حکم دے گی۔ وہ وہی کرے گا' جو اس کی میڈم کا حکم ہے اس لیے کہنے کا فائدہ نہیں' اگلے لمحے وہ بھاگ کی طرح بیٹھ چکی تھی۔

"اور یہ میڈم یاقوت میرا نمبر کیوں اٹینڈ نہیں کررہی ہیں۔" آخری کوشش کے بعد اس نے جھلا کر فون بند کردیا اور خود کو ریلیکس کرنے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

اور اندھیرے میں کوئی گاڑی مسلسل اس کی گاڑی کا پیچھا کررہی ہے اسے پتا نہیں چل سکا۔



وہ ادھر ادھر دس جگہوں پر فون کرچکی تھیں مگر لائبہ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ گھر آکر ملازموں پر بھی خوب برس چکی تھیں۔

اور اتنا تو ان کی سمجھ میں بھی آرہا تھا' جس کسی کی بھی حرکت ہے خوب سوچ سمجھ کر پلان کرکے کی گئی ہے۔

اور ان کا ایسا خاص دشمن کون ہو سکتا ہے۔

ان کے دھندے میں تو دشمن زیادہ تھے دوست کم..... اسی لیے تو انہوں نے لائبہ کو ہمیشہ خود سے دور رکھا۔

جو گرم لو انہیں جھلسا سکتی تھی اس کی تپش۔ ان کی بیٹی تک بھی پہنچ سکتی تھی' اس لیے وہ اسے اپنے پاس آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

"اسامہ بیٹا! تم' لائبہ..... میرا مطلب ہے لائبہ تمہارے ساتھ ہے؟" چوتھی بار کی کوشش پر اسامہ کا نمبر مل ہی گیا۔

"نہیں تو آنٹی..... میں تو یہاں ہوں اسپتال میں۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اسپتال میں؟" وہ چونکیں "کس کے ساتھ؟"

"آنٹی میرے فادر کی ڈیتھ ہو گئی ہے تو۔" وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے آہستگی سے بولا تو میڈم یاقوت کو ہزار واٹ کا کرنٹ سا لگا۔

"کون.... آغا جان؟" وہ اٹک کر بولیں۔
"نہیں آنٹی میرے اپنے آئی مین رئیل فادر قاسم بخاری۔" وہ رنجیدگی سے بولا۔
"اوہ اچھا.... سوری۔" وہ سرسری سے لہجے میں بولیں ورنہ انہیں نہ تو کسی قسم کے بخاری کی موت سے دلچسپی تھی نہ اسامہ کی رنجیدگی سے۔
انہوں نے ہمیشہ زمانہ کی اور زمانے والوں کی خود غرضی جھیلی تھی۔ سو وہ بھی خود غرض ہو چکی تھیں، انہیں کسی کے غم دکھ سے کم ہی رنج پہنچا کرتا تھا۔
"اچھا' اسامہ اگر تمہارا لائبہ سے رابطہ ہو تو پلیز مجھے ضرور بتانا میں ویٹ کر رہی ہوں او کے ٹیک کیئر۔" کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔
"اب کہاں اسے تلاش کروں رات کے اس پہر۔" انہوں نے لان کی پول لائٹس کے اوپر تنے ہوئے سیاہ آسمان کو دیکھا' جہاں آج چاند نکلا تھا نہ ستارے۔
شاید بادل تھے یا ان کی قسمت کے اندھیرے جو فلک تک جا پہنچے تھے۔
انہوں نے رنجیدگی سے سوچا۔
میں جو دوسروں کے پیروں تلے یہ کانٹوں بھری چادر بچھانے جا رہی تھی کہ خود میرے پیروں کے نیچے کسی نے انگارے دہکا دیے ہیں۔
ویسی ہی کالی رات ان کی بیٹی کے سر پر تنی کھڑی تھی جس نے برسوں پہلے ان کی زندگی میں کالک بھر دی تھی۔
وہی کالک جو محمود عالم کے منہ پر ملنے جا رہی تھی۔ محمود عالم.... وہ کسی اسپتال کے آئی سی یو میں زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوں گے۔
" جیو یا مرو' مجھے اب تمہاری زندگی موت سے کچھ بھی دلچسپی نہیں۔ مر تو تم میرے لیے اسی دن گئے تھے' جب اپنے کرتوت سے منہ موڑ کر مجھے زندگی کے اس اندھیرے موڑ پر تنہا چھوڑ گئے تھے۔ مر گئے تھے تم میرے لیے محمود عالم اسی رات مر گئے تھے۔"
شدت کرب سے سوچتے آنسو ان کی پتھر جیسی آنکھوں سے چھلک پڑے۔
" میں جب نیلم تھی تب بھی پتھر سمجھا تم لوگوں نے مجھے' ہمیشہ ٹھوکروں میں رکھا اور اب یاقوت ہوں تو بھی پتھر.... پتھر بن چکی ہوں میں محمود عالم اور پتھروں کے سینے میں دل نہیں ہوا کرتے.... صرف کانچ اور روڑے ہوا کرتے ہیں۔" ان کے سیل فون کی بیپ بجنے لگی۔
وہ بری طرح سے چونکیں "لائبہ"....
"میم کام ہو گیا۔ اگر آپ بزی نہ ہوں تو ایک نظر آکر دیکھ لیں۔"
ان کے منصوبے کا اہم ترین حصہ یہ کال بھی تو تھی۔ انہیں یاد آیا۔
"ہوں ٹھیک ہے صبح میں دیکھ لوں گی۔" اف کیسا ظالم احساس تھا جو سارے جسم میں سرایت کرتا جا رہا تھا کہ سب کچھ مل جانے کے بعد کیسا بے معنی سا لگنے لگتا ہے۔ ہر خواہش پوری ہونے کے بعد بے وقعت۔ یہ حقیقت یہ ان لمحوں کے لیے میں صدیوں سے مر رہی تھی' آگ سی جلتی راتیں میں نے ننگے پاؤں گزاریں کب یہ لمحے آئیں گے نہ سارے عذاب یہ ساری اذیت میں بمعہ سود کے محمود عالم کی جھولی میں ڈال سکوں۔
اور وہ لمحے آ پہنچے اور میرے اندر خوشی کی کوئی حرارت ہی نہیں۔ کچھ بھی نہیں' کیسا خالی پن سا ہے۔ کیوں؟"
وہ چیخ کر رہ گئیں۔
"میم! مکسنگ تو نہیں کرنی؟" خاص ٹرم ان کے اس خاص شعبے کا ضروری جزو۔

"اں ہاں ہو جائے تو اچھی بات ہے۔" وہ لمحہ بھر سوچ کر بولیں۔ "میری نفرت کی انتہا تو ابھی تم نہیں، محمود عالم پوری دنیا دیکھے گی جب ڈریسنگ روم کی یہ شاندار کارکردگی اف..... لوگ چٹخارے لے کر اندھیرے بیڈ رومز میں ..... "پہلی بار انہیں کمینہ سا لطف محسوس ہوا تھا۔

"کسی خاص کے ساتھ یا میں خود سے کچھ ارینج کرلوں۔" وہ ان کا سب سے خاص بندہ تھا اور کوڈورڈز میں بہت احتیاط سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں نہیں..... لیکن ٹھہرو تم..... میں تمہیں تھوڑی دیر میں کال کر کے بتاتی ہوں۔" کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

بجلی کے کوندے کی طرح ان کے شیطانی دماغ میں یہ خیال آیا تھا۔

"تنزیل مراد..... تنزیل مراد کے ساتھ عزہ عالم کی وڈیو کی مکسنگ، کیا شاندار آئیڈیا ہے، احسن مراد تم بھی شامل تھے اس شام مجھے ٹھوکریں مار کر کسی کتیا کی طرح گھر سے باہر پھینکنے والوں میں..... تو تمہیں اس تباہی میں سب تو فیق حصہ کیوں نہ ملے..... خالی ثانیہ کے گھر سے چلے جانے کا مزہ نہیں آیا ڈیئر کزن..... تنزیل مراد کی عزہ کے ساتھ یہ فلم جب گھر گھر چلے گی تو اف..... شراب ہو اور اتنی پرانی ہو دو ہرا نشہ۔" وہ خود ہی مزہ لے کر آنکھیں بند کیے جھومنے لگیں۔

اسی لمحے ان کا سیل فون پھر بج اٹھا۔

اجنبی نمبر تھا اور اجنبی آواز لمحہ بھر کو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکیں۔

"لائبہ ہمارے پاس ہے اس کی زندگی کی سلامتی چاہتی ہو تو صبح ہونے کا انتظار کرو ہم اپنی شرائط بتائیں گے اور خبردار پولیس کو انفارم کیا تو بیٹی کی لاش بھی وصول نہیں کر پاؤ گی۔"

وہ ابھی اس سارے پر غور ہی کر رہی تھیں کہ لائن کٹ گئی یا کاٹ دی گئی تو قسمت کی گڈری میں ہمیشہ دو دھاری خنجر رہتا ہے۔ ایک دشمن پر وار کرنے کے لیے اور دوسرا دشمن کے ہاتھ میں ہم پر وار کرنے کے لیے..... یہ کیا تماشا ہے۔" وہ بار بار اس اجنبی نمبر کو ڈائل کر رہی تھیں، جواب مسلسل بند تھا۔

"یہ کون ہو سکتا ہے اور کیا چاہتے ہیں یہ لوگ مجھ سے محمود عالم تو یہ جرات نہیں کر سکتا..... پھر فون؟" بہت سر مارنے پر بھی انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"یہ جہانگیر ہمدانی کدھر ہے؟" بہت دیر بعد انہیں خیال آیا تو اس کا نمبر ملانے لگیں۔



دائم اور مصطفیٰ I.C.U کے باہر تھے۔

ڈاکٹر نے ابھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔

اٹیک شدید تھا جو کہ جان لیوا بھی ہو سکتا تھا۔

"آپ کو انہیں وہاں نہیں لے جانا چاہیے تھا۔" بار بار دل میں مچلتا شکوہ سا بالآخر دائم کے لبوں پر آ ہی گیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے منع نہیں کیا ہو گا' کتنا زیادہ روکا میں نے محمود کو' مگر اس پر تو ایک ہی ضد سوار تھی اور وہ لڑکی..... میرے بس میں ہو تا تو اسے وہیں شوٹ کر دیتا۔"

دائم کو پہلی بار محب مصطفیٰ ایک بالکل بدلے ہوئے انسان لگے تھے غیرت اور عزت کے معاملے میں قتل کو جائز سمجھنے والے۔

"پلیز پاپا!" اگر اسے شوٹ ہی کرنا ہوتا تو یقیناً "پہلا حق اس کے باپ کا تھا" اور اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔ آپ

کو جب اس کا بیک گراؤنڈ معلوم نہیں تو آپ کو یوں مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جتا گیا۔
"تم ابھی بھی، ابھی بھی اس لڑکی کے لیے ایسے نرم جذبات رکھتے ہو جس نے میرے دوست کو موت کے منہ تک پہنچا دیا ہے..... کن گھروں میں لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اولاد احسان فراموشی پر اتر آئے۔" وہ اور بھی آگ بگولہ ہو کر بولے۔
"میرا خیال ہے، ہم یہ سب بعد میں بھی ڈسکس کر سکتے ہیں۔" وہ انہیں یوں طیش میں دیکھ کر قدرے نرمی سے بولا۔
وہ یہ سارا معاملہ نرمی ہی سے سلجھانا چاہتا تھا کہ سختی تو پہلے بھی عزہ جیسی لڑکی کو راہ سے بھٹکا چکی تھی۔
"نہیں نہ بعد میں نہ ابھی۔" وہ ایک دم سخت ہو کر بولے۔
دائم نے جواب میں خاموشی اختیار کرلی۔
دونوں گم صم سے بیٹھ گئے۔ آئی سی یو کے باہر مسلسل ریڈ لائٹ آن تھی۔
اسی وقت سارہ حواس باختہ سی کاریڈور کے اینڈ سے آئیں۔
"محمود عالی ٹھیک ہیں نا فون کر رہی تھی میں مسلسل۔" وہ عجیب ٹوٹے پھوٹے لہجے میں مصطفیٰ سے نظریں ملاتی چراتی کچھ پوچھنے کی کوشش میں نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئیں۔
"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، آپ دعا کریں۔" وہ ان سے نظریں ملائے بغیر بے تاثر لہجے میں بولے۔ سارہ کو دیکھتے ہی دائم کو بھولا ہوا وہ پریشان کن خیال یاد آیا۔
آخر سارہ عالم مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہیں؟" ان کی تحقیر بھری نظروں کو دیکھ کر اس نے بارہا خود سے سوال کیا تھا۔
اسی لمحے رخشندہ کا فون آگیا۔
دائم انہیں مبہم انداز میں جلد آنے کی یقین دہانی کروانے لگا۔
"رخشندہ کا فون ہے؟" مصطفیٰ قریب آ کر بولے۔
"جی پاپا میں نے ان سے کہہ دیا کہ پاپا میرے ساتھ ہی ہیں ہم تھوڑا لیٹ ہو جائیں گے۔" اس نے قصداً" ان کے قریب آنے پر فون بند کر دیا تھا۔
لاؤ، میں ملاتا ہوں دوبارہ۔" انہوں نے فون لینا چاہا۔
"پاپا! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھی سارہ کو دیکھ کر بولا، مصطفیٰ کاریڈور کی گلاس ونڈو سے باہر ہر طرف پھیلی سیاہ رات کو دیکھنے لگے۔
"ابھی نہیں یار! ابھی کچھ نہیں پوچھو۔" وہ تھکے ہوئے سے لہجے میں بولے "بس دعا کرو میرے دوست کو کچھ نہ ہو" بہت دل سے انہوں نے محمود کے لیے دعا کی۔
"میں تو دعا کرلوں گا پاپا! مگر آپ کے جو خیالات ہیں ان کی عزیز از جان بیٹی کے بارے میں انہیں جاننے کے بعد کیا وہ دوبارہ اسی حالت۔" وہ جتا کر بولا۔
"پلیز چپ کر جاؤ ابھی۔" وہ گہرا سانس لے کر بولے۔
"یہ عورت..... محمود عالم کی بیوی سارہ عالم..... آپ سے، مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے؟" وہ پوچھنے سے خود کو روک نہیں سکا۔
"اس کو دو بیماریاں ہیں، دونوں لاعلاج۔" وہ مڑ کر دیکھے بغیر بولے۔

"کیا مطلب کون سی بیماریاں؟" دائم چونکا۔
"ایک شک کی بیماری' دوسری کسی کے دل کو ختم کرنے کی بیماری وہ بھی بزور شمشیر اور دل بھی وہ جو پہلے سے کسی اور کا ہو چکا ہو۔" وہ رک رک کر بولے۔
"واٹ؟" وہ بے اختیار بول اٹھا۔
"آپ..... یعنی یہ آپ سے میرا مطلب ہے' آپ کا دل جیتنا چاہتی تھیں۔" اس کا شک واقعی حقیقت ہو سکتا ہے' یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا صرف خیال سا تھا جس پر وہ خود ہی سو بار لعنت بھیج چکا تھا۔
"ارے نہیں احمق شخص! میں یہ اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا۔" وہ کچھ جھلا کر بولے۔
"تو کس کے بارے میں..... محمود انکل؟"
انہوں نے جواب دیے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اوہ تو محمود انکل ان کے بجائے کسی اور سے محبت کرتے تھے' ہے نا۔" انہوں نے پھر اسی انداز میں سر ہلا دیا۔
"تو کون تھا وہ؟" وہ متجسس ہو کر بولا' یوں تو مجھے بھی کئی بار ان کی گہری نظروں کو دیکھ کر یہ احساس ہوا تھا مگر یہ واقعی فیکٹ ہو گا۔ مجھے پتا نہیں تھا..... کون تھی وہ پاپا جس سے محمود انکل محبت کرتے تھے؟" وہ ان کی طرف جھک کر بولا۔
"کیا کرو گے جان کر؟" وہ اسی انداز میں بولے۔
"اس عورت نے پاپا! مجھے اتنی بار ذلیل کیا' دھتکارا' نفرت بھرا سلوک کیا اور اس کی وجہ آپ نہیں تھے پھر بھی..... تو جاننے کا حق تو ہے نا مجھے؟"
"تم اسے پہلے سے جانتے ہو' وہ بھی بہت قریب سے۔" وہ اسی طرح گھور اندھیرے میں دیکھتے ہوئے بے تاثر لہجے میں بولے۔
"کون..... پلیز پاپا اور تو سسپنس نہ پھیلائیں کون ہے جسے میں جانتا ہوں وہ بھی قریب سے۔" وہ بے تابی سے بولا۔
"تمہاری دوست لائبہ کی مدر یاقوت یہی نام ہے ان کا۔"
وہ ششدر سا انکار یا اقرار میں سر بھی نہیں ہلا سکا۔
"نیلم نام تھا اس کا بہت سال پہلے۔ محمود عالم نے اس سے کورٹ میرج کی تھی اور اس کے بعد اسے اپنانے سے انکار کر دیا تھا اور ایک رات وہ کہیں چلی گئی اور اتنے سالوں بعد نظر بھی آئی تو یاقوت کے روپ میں۔"
دائم ششدر سا یہ انوکھی سی کہانی مختصراً" سن رہا تھا۔
"کہاں چلی گئی؟" بہت دیر بعد اسے خیال آیا۔
"معلوم نہیں۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔
"وہ جس طرح کے کاموں میں انوالو ہے تو پھر سوچو کہاں اس نے اتنے برس گزارے ہوں گے۔" وہ پھر مرے لہجے توقف سے بولے۔
دائم گم صم سا سوچتا چلا گیا۔
"تو اس لیے انہوں نے عزہ کو استعمال کیا محمود انکل سے انتقام لینے کے لیے ہے نا پاپا۔" وہ چند ہی لمحوں میں ساری کہانی کی تہہ تک پہنچ چکا تھا' انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
وہ بالکل خاموش ہو گیا۔
"تو پاپا..... میں' میں کون ہوں اس یاقوت کا کھویا ہوا بیٹا' ہے نا؟" وہ بہت دیر بعد شکست خوردہ سے لہجے میں بولا

اور عزہ اس کا جیسے دل بند ہونے لگا اس سے اگلی بات سوچتے ہوئے۔
"نہیں میری جان جھوٹ بالکل غلط..... ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔۔ رخشندہ ساری بات بتا تو چکی ہے۔" وہ بے اختیار تڑپ کر مڑے تھے۔
"تو پھر..... اس کا بیٹا کہاں گیا؟" وہ بے یقین سے لہجے میں بولا۔
"مل جائے گا..... ڈھونڈ تو رہے ہیں۔"
"جو عورت اتنے سالوں میں محمود انکل کو معاف نہیں کر سکی 'پاپا وہ ماما کو..... نہیں کبھی نہیں۔ وہ نہ بھولے گی نہ معاف کرے گی۔ اب مجھے یہ سارا کھیل سمجھ میں آ رہا ہے..... پاپا اس لڑکے کا ملنا بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری۔" وہ مضطرب سا ہو کر بولا۔
"جانتے ہیں بیٹا! مگر ظاہر ہے اتنے سالوں بعد اس کو یوں تلاش کر لینا بھی تو آسان نہیں۔" وہ سر ہلا کر بولے۔
"تو لائبہ اور وہ گمشدہ لڑکا محمود انکل کی اولاد ہیں؟" ذرا دیر بعد وہ بولا۔
"معلوم نہیں یہ تو اب یا قوت یا وہ نیلم ہی بتا سکتی ہے..... اگر اس نے اس دوران کوئی اور شادی نہ کر لی ہو۔"
اسی وقت کاریڈور میں دو نرسوں کے بھاگ کر آئی سی یو میں جانے کی آواز گونجی 'دونوں چونک کر مڑے اور انہیں دیکھنے لگے۔
"نہیں۔" انہوں نے بے ساختہ سارہ کی گھٹی ہوئی چیخ سنی اور تیزی سے ان کی طرف بڑھے جن کا سر صوفے کے ایک طرف ڈھلک چکا تھا۔



"ڈاکٹر صاحب میرا آئی ڈی کارڈ اور یجنل تو میرے پاس نہیں ہے اور دیکھیے خدانخواستہ میں کوئی غلط شخص تو نہیں ہوں اور آپ مجھ سے یوں Behave کر رہے ہیں۔" وہ احتجاجاً" بولا۔
"اور آپ نے شاید کسی کو مجھے واچ کرنے پر بھی لگا رکھا ہے
This is too much میں کوئی مجرم تو نہیں ہوں اپنی بہن کا علاج کروانے آیا ہوں۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔
"مسٹر ابھی یہ کہاں ثابت ہے کہ لڑکی جو بری طرح سے بے ہوش ہے آپ کی بہن ہی ہے یا....." انہوں نے قصداً" جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
"بہر حال اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن آپ اس کے باوجود ابھی نہیں جا سکتے۔ جب تک آپ کا این آئی سی اور آپ کے آفس کے کسی ذمہ دار شخص سے ہم بات نہیں کر لیتے یا۔" وہ واقعی ڈاکٹر کم کسی تھانے دار ریٹائرڈ ایس ایچ او زیادہ لگ رہا تھا۔ تنزیل دل میں پچھتایا وہ اس اسپتال میں آیا ہی کیوں۔
"اور "یا" کیا؟" وہ جھنجلا کر بولا۔
"یا پھر یہ لڑکی خود ہوش میں آ کر اپنا بیان لکھوا کے آپ کے بارے میں..... اس کا آپ کا رشتہ کیا ہے۔"
"اوہ یہ تو خدا کرے کبھی بھی نہ ہو کہ یہ لڑکی ہوش میں آئے اور تنزیل کے بارے میں انکشاف کرے۔" اس نے بے ساختہ دل میں دعا مانگی۔
"آپ فی الحال یہیں رکیں، صبح ہونے میں دو چار ہی گھنٹے ہیں اس کے بعد کچھ دیکھیں گے۔" ڈاکٹر اسے تنبیہی انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔
وہ کوفت زدہ انداز میں سر پکڑے بیٹھا رہ گیا۔
"اب کیا کروں 'یہ تو الٹی آفت گلے پڑ گئی ہے۔ یہ ڈاکٹر تو مجھے یوں نہیں بخشنے والا اور اگر اس مصیبت کو ہوش آ

بات تو۔"

اس نے بے زار نظروں سے سوئی ہوئی لائبہ کو دیکھا۔

"اور میں تو اس یاقوت بیگم کو فون بھی کر چکا ہوں' آگ تو لگا ہی چکا ہوں اگر اسے ذرا سا بھی شک ہو گیا تو۔"

اسے نئی پریشان کن سوچ نے گھیرا۔

"اس کے لیے یہاں تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا تو کیا کروں' کیسے یہاں سے نکلوں۔۔۔ اگر عائشہ کو یہاں بلا لوں وہ کسی طرح یہ سچویشن ہینڈل کرے' کم از کم اس لائبہ کو تو سنبھال ہی سکتی ہے۔ مجھے بیچ میں سے نکال دے۔"

"تف ہے تنزیل مراد تم پر' ایک لڑکی کی بیساکھی لے کر اس ساری نازک سچویشن سے نکلنا چاہ رہے ہو بس اتنی اہلیت تھی تم میں۔" کوئی بدتمیزی سے اندر بیٹھا اس پر ہنسا۔

"نہیں میں عائشہ سے کبھی یہ ریکویسٹ نہیں کروں گا وہ اور بھی میرا مذاق اڑائے گی۔" اس نے دل میں فیصلہ کیا۔

"مگر مجھے اس سے رابطہ تو کرنا چاہیے۔"

اگلے لمحے وہ عائشہ بخاری کو فون کر رہا تھا مگر اس کی کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔

وہ زچ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر جانے لگا۔

ایک دم سے سوئی ہوئی لائبہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

تنزیل اس بری طرح سے اچھلا جیسے اسے ہزار واٹ کا کرنٹ لگا ہو۔

"اگر تم مجھے سچ سچ نہیں بتاؤ گے کہ تم مجھے کیوں کڈنیپ کرنا چاہتے تھے تو میں ابھی شور مچا کر سارے اسپتال کو اکٹھا کر لوں گی۔" وہ اس پر نظریں جما کر بولی۔

"اور تم جانتے ہو میں یہ کر سکتی ہوں۔" وہ تمسخرانہ نظروں سے دیکھ کر بولی۔

"تو کیا تم بے ہوش نہیں تھیں۔" اس کے یوں روانی سے بولنے پر وہ اچنبھے سے بولا۔

"تم نے مجھے موت کے منہ تک تو پہنچا دیا تھا اور مجھ سے پوچھتے ہو میں بے ہوش نہیں تھی' جانتے ہو نا اس مارے پر تمہیں کتنی سزا ہو سکتی ہے۔"

"مجھے پروا نہیں۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"کیوں مجھے اغوا کیا تھا تم نے؟" وہ پھر سے بولی۔

"یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں۔۔۔ اسے کیوں نہ بتاؤں جس کی وجہ سے میں نے یہ کیا تھا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"یہ تو تم جانتے ہو کہ تمہیں مجھے یہ سب بتانا پڑے گا ورنہ۔"

"مجھے دھمکی دے رہی ہو؟"

"تمہیں بتا رہی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے نڈھال سے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

"تم ابھی ریسٹ کرو۔ ابھی تمہاری طبیعت۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں مجھے' بتاؤ سب تمہیں کیا چاہیے میرے بدلے میں۔"

"سب سے پہلے تمہاری ماں کی اذیت۔ اس کی ذلت اور تمہاری جدائی۔۔۔ دائمی جدائی میں اس کا جو حال ہو وہ۔۔۔ مجھے چاہیے' اپنی ذات کا بدلہ اپنی بہن کی زندگی برباد کرنے کا تاوان اور بہت کچھ لکھو کس حساب کے بارے میں تاؤں بہت حساب نکلتا ہے تمہاری ماں کی طرف میرا۔" وہ تلخی سے بولا۔

وہ اسے دیکھتی رہی کچھ تھا اس کے چہرے پر' کیا؟ لائبہ جان نہ سکی۔

"جو بھی حساب کتاب ہے مجھے سب کھل کر بتاؤ۔ تمہیں تاوان کی ادائیگی میں کرواؤں گی' اگر تم حق بجانب ہوئے تو۔" وہ قدرے نرمی سے بولی۔

"تم سن نہیں سکو گی اپنی ماں کے کرتوت۔" وہ طنز سے بولا۔

لائبہ کچھ دیر کے لیے خاموش سی رہ گئی۔

"یہ میرا مسئلہ ہے تم بتاؤ مجھے۔"

وہ گہرا سانس لے کر بیٹھ گیا۔

"بولو؟" اسے چپ دیکھ کر لائبہ کو الجھن سی ہوئی۔

اور تنزیل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں سے شروع کرے۔

ہاں اس دن سے' جب وہ پہلی بار انٹرویو دینے گیا تھا اس شاندار مقناطیسی عورت کو اور کیسا امپریس ہوا تھا۔

اس نے آہستگی سے وہیں سے بولنا شروع کیا' لائبہ نظریں جمائے اسے سننے لگی۔



"بابا! آپ کی جدائی میرے لیے کبھی نہ بھرنے والا زخم ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ آپ کا جانا بہرحال میری وجہ سے نہ ہوا' خدا نے مجھے اس دائمی کرب سے بچالیا۔ آپ کا جانا میرے پیروں میں پڑی کتنی زنجیریں کاٹ گیا کاش! آپ زندہ بھی رہتے اور یہ زنجیریں بھی کٹ جاتیں مگر ایسا ممکن کب تھا اور میں آپ کی وہ آخری خواہش بھی پوری نہ کر سکی اور آپ جاتے ہوئے مجھے اس بندش سے بھی رہا کر گئے تھینک یو بابا!"

وہ ان کے سرد بے جان ہاتھ کو اپنے چہرے سے لگا کر بے اختیار سسکنے لگی۔

جب وہ اسپتال پہنچی تھی تو قاسم بخاری کو ایمبولینس میں منتقل کیا جاچکا تھا اسامہ ان کے ساتھ ہی تھا۔ اس کا چہرہ بظاہر پرسکون تھا مگر آنکھیں گہرے کرب کا پتا دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر میں اردگرد سے لوگ آنا شروع ہوگئے۔

عائشہ بخاری آہستگی سے اٹھ کر اندرونی کمرے میں چلی گئی کہ محلّے والے بہرحال اس کے بارے میں کچھ ایسی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور بظاہر پرسہ دیتے ہوئے تعزیت کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی طنز کا نشتر اس کا دل تو چھلنی کرتا ہی اسامہ کو بھی چونکا دیتا۔

وہ شاید جانے کے ارادے سے آیا تھا' اور وہ یہاں رک بھی نہیں سکتا تھا اور وہ اس کے جانے تک اپنے تمام بھیدوں کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتی تھی۔

خون کے رشتے سے وہ بھلے بہن بھائی ہوں مگر اتنے سالوں کی دوری نے ہر طرح کی اپنائیت ختم کردی تھی' دونوں کے بیچ ایک ان دیکھی اجنبیت کی دیوار سی تھی۔

اور یہ دیوار اٹھی ہی رہتی تو اچھا تھا۔

وہ کمرے میں آکر سامنے دیوار سے لگی قاسم بخاری کی تصویر دیکھ کر بے آواز آنسو بہانے لگی' اس کا سیل فون بجنے لگا۔

"تنزیل ہوگا۔" اسے فوراً" خیال آیا۔

"تم کہاں مرگئی ہو جاکر' کتنی دیر سے غائب ہو۔" میڈم یاقوت کی چنگھاڑتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"اب آپ مجھے غائب ہی سمجھیں ہمیشہ کے لیے۔" وہ آنسو صاف کرکے اطمینان بھرے انداز میں بولی۔

''اماں! اس لڑ رہی ہو' جلدی پہنچو گھر میں انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ پھر سے دھاڑیں۔

''بہتر ہے یاقوت صاحبہ! آپ اپنے انتظار کو ابھی سے ختم کرلیں۔ کیونکہ مجھے اب کبھی بھی آپ کے پاس نہیں آنا'' وہ پوری جرات سے بولی۔

دوسری طرف لمحہ بھر کو حیرت بھری خاموشی چھا گئی۔

''میرا خیال ہے تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔'' اب کے آواز میں دھاڑ اور چنگھاڑ دونوں ندارد تھیں۔

''آئی ہوں ابھی تو حواسوں میں آئی ہوں' اتنے سال آپ کی بے دام غلامی کرنے کے بعد۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''کہنا کیا چاہتی ہو صاف لفظوں میں کہو۔'' انہیں عائشہ کے لہجے انداز اور الفاظ کسی بہت بڑی تبدیلی کے ہو چکنے کا پتا دے رہے تھے۔

''اتنے سال آپ مجھے کس وجہ سے بلیک میل کرتی رہیں۔'' وہ تیز سانسوں کے بیچ جذباتی پن سے بولی۔

''میری ماں کو تم نے اپنی اس گندی بلیک میلنگ سے اس دنیا سے بے وقت جانے پر مجبور کیا' اور اس کے بعد میرے بابا۔۔۔۔ بابا کو ہتھیار بنایا اور مجھے پامال کرتی چلی گئیں۔'' اس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔

''تم کیا بک رہی ہو شاید جانتی نہیں کہ میں کیا کچھ کر سکتی ہوں۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں غرا کر بولیں۔

''کرلیں جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔'' وہ زور سے بولی۔

''میرے کالے دن رات وہ تاریک گوشے' جن سے میں خود بھی نظر نہیں ملا سکتی' ساری دنیا میں ان کے اشتہار لگا دیں' اس کی تو لگوا دیں۔ میرے بابا جن کی وجہ سے میں تمہارے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی آج چلے گئے۔ رہ گئی میں تو ایکسکیوزمی میڈم! مجھے اب زندہ رہنے کا ذرا بھی ارمان نہیں' آپ کو جو کچھ کرنا ہے کر لیجئے۔ میں اب اس دلدل میں نہیں آؤں گی گڈ بائے۔'' کہہ کر اس نے تیزی سے سیل فون آف کر دیا۔

پلٹنے سے مڑتے ہوئے لمحے بھر کو ساکت سی رہ گئی۔

اس کے عین پیچھے اسامہ کھڑا تھا۔

''تمہاری زندگی کے کالے دن رات اور تاریک گوشے کون سے ہیں' جن کی وجہ سے تم کھلونا بنی رہیں۔۔۔۔ میں جاننا چاہوں گا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں کہتا ہوا اس کے چہرے پر نظریں جما کر کھڑا تھا۔

اور عائشہ بخاری کا حال کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

اس کے کانوں میں اسامہ کی آواز کے بجائے زنجیریں کھنک رہی تھیں۔

یا میڈم یاقوت کے تمسخرانہ قہقہے۔



''تم بکواس کر رہے ہو۔ جھوٹ بالکل غلط۔'' لائبہ اس کی بات سنتے ہی بھڑک کر بولی۔

''کاش ایسا ہوتا' سب غلط جھوٹ اور بکواس۔'' وہ حسرت ناک لہجے میں بولا۔

''تم نہیں جانتیں میں اور میری بہن ہم دونوں جڑواں تھے اور ہم دونوں میں اتنا پیار تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں اور میری وہ بہن کس طرح میری خاطر اس شخص جہانگیر ہمدانی کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر برباد ہو گئی۔ اب وہ کہاں ہے' کس حال میں اتنے مہینوں سے اس کا کچھ پتا نہیں چلا اور یہ سب تمہاری ماں کی وجہ سے۔''

''میری ماں کا اس میں کیا قصور۔۔۔۔ معاملہ تو تمہاری بہن اور جہانگیر ہمدانی کے بیچ پوری انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ طے ہوا تھا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر طنز سے بولی۔

''بات اب! بہر حال مجھے ہر صورت تانیہ چاہیے' اس کے لیے چاہے مجھے تمہاری جان کیوں نہ لینا پڑے۔'' وہ

تیزی سے بولا۔

"میری جان لے کر تمہیں کیا ملے گا بھلا..... کم از کم تمہاری وہ بہن تو نہیں۔" وہ طنز سے بولی۔

"میں تمہیں کر کے دکھاؤں گا۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

"ابھی تو تم فی الحال یہاں سے نکل کر دکھاؤ تو پھر بات کرنا اور میں ابھی یہاں ایک لفظ بول دوں تم مجھے کیوں کس عزائم سے لے کر آئے ہو' سوچو تم گھنٹے بھر بعد کہاں ہوگے اور تمہاری بہن..... اس کا حشر۔"

ایک دم سے شرٹ کے اندر سے نکال کر چھوٹا سا سیاہ پسٹل اس نے لائبہ کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

"میرا حشر جو بھی ہو' شاید تم یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہ بچو۔" وہ دھیمی آواز میں غرا کر بولا۔

اور لمحہ بھر کو سہی لائبہ شاکڈ رہ گئی۔

"خود سے اپنی جان لینا اور بات ہے کسی کے ہاتھوں یوں مرنا بالکل دوسری بات۔"

وہ بالکل خاموش ہو گئی اس سرپھرے سے کچھ بھی متوقع تھا۔

"فون دو مجھے۔" لائبہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"کیا کرو گی؟"

"تمہاری شرائط نہ اپنی مام کو پیش کروں۔"

"وہ میں خود کر لوں گا' ڈونٹ وری۔"

"تو مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"تمہارا تعاون۔"

"کس قسم کا تعاون؟" وہ ذرا سا چونکی۔

"یہاں اس اسپتال سے میرے ساتھ میری سسٹر بن کر خود بھی نکلو اور مجھے بھی..... باقی کیا کرنا ہے۔ یہ میں خود دیکھ لوں گا۔"

لائبہ خاموش ہو گئی۔

"اتنا مشکل کام تو نہیں ہے۔" وہ اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

"تم نے میری مام کو فون کر دیا ہے؟"

"ہاں تمہارے زندہ ہونے کی اطلاع تو کر دی ہے اب تم کہو کیا کہتی ہو تعاون..... یا موت۔" اس کی آنکھوں میں تھکن کے سرخ ڈورے تھے یا واقعی خون اترا ہوا تھا لائبہ صحیح اندازہ نہ لگا سکی۔

"تعاون" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں اعتراف کیا۔

تنزیل کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی' وہ پسٹل واپس شرٹ میں رکھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور سیل فون نکال کر میڈم یاقوت کا نمبر ملانے لگا۔



"مجھے پاکستان جانا ہے۔" تانیہ نے سامنے بیٹھے اس گھنگھریالے بالوں کی خوب پھولی ہوئی پونی بنائے موٹے بے ہنگم وجود والے باب سے کہا۔

"تم ہر ملک میں جا سکتی ہو سوائے پاکستان کے۔" وہ بے ہنگم انداز میں منہ میں پڑی چیونگم کو پھلاتے ہوئے اپنے سیل فون کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔

"مگر کیوں؟" وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

"[illegible] ارار ہے ڈارلنگ!" وہ مصنوعی پن سے بولا۔
[illegible] پاکستان جانا ہے۔" وہ ہٹیلے پن سے بولی۔ "جب میں سب کچھ آپ لوگوں کی مرضی کے مطابق کر رہی
[illegible] بھی حق ہونا چاہیے کہ اپنی مرضی کی ساری نہ سہی تھوڑی بہت تو پوری کر سکوں اور میرے پیرنٹس
[illegible] میں رہتے ہیں اور مجھے ان سے ملنے جانا ہے۔" وہ تیز تیز بولتی چلی گئی۔
"[illegible] کے لیے تم میم یاقوت یا پھر باس سے لکھوانا یا آرڈر کروانا پڑے گا تم جہاں مرضی جاؤ پھر مگران کے حکم
[illegible] امپاسبل۔" اس نے کندھے اچکا کر بے نیازی سے کہا۔
[illegible] پہانے لگی۔
"[illegible] کوئی صورت؟" تھوڑی دیر بعد اس نے پھر آس بھرے لہجے میں پوچھا۔ کیونکہ یہ تو اسے پتا تھا وہ دونوں ہی
[illegible] طرح کا کوئی آرڈر نہیں دیں گے، کبھی بھی نہیں۔
"ہاں ہے تو ایک صورت اور بھی۔"
"وہ کیا ہے؟" ثانیہ بے تابی سے بولی۔
"تمہاری موت تم مرجاؤ گی تو ہم تمہاری ڈیڈ باڈی بے حد احترام کے ساتھ پاکستان بھجوا دیں گے۔ بغیر باس اور
[illegible] کے آرڈر کے اوکے۔" وہ خباثت سے ہنسا۔
[illegible] یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔
"مجھے منظور ہے۔" وہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔
"کیا؟" باب حیرانی سے بولا۔
"اپنی موت تم میری ڈیڈ باڈی پاکستان بھجوانے کا انتظام کرو اوکے بائے۔" یکدم وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔
باب حیران سا بیٹھا رہ گیا پھر جلدی سے جہانگیر ہمدانی کا نمبر ملانے لگا۔
ثانیہ سیدھی کیمسٹ کے پاس گئی اور اس نے سلیپنگ پلز خرید کر اپنے بیگ میں رکھ لیں اس کا ذہن اس وقت

سخت پراگندہ ہو رہا تھا۔
"میں کس لیے جی رہی ہوں اپنے لیے؟ اپنے جسم کی دن رات پامالی کے لیے بس اور نہیں......" اس کا جی بھرا ہوا تھا چھلکنے کو تیار۔
"نہ میرے ماں باپ میری شکل دیکھنا چاہتے ہیں نہ میرا پیسہ استعمال کرنا چاہتے ہیں' کس کے لیے کماؤں کس کے لیے یہ سب کر رہی ہوں میں.... اپنے لیے ؟نہیں مجھے اپنے لیے ایسی گندی زندگی نہیں جینا.... کاش! مجھے یہ خیال پہلے آجاتا تو میں اپنی جان لینے سے پہلے اس جہانگیر ہمدانی کے منحوس وجود کو ختم کر دیتی اور ساتھ میں خود کو.... کچھ تو فائدہ ہوتا میرے مرنے کا کسی کو کوئی ایک تانیہ بچ جاتی' اس کا اگلا شکار بننے سے.... کاش میں نے اس کو مار ڈالا ہوتا۔"
پانی کے گلاس کے ساتھ پلز لیتے ہوئے بے تحاشا ملال نے گھیرا۔
"کچھ دیر اور اے زندگی' اس نے گولیاں ہتھیلی پر نکالنے سے پہلے آنکھیں بند کر کے ذرا دیر کو یا سمین احسن تنزیل ربیعہ اور ثانیہ کو سوچنا چاہا۔
آنکھیں بند کیے اس نے بیگ سے سیل فون نکالا۔
"آخری بار ان کی آواز تو سن لوں۔" اس نے سیل نکال کر آن کیا۔ وہاں کوئی میسج پہلے سے موجود تھا۔
اس نے بیزاری سے Inbox کھولا اور پڑھنے لگی اور مبہوت سی بیٹھی رہ گئی۔



"مجھے گھر چلے جانا چاہیے تھا میں یہاں کیوں چلی آئی۔" فلیٹ میں آتے ہی اسے پچھتاوے گھیرنے لگے۔
"جانے کیوں دل اس قدر بے چین ہے اپنی زندگی کا سب سے بڑا ایڈونچر کرنے کے بعد بھی اس قدر بے چینی اور بیزاری مگر کیوں؟" اسے اپنی کیفیت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔
میڈم یاقوت کو وہ کئی بار فون کر چکی تھی مگر ان کا سیل فون بند تھا انہوں نے خود بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا اور وہ بدتمیز ڈرائیور اسے ادھر پھینک گیا' یقیناً یہ میڈم کا حکم ہو گا مگر اب وہ مجھے کس لیے یہاں رکھنا چاہتی ہیں۔
"مجھے گھر جانا چاہیے میں نے پاپا سے وعدہ کیا تھا کہ میں فوراً گھر آجاؤں گی۔" اس نے سیل فون نکال کر محمود عالم کا نمبر ڈائل کیا۔
بیل مستقل جا رہی تھی اور کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔
اس کا دل اور بھی ڈوب گیا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ پاپا اس کا فون نہ ریسیو کریں یا کچھ اور مسئلہ.... کیا؟" وہ بے چین سی سوچے گئی۔
رات کے تین بج رہے تھے۔
اس وقت وہ خود سے بھی نہیں جا سکتی تھی۔
"چند گھنٹے تو انتظار کرنا ہی پڑے گا مگر یہ چند گھنٹے۔" پوری رات جاگنے کے بعد بھی اسے نیند نہیں آرہی تھی۔
پھر اس نے گھر کے لینڈ لائن نمبر ڈائل کیا۔ وہ بھی کسی نے ریسیو نہیں کیا۔
"دائم کو فون کروں؟" وہ شش و پنج میں مبتلا ہو کر سوچنے لگی۔
"دائم کا نمبر میں نے لکھا تھا۔" اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ سیاہ رنگ کی ڈائری اس کے ہاتھ میں تھی۔
"یہ ڈائری کس کی ہے؟" اس نے حیرانی سے سوچا اور دوسرے لمحے اسے یاد آگیا' یہ تو میڈم یاقوت کے بیگ سے گری تھی۔
"تو کیا یہ میم کی ہے؟" اسے تجسس نے گھیر لیا۔

وہ بالکل بھول گئی کہ اسے دائم کو فون کر کے پاپا کے بارے میں پوچھنا ہے۔
بیگ ایک طرف رکھ کر اس نے ڈائری کا پہلا صفحہ کھولا۔
حیرت بھرے انداز میں تین چار اور پھر کئی صفحے الٹا کر دیکھے۔
"یہ تو کسی نیلم نامی لڑکی کی کہانی ہے۔ میم کے پاس شاید وہ لڑکی بھی میری طرح سے میم کے پاس..... لیکن یہ عالی کون ہے..... عالی محمود عالم۔" لمحہ بھر کو تو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔
دوسرے پل وہ بے تابی سے پڑھنے لگی۔
جوں جوں وہ پڑھتی جا رہی تھی، تحیر سے اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔
وہ محمود عالم اور نیلم کی کورٹ میرج تک پہنچی تھی کہ اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔
کوئی چیز آہستگی سے اس کی گردن پر سرسرائی۔
اس کے ہاتھ سے بے اختیار ڈائری چھوٹ کر گر گئی۔
اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔



یاسمین گہری نیند سو رہی تھیں اور جیسے خواب میں کوئی مسلسل دروازے کی گھنٹی بجا رہا تھا یا فون کی بیل بجے جا رہی تھی۔

گہری نیند میں ان کے حواس کام نہیں کر رہے تھے کہ اس مسلسل ڈسٹربنس سے گھبرا کر انہوں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔
دوسرے کمرے میں پڑا فون مسلسل بج رہا تھا۔
"یا اللہ خیر۔" وہ دل پر ہاتھ رکھے تیزی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئیں۔
اسی وقت آغا جان دوسرے کمرے سے اندر داخل ہوئے۔
یاسمین نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا اور سارے گھر کے سناٹے میں گونجتے اس گھنٹی کے شور نے ایک طوفان بپا کر رکھا تھا، سکون سا چھا گیا۔
"کیا..... کیا کہا؟" ان کے منہ سے چیخ کی شکل میں نکلا۔
اور دوسرے لمحے نڈھال سے انداز میں انہوں نے فون رکھ دیا۔
"کون..... کون تھا یاسمین؟" آغا جان نے اپنے کمزور دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔
وہ کسی بت کی طرح ساکت تھیں۔
انہوں نے پاس آکر یاسمین کا کندھا جھنجھوڑا۔
"یاسمین! کس کا فون تھا؟" وہ اب کے ذرا زور سے بولے۔
"بہت بری خبر ہے آغا جان!" وہ شاکڈ لہجے میں بولیں۔
اور آغا جان پتھرائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے کہ اب ان کے دل میں کسی بھی ایسی بری خبر کو سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

ناولٹ

اسے سمیعہ رحیم کا کام دیکھنے میں مزا آتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سمیعہ رحیم کو کام کرتے دیکھ کر اسے ایک عجیب سے لطف کا احساس ہوتا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے اس پپٹ ورکشاپ (پتلی گھر) سے وابستہ تھا اور اس کے سامنے کئی لوگ یہاں کام کرکے یا سیکھ کر جا چکے تھے۔ کئی ایسے بھی تھے' جو اس سے پہلے یا اس کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے اور تاحال کام کر رہے تھے مگر یہ اتفاق کی بات تھی کہ سمیعہ رحیم سے پہلے اس نے کسی کے کام میں اتنی دلچسپی نہیں لی تھی۔

سمیعہ رحیم کو کام کرتے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے اس کے ہاتھ بنے ہی اس کام کے لیے تھے۔ وہ سٹرنگ' اسناد لے کر آئے ہوئے تھے' خود سعد کے پاس آرٹس اینڈ کرافٹس کے کئی تربیتی کورسز کی اسناد تھیں جن میں سے کچھ اس نے بیرون ملک اداروں سے حاصل کی تھیں مگر ایک عام اور سادہ تعلیم کے ساتھ آنے والی لڑکی سب پر سبقت لے گئی تھی۔

"میں "ضرورت مندوں" کی کیٹگری میں آتی ہوں۔" ایک دن سمیعہ نے اسے بتایا تھا" نوشیرواں ایک نیک دل انسان ہیں' جو کام کی تلاش میں آنے والوں کو کیٹگرائز کرتے ہیں' سیکھنے والے' تجربہ حاصل کرنے والے اور ماہر۔ چوتھی کیٹگری ضرورت مندوں کی ہے' میں نے جب اپلائی کیا تو

عنیزہ سید



راڈ اور ہینڈ سب ہی قسم کی کٹھ پتلیاں بناتی تھی اور اس مشاقی سے بناتی تھی کہ دیکھنے والے کو ان کی بناوٹ میں کبھی کوئی جھول نظر نہیں آتا تھا۔ اسے صرف ایک بار کہانی کی تھیم اور کردار کی تفصیل بتانے کی ضرورت پڑتی تھی اور باقی کا کام وہ خود کرتی تھی۔

سمیعہ رحیم کے کام میں دلچسپی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے کسی آرٹ کالج' اکیڈمی یا ادارے سے اس کام کی باقاعدہ تربیت نہیں لی تھی' اس کے پاس صرف گریجویشن کی ڈگری تھی اور وہ بھی عام سے مضامین کے ساتھ' جبکہ اسی ورکشاپ میں کام کرنے والے کئی اور لوگ نامور اداروں سے اعلا ڈگریاں اور

میرے تعارف پر "ضرورت مند" کا ٹیگ لگا کر ایچ آر کے پاس بھجوایا گیا تھا۔" اس نے سادہ سے انداز میں بتایا تھا۔

"خیریت۔" سعد نے چونکے بغیر کہا۔ "ضرورت مندی کیسی؟"

"روزی روٹی کے مسائل اور کیا۔" وہ بے نیازی سے بولی "میں نے نوشیرواں سے کہا۔ میرے پاس اعلا ڈگری ہے نہ اونچے الفاظ' میرا تعلیمی پس منظر بھی عام سا ہے' میں کوئی زیادہ اچھی طالبہ نہیں رہی کبھی بھی۔ اگرچہ مجھے آوٹ اسٹینڈنگ کہلانے کا شوق تھا مگر میرے امتحان کی رپورٹس پر ہمیشہ "ایوریج"



لکھا ہوا ملتا تھا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں نے کسی آرٹ اینڈ کرافٹ کے ادارے کی شکل بھی نہیں دیکھی‘ میں نے اس سے پہلے کہیں کام بھی نہیں کیا‘ مجھ میں آپ کو کوئی پروفیشنل اپروچ بھی نظر نہیں آئے گی‘ مگر مجھے یہ کام آتا ہے۔ آپ مجھے چند روز آزما کر دیکھ لیں‘ اگر میرا کام ٹھیک ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ خدا حافظ کہہ دیجیے گا۔“

”پھر؟“ سعد کے لہجے میں لحہ بھر کو تجسس ابھرا۔

”پھر پتا نہیں کیوں اور کیسے نوشیرواں کے دل میں رحم کے جذبات لڈے اور انہوں نے پوچھا ”متوقع تنخواہ کیا ہے تمہاری؟“ میں نے کہا ”شروع میں تو بھلے آنے جانے کا کرایہ دے دیجئے گا۔“ وہ بولے ”نہیں ہم اتنے بھی برے نہیں“ انہوں نے میری غلطیوں سے بھرپور سی وی پر ”ضرورت مند“ کا ٹیگ لگایا اور حمید صاحب کے پاس بھیج دیا۔“

”تمہیں دکھ نہیں ہوا ”ضرورت مند“ کے الفاظ دیکھ کر؟“ سعد نے دانستہ پوچھا۔

”دکھ کیسا؟“ وہ اون کے نیلے گولے کے دھاگے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔ ”میں تو پتا نہیں کہاں کہاں جوتیاں چٹخانے کے بعد یونہی ادھر آنکلی تھی۔ میری قسمت مجھ پر مہربان ہوئی جو نوشیرواں مجھے بیرونی دروازے پر مل گئے ورنہ میری ان تک رسائی کہاں ممکن تھی۔“ اس کے لہجے سے قناعت اور شکر گزاری ٹپک رہی تھی۔

”انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے تمہاری بات سن لی؟“ سعد کو اس کی داستان سننے میں مزا آنے لگا تھا۔

”لو میں بتا رہی ہوں نا‘ اللہ مجھ پر مہربان تھا اس روز۔“ اس نے انگلی پر لپٹے اون کو گول ناک کی شکل دیتے ہوئے کہا۔

”اور اگر اللہ مہربان نہ ہوتا تو تم کہاں ہوتیں آج؟“ سعد نے مذاق سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں جس علاقے میں رہتی ہوں ناں۔“ اس نے اون کے بل دیے لمبے دھاگوں کو قینچی سے کٹ لگانا شروع کرتے ہوئے کہا ”وہاں زیادہ تر لوگ فٹ بال سی کر روزی کماتے ہیں‘ وہاں کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں پر تمہیں فٹ بال سینے کے دھاگوں اور چمڑے کے چھوٹے ٹکڑوں کے انبار نظر آئیں گے‘ میں ان کو جمع کر رہی ہوتی۔“

”ارے واہ!“ سعد کو حیرت ہوئی۔ ”ان چیزوں کو جمع کر کے تم کیا کرتیں؟“

”ان ہی چیزوں کو جمع کر کے تو ہم اب تک رزق کماتے آئے ہیں۔“ سمیعہ نے پرسکون لہجے میں کہا ”ان ہی سے تو ہمارے ہاتھوں میں ہنر اترا ہے‘ ان ہی پر مشق کر کر کے تو ہم نے دھاگوں‘ کترنوں اور اون کے ٹکڑوں کو شکل دینا سیکھی ہے۔“

”ہم!“ سعد نے اس کے سارے جملے میں سے سوال کرنے کے لیے اسی لفظ کو چنا۔

”ہاں ہم۔“ وہ آہستہ آواز میں بولی ”میں اور میری اماں۔“



”پیٹ کی بھوک انسان کو برائی پر بھی مجبور کر سکتی ہے اور جس کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی‘ وہ خودکشی پر بھی مائل ہو سکتا ہے۔“

ٹی وی کے کسی چینل پر ہونے والے مذاکرے کا کوئی شریک کہہ رہا تھا۔

”برائی کی طرف مائل ہو یا خودکشی کی طرف راستے تو گناہ کے ہیں۔“ خشخشی داڑھی والے ایک مولانا نے فوری فتویٰ صادر کیا۔

”مگر سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ عوامل کیا ہیں جو عام انسان کو برائی یا خودکشی کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ مذاکرے‘ مباحثے‘ گفتگو سب اس ایک نکتے پر ہونا چاہیے جناب‘ اپنے اپنے پرآسائش ڈرائنگ رومز‘ ان کی یخ بستہ مباحثہ رومز میں بیٹھ کر جو بات کی جاتی ہے وہ نقلی ہوتی ہے غیر حقیقی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی زندگیوں کا قریب سے مشاہدہ‘ ان کے دکھوں کو محسوس کرنے والا دل‘ ان کے حقوق کی پامالی کے خلاف اند سے اٹھائی جانے والی آواز ان سب کا فقدان ہے

...تو غریب کے مسائل بڑھتے جا
...ہیں۔ معاشرے میں بے انصافی، ظلم و ستم،
...داری، برائی، خودکشیاں۔"
...کر ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا
تھا۔

"...سب سوال پر جن کی آپ صاحبان نے نشان
...ہم تفصیلی بات کریں گے، مگر ابھی وقت ہوا
...ہم بریک لیتے ہیں۔ بریک کے بعد ملتے
...ناظرین۔"

...یٹ سوٹ اور ٹائی پہنے مدبر سی شکل کے
...نے اپنے مہمان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور
...میں وقفہ آ گیا۔

"...بند کرا سے۔" اماں نے سمیعہ کے ہاتھ سے ٹی
...ٹ کنٹرول پکڑ کر آف کا بٹن دبا دیا۔

"میں سب جانتی ہوں ان کمینوں کو، یہ یہاں پر اس
...کو کرنے کے بھی پیسے لیتے ہیں۔ کم بخت
...کماتے ہیں اور شہرت بھی کما لیتے ہیں۔"

"اماں!" سمیعہ نے اماں کو غور سے دیکھا۔

...نے بالوں میں مہندی لگائی ہوئی تھی، ہاتھ میں
...بھنوؤں کے بال اکھڑے جا رہے تھے،
...کے آثار نظر آ رہے تھے، کانوں کی
...قسم کے چھوٹے بڑے ٹاپس سجے تھے۔
...کے ناخنوں پر مہندی کا گاڑھا سرخ رنگ
...تھا۔ لاجونتی، نوٹنکی اس کے ذہن سے دو لفظ

"ہمارے ماں باپ، ہمیں اللہ کی طرف سے قسمت
...وہ جیسے ہوتے ہیں۔ ان کے ویسے ہونے
...دل لینے پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔ ہمیں
...قبول کرنا پڑتا ہے جیسے وہ ہمیں ملتے ہیں،"
...کے پڑھے الفاظ یاد آئے۔

"...شہزادی لاجونتی۔"

...اس تعارف سے بچپن سے واقف
...تھی کہ وقت کے ساتھ انسانوں
کے مزاجوں میں تبدیلیاں آجاتی ہیں، اسے اماں کے
اس تعارف پر کبھی بھی دل میں پسندیدگی کے جذبات
امڈتے محسوس نہیں ہوئے تھے، نہ ہی اماں کا حلیہ
اسے کبھی پسند آیا تھا مگر وہ ہمیشہ وقت اور عمر کے ساتھ
مزاج میں در آنے والی تبدیلی کی بھی منتظر رہی تھی۔
اس کا بچپن گزرا، لڑکپن آیا اور پھر نوجوانی کے بعد وہ
جوانی کی چوکھٹ پر بھی آن کھڑی ہوئی، مگر اماں کا حلیہ
اور انداز وہی کا وہی رہا، نہ بڑھتی عمر اسے بدل پائی نہ
گزرتا وقت رتی بھر تبدیلی لا سکا۔ نوٹنکی کی شہزادی
لاجونتی "سدا بہار" اور جوان رہنے کے شوق میں بد
مذاقی کا ایک چلتا پھرتا نمونہ نظر آنے لگی تھی۔

اس نے اماں کے بڑے بڑے پھولوں والے سرخ
لان کے سوٹ پر نظر دوڑائی اور پھر اس کی نظر اس کے
پیروں پر پڑی جو سستی پلاسٹک کی سرخ چپلوں میں مقید
تھے۔

"ارے میں کیا اماں کی شخصیت کا شدید رد عمل
ہوں۔" اس نے دیوار پر لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔
"کبھی کبھی مجھے اپنا آپ ماں کی عمر کا اور ماں کا وجود اپنی عمر
کا سا لگتا ہے۔"

"میں نے اس دنیا میں عمر گزاری ہے پتر جی۔"
اب اماں چنے چاٹ کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرتے
کہہ رہی تھی، سمیعہ نے چونک کر اپنا دھیان اس کی
طرف کیا۔

"میں اس وقت سے فیلڈ میں ہوں جب یہ رنگ
برنگے نام نہیں ہوتے تھے۔ پرفارمنگ آرٹ، سنجیدہ
تھیٹر، لچر تھیٹر، تلی ورک شاپ، صوتی آرٹ، بصری
آرٹ، ہائے ہٹاؤ کمبخت۔"

اس نے ہاتھ سے پلیٹ پر بھنکتی مکھیوں کو ہٹاتے
ہوئے کہا۔

"سارے فن گڈمڈ تھے، خلیفہ بشیر کی نوٹنکی میں کیا
کیا نہیں پیش کیا گیا۔ آئے ہائے ہائے۔"

اس نے آنکھیں موند کر کچھ یاد کیا اور مزا لیتے
ہوئے کہا۔

"اس لاہور شہر کے بڑے بڑے فنکار بھی مشق کی خاطر خلیفے کے پاس آتے تھے۔ یہ جواب سیکھتے ہیں نا' بڑے بڑے کالجوں اور اکیڈمیوں میں' اس وقت خلیفہ سکھاتا تھا لوگوں کو' یہ جسے کہتے ہیں چہرے کے تاثرات اور آواز کا اتار چڑھاؤ اور ٹیمنگ (ٹائمنگ) سب سکھاتا تھا خلیفہ 'ادھر سے انٹری کب دینی ہے اور ادھر سے ایگزیٹ (ایگزٹ) کب کرنا ہے' بڑی سختی ہوتی تھی۔ ایک ایک لمحے کا حساب رکھ کر کام کراتا تھا اور جو چڑھ گیا گسہ (غصہ) خلیفے کو تو پتر جی! تیری خیر نہیں۔" اس نے قہقہہ لگا کر زانو پر ہاتھ مارا۔

"مجھے کہتا تھا' لے پتر لا جونتی' تو تو ہو گئی ہے پرفے کٹ (پرفیکٹ) میری سوٹیاں کھا کھا کر پر ان سوروں کا کیا کروں جو نہ سیکھتے ہیں نہ مار کا اثر لیتے ہیں اور ان کو دیکھو ٹلی ویزن (ٹیلی ویژن) والوں کو' ان کو لے لیتے ہیں ہاتھوں ہاتھ۔ یہ سن کر کہ خلیفے بشیر کے شگرد (شاگرد) ہیں۔ قسم اللہ پاک کی۔ جب ان کی آوازوں کے جھول سنتا ہوں اور شکلوں کے چھب دیکھتا ہوں آٹھ والے ڈرامے میں تو بس نہیں چلتا کہ کس کس کے چپیڑیں ماروں دس گنوں ایک بھی نہ۔"

سمیعہ یہ گفتگو کئی سالوں سے سنتی آرہی تھی' جن لوگوں کے بارے میں اماں بتاتی تھی کہ بشیر کے شاگرد رہ چکے تھے اور جن کو رکھ رکھ کے چپیڑیں مارنے کو اس کا دل چاہتا تھا۔ اب ملک کے نامور سینئر آرٹسٹ تھے۔ پہلے جب بہت سے پروڈکشن ہاؤسز نہیں کھلے تھے اور اتنے زیادہ چینلز بھی نہیں تھے۔ پی ٹی وی کے ہر دوسرے ڈرامے میں وہ نظر آتے تھے اور اب جب چینلز اور ڈراموں کی بھرمار تھی۔ ہر چینل پر وہ چہرے سجے رہتے تھے اور اماں جو خلیفے کی سوٹیاں کھا کھا کر پرفیکٹ ہو چکی تھی اس کا وقت سستے تھیٹر ڈراموں' میلوں' ٹھیلوں میں لگنے والی نوٹنکیوں اور سرکس میں ہونے والے فضول رقصوں میں گزرتا تھا۔

وہ اتنی پرفیکٹ تھی کہ معمولی سائیڈ رولز پر بھی سمجھوتے کر لیتی تھی اور بڑے شوق سے انہیں ادا بھی کر لیتی تھی۔ وہ جوا یورنیو اور شاہ نور اسٹوڈیوز کے قصے سناتے نہیں تھکتی تھی' سمیعہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ان اسٹوڈیوز کے قریب بھی کوئی اسے پھٹکنے دیتا۔

"میری ماں پرچھائیوں کی دنیا میں رہتی ہے۔" اب وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئی تھی' پہلے جو اس کی خواہشات تھیں۔ اب وہ پرچھائیاں بن گئی ہیں اور وہ ان میں رہتی' خوش ہوتی اور مزے لیتی ہے۔ اسے اس سے باہر نکالنا بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

جب کبھی ان سارے کاموں سے اماں کو فرصت ملتی تو وہ محلے سے باہر کھلے میدان کے کچرے سے فٹ بال سینے کے دھاگے' چمڑے کے چھوٹے ٹکڑے اور کپڑے کی دھجیاں چنتی رہتی۔ ان چیزوں کو گھر لا کر وہ ترتیب سے رکھتی۔ ان پر جمی مٹی جھاڑتی اور پھر اپنے ہاتھوں کے ہنر سے ان کو نئی شکلیں دینے میں مصروف ہو جاتی۔ یہ وہ واحد مشغلہ تھا جس میں سمیعہ نے ہمیشہ دلچسپی لی۔ پہلے پہل اماں اسے ان چیزوں سے کھیلنے کے لیے گڑیا بنا کر دیا کرتی تھی۔ پھر ان معمولی اور بے کار چیزوں نے کچھ اور شکلوں کا روپ دھارنا شروع کر دیا۔ بطخ' طوطا' بلا' چھوٹی سی لڑکی' بڑھیا' بابا' چڑیا' سمیعہ کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

"یہ بولتے نہیں ہیں اماں؟" وہ شوق سے پوچھتی۔

"بول سکتے ہیں' کیوں نہیں بولتے۔" اماں نے ان چیزوں کو داستانوں کی شکل میں بتانا شروع کر دیا' پھر ہاتھ پر چڑھا کر وہ مختلف آوازیں نکال کر ان بے جان داستانوں میں آواز ڈالتی۔

یہ کھیل سمیعہ کا پسندیدہ کھیل بن گیا۔ اماں کا موڈ اچھا ہوتا تو وہ ان شکلوں کو پتلی ڈوریوں یا تاروں سے جوڑ دیتی جن کو ہلانے سے یہ خدوخال حرکت میں آجاتے اور ایک نیا تماشا شروع ہو جاتا۔ سمیعہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ خلیفہ بشیر کی ہونہار شاگرد نے اس کام میں بالآخر مہارت حاصل کر لی تھی جو خلیفہ بشیر نے اسے کبھی سکھایا ہی نہیں تھا۔



"شہزادی اور مینڈک۔" کیا کہانی ہے یار! مگر اس کو
بالی ووڈ میں تبدیل کرنا ذرا ٹیڑھا کام ہے۔" سعد نے
سمیعہ کو بتایا تھا۔
"کیوں؟" سمیعہ نے سوالیہ نظروں سے اسے
دیکھا۔
"سمیعہ کی سمجھ میں نہیں آئے گی یہ بات۔"
انجیلا ابراہیم نے اس گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے
کہا تھا۔ انجیلا ورکشاپ کی سب سے زیادہ پڑھی
لکھی آرٹسٹ تھی۔ Mimicing (نقالی) اور
ڈائیلاگ ڈلیوری میں اسے کمال حاصل تھا۔
"سمیعہ دیسی کہانیوں کے دیسی کردار بنانے کے
علاوہ کوئی اور کام نہیں جانتی۔"
انجیلا کا سمیعہ کے ساتھ رویہ ایسا ہی ہوتا تھا
جیسا ترقی یافتہ ملکوں کا غیر ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ۔
"کہانی کیا ہے؟" سمیعہ نے انجیلا کی بات پر
دھیان دیے بغیر قریب کھڑے سفیان سے پوچھا تھا۔
"لیجنڈری فیری ٹیل۔" سفیان نے اس کی
طرف مسکرا کر دیکھا "تم نے کبھی پڑھی ہیں پریوں کی
کہانیاں سمیعہ؟"
اس کے چہرے پر ایسا تمسخرانہ تاثر تھا جیسے اس کو
یقین ہو کہ سمیعہ نے کبھی بھی پریوں کی کہانیاں نہیں
پڑھی ہوں گی۔
"پریوں کی کہانیاں۔" سمیعہ نے زیرلب دہرایا۔
"پڑھی نہیں ہیں مگر پریاں دیکھی ہیں۔"
"واؤ' زبردست!" سفیان اور انجیلا کے منہ سے
ایک ساتھ ہنسی چھوٹی۔
"کہاں؟" چونگی اور سدھو کے ارد گرد یا پھر باغبان
[illegible] فضاؤں میں؟"
"کیا مطلب؟" سمیعہ نے ان کی طرف دیکھا'
اس کے انداز میں معصومیت تھی' یقیناً ان کی بات
اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
"[illegible] کی ہواؤں میں اڑتی
[illegible]" سفیان نے گردن اور دبا کر بازو دائیں بائیں
[illegible] کہا۔
"میں سمجھی نہیں۔" سمیعہ نے سر ہلایا۔
"کسی ایسے ہی علاقے کی رہائشی ہو گی نا تم' تو پریاں
بھی تو وہاں ہی نظر آتی ہوں گی تمہیں۔" انجیلا نے
ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔
"ایسے علاقوں میں پریاں نہیں' جہاز اکثر نظر آتے
ہیں۔" سفیان نے تمسخر اڑانے کے سے انداز میں
انجیلا کو بتایا "جہاز' یو نو۔"
اس نے نشہ بازوں کے سے انداز میں آنکھیں
چڑھا کر لڑکھڑاتے ہوئے بتایا۔
"کیا علاقے ہوں گے یہ بھی۔" انجیلا نے انتہائی
حقارت سے کہا اور جھرجھری لے کر ہال کے دوسرے
کونے کی طرف چلی گئی۔
سمیعہ نے ایک نظر ہال میں موجود سب لوگوں پر
ڈالی' جن میں سے زیادہ تو زیرلب مسکرا رہے تھے اور پھر
نظریں جھکا لیں۔
"میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"
اس روز لنچ بریک میں سعد نے سمیعہ کی ٹیبل پر بیٹھتے
ہوئے کہا۔
"تم کیوں؟" اس نے اپنا لنچ باکس بیگ سے نکال کر
میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم نے تو کچھ نہیں کہا
تھا۔"
اس نے لنچ باکس کا ڈھکن کھولا۔ ڈبے کے اوپر
والے حصے میں آلو کا کوئی خشک سالن تھا۔
"مگر یہ غلط ہے' بہت غلط' ان لوگوں کے دماغ
خراب ہیں۔" سعد کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ
یہ معذرت کیوں کر رہا تھا۔
"ہونے دو' کیا فرق پڑتا ہے۔" سمیعہ نے ڈبے کا
نیچے والا حصہ کھولتے ہوئے کہا' جس میں ٹھنڈی
سوکھی ہوئی دو روٹیاں رکھی تھیں۔
"اوہ!" سعد کو اس کا لنچ دیکھ کر خیال آیا۔ وہ سب لنچ
بریک میں سب وے' فینلوز' کابر کٹیل یا پزا ہٹ
جانے کے عادی تھے۔ جا نہیں سکتے تھے تو کھانا ڈیلیور
کروا لیتے تھے اور ایسے میں بہت سوں کا بچا ہوا یہاں
کے گیٹ کیپر' چپڑاسی اور صفائی کرنے والوں کے پیٹ

میں جاتا تھا' سب اچھا اور خوب کھاتے تھے۔ ایسے میں **سمیعہ** کا یہ گھریلو سا لنچ باکس اور عاجزانہ کھانا بہت مختلف لگ رہا تھا۔

"اس پر کون سا محاورہ فٹ بیٹھتا ہے۔" اس نے یاد کرنے کی ناکام کوشش کی مگر اسے یاد نہیں آیا۔

"کھاؤ گے؟" **سمیعہ** نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسے دعوت دی۔ سعد نے ایک نظر آلو کے سالن پر ڈالی جس پر ٹھنڈا ہو جانے کی وجہ سے گھی کی ہلکی سی تہہ جم گئی تھی اور وہ ٹھنڈی روٹیاں جن پر کالی چتیاں تھیں۔

"شکریہ' پلیز تم کھاؤ۔" اس کا جسم و ذہن جھرجھری کھانے ہی لگا تھا مگر اس نے خود کو قابو میں کرلیا۔

"اچھا!" اس نے سادگی سے کہا اور ٹھنڈی روٹی کے چھوٹے لقمے توڑ کر سالن سے لگا کر کھانے لگی۔

"میں تمہیں The princess and frog (شہزادی اور مینڈک) کی کہانی سنانا چاہ رہا تھا۔" سعد صبح والے واقعے کی تلافی کرنا چاہ رہا تھا۔

"ہاں سناؤ۔" اس نے بدستور کھانے کی طرف دھیان رکھتے ہوئے کہا۔

وہ اسے کہانی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی سناتا رہا اور وہ کھانے میں مصروف سنتی رہی۔ اس کی کہانی **سمیعہ** کے کھانے کے ساتھ ختم ہوئی۔ دونوں روٹیاں کھانے کے بعد اس نے میز پر دھرے ٹشو پیپرز کے ڈبے سے ایک ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ صاف کیے اور دوسرے سے آنکھیں۔

"مرچیں بہت تھیں۔" اس نے سعد کو بتایا۔

"اور کھا تو ایسے رہی تھی جیسے بہت مزے کا کھانا ہو۔" سعد کو حیرت ہوئی۔ وہ سوں سوں کرتی کاغذ کے گلاس میں واٹر ڈسپنسر سے پانی بھر لائی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ پنسل پکڑ کر سامنے رکھے کاغذ پر کچھ کام کر رہی تھی۔

"مینڈک تو ایسا ہونا چاہیے۔" پندرہ منٹ کے بعد اس نے وہ کاغذ سعد کے سامنے رکھا۔ ایک بے مثال تتلی کا خاکہ اس کے سامنے تھا۔ سعد حیرت زدہ رہ گیا۔



"اماں! تمہاری سرکس کے لیے نکلی ہے۔ یہ چابی دے گئی ہے دروازے کی۔"

گھر کے سامنے پہنچنے پر دروازے کو تالا لگا دیکھ کر **سمیعہ** کا سر چکرانے ہی لگا تھا کہ سامنے گھر کی کھڑکی کھول کر خالہ شمیم نے اسے سر نکال کر اسے بتایا تھا۔

"لکی والوں کا ہے یا پتہ نہیں **قازقستانی** والوں کا' یہ مجھے نہیں معلوم" خالہ شمیم نے اپنے تمباکو کے کھائے دانت نکوستے ہوئے بتایا۔

"لکی ہو یا ان لکی' **قازقستانی** ہو یا جاپانی' کیا فرق پڑتا ہے۔ رزق آیا ہے یہ کہنا چاہیے۔"

سمیعہ نے گہرا سانس لیا اور تالا کھولتے ہوئے اس عمارت پر نظر ڈالی جو کئی منزلہ' شکستہ اور قریب الخاتمہ تھی' اس تنگ گلی کی اکثر عمارتیں ایسی ہی تھیں' بلند و بالا' تنگ و تاریک چھوٹے چھوٹے کئی مکانوں اور سینکڑوں نفوس کو خود میں سمائے ہوئے۔ یہ علاقے' یہ گلیاں' یہ بے شمار مکان اور ان میں بسنے والے ہزاروں نفوس کیا مینڈک دنیا کا حصہ کہلا سکتے ہیں۔" اس نے سوچا۔

"ایک ایک کمرے کا مکان اور رہنے والے بیس بیس' اوہ خدا میں جہاں سے یہاں آتی ہوں اور یہاں سے جہاں جاتی ہوں۔ وہ تصویر کے دو رخ کیوں نظر آتے ہیں' جیسے کسی نے جادو کا ڈنڈا گھما کر منظر بدل دیا ہو۔"

اس نے دروازہ کھولا اور نیم تاریک کوٹھری نما کمرے میں داخل ہوئی۔ اتفاق سے بجلی گئی ہوئی نہیں تھی۔ بٹن دبانے پر ساتھ کا زرد بلب روشن ہو گیا اور کمرے کا قدیم سا منظر واضح ہوا' دونوں چارپائیوں کے بستر اسی طرح پُرشکن تھے جیسے وہ صبح چھوڑ کر گئی تھی۔ انگیٹھی پر رکھی چیزیں بے ترتیب تھیں۔ واحد کرسی پر بلیچ کریم کی شیشی کھلی پڑی تھی اور اس کے ساتھ

اس نے والی پلاسٹک کی چھوٹی سی پلیٹ نماشیٹ پر ادھ بچی کولڈ کریم پڑی سوکھ رہی تھی۔ اس کے دھبے کرسی پر جا بجا لگے تھے۔ چولہے پر چائے کی دیگچی ویسے ہی دھری تھی جس میں ابلی پتی سوکھ رہی تھی چائے کے کپ ویسے ہی جھوٹے تھے۔ ایک دیگچی میں نیم گرم پانی رکھا تھا "ہیلینا" اس پانی سے چہرے کو بھاپ دی گئی ہو گی اس کے قریب ہی چھوٹا میلا تولیہ رکھا تھا۔

"اوہ ماں!" سمیعہ نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ "تیرے خلیفے نے تجھے سلیقہ 'سبھاؤ نہیں سکھایا بس 'مگر وہ بھی کیسے سکھاتا۔" اس نے سوچا۔

"یہ پرفارمنگ آرٹ کا حصہ نہیں ہیں نا' یہ تو الٹی جرثومے ہیں جس میں ہوں وہ مشکل میں 'جس میں نہ ہوں وہ آسانی میں۔"

اس نے اکتائے ہوئے انداز میں بکھری چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔ سستی اور عام سی لپ اسٹکس اور میک اپ کٹ بغیر ڈھکن کے چارپائی کے نیچے لڑھک رہی تھی۔ سمیعہ نے تصور میں لاجونتی تو تنگی کی شہزادی کا چہرہ دیکھا لال' نیلے 'سنہرے رنگوں سے سجا 'شوخ بھڑکیلے چست لباس میں جکڑا جسم 'لال یا سنہرے بند جوتوں میں بند پیر اور بڑا سا سرخ یا سنہرا فولڈر بیگ' پیشانی پر بلیچ کیے ہوئے بالوں کے گچھے 'کانوں اور گلے میں سرخ سنہرے موتیوں سے مزین بندے اور ہار۔

"اماں سے زیادہ تو وہ تاروں 'ڈنڈوں اور ہاتھوں پر تھرکتی پتلیاں ہی ڈیسنٹ لگتی ہیں۔"

اس نے جلے دل سے سوچا۔ ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد وہ کمرے کو کسی نسبتاً" قابل قبول شکل دینے میں کامیاب ہوئی تھی۔ آٹے کے ٹین سے بچا کھچا آٹا لے کر گوندھنے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک روٹی پکائی اور آدھے بچے ملک پیک کے دودھ سے ایک پیالی چائے بنائی۔

"ایک سچے آرٹسٹ کا دکھ۔"

اس نے روٹی چائے میں ڈبو کر کھاتے ہوئے سوچا۔ دھواں زدہ دیواریں' زرد روشنی' ناکافی سامان' سوکھی روٹی اور کالی چائے۔ کٹھ پتلی گری کی تاریخ میں جب میرے روشن نام کا ذکر ہو گا تو میرے اولین دنوں کی پس ماندگی کا تذکرہ بھی ضرور کیا جائے گا۔ ایک ایسی کٹھ پتلی گر' جسے کٹھ پتلیاں بنانے کے علاوہ کہانی لکھنے' ترجمہ کرنے' ہدایات دینے' لائٹ افیکٹس' اسٹیج بیک گراؤنڈ اور ڈائیلاگ ڈیلیوری میں بھی مہارت حاصل تھی' مگر اسے مناسب موقع نہیں ملا' وہ پتلیاں بنائے' اپنی غربت سے لڑتے' مشقت کرتے' خون تھوکتی مر گئی۔"

اس کی سوچیں کہاں سے کہاں چلی گئیں۔

"اوہ!" پھر اسے یاد آیا۔ "اب تو خون تھوکنے والی بیماری ان نہیں ہے' آج کے زمانے میں آرٹسٹ گمنامی میں کہ نامعلوم بیماری سے مرگئی ہی لکھا جائے گا۔" اس نے فیصلہ کیا۔

"اور میرے خاندانی پس منظر کے بارے میں کیا لکھا جائے گا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"خاندان ہے کون سا' سوائے اماں کے۔" اسے دل میں چبھن سی محسوس ہوئی۔

اسے اپنے باپ کے بارے میں صرف اتنا پتا تھا کہ وہ بھی خلیفہ بشیر کے فن کدے میں میک اپ آرٹسٹ تھا۔

"ذات کا نائی تھا' پہلے فروق آباد (فاروق آباد) کے کسی فٹ پاتھ پر میز شیشہ جوڑے لوگوں کی حجامتیں بناتا تھا۔"

اماں نے اسے کئی بار بتایا تھا۔

"پھر لہور (لاہور) آگیا تو خلیفے بشیر کی کھولی میں رہنے لگا' جب خلیفے کو پتہ چلا کہ حجامتیں بنا سکتا ہے تو اسے میک اپ کا سامان بھی لا دیا اور ابا تیرا بن گیا رحیم میک اپ والا۔"

اماں کے لہجے میں نجانے کیوں ابا کے لیے حقارت ہی ہوتی تھی۔

"وہ تو تھا نائی اور اماں تم.... تم کیا تھیں؟"
سمیعہ کا کئی مرتبہ دل چاہتا کہ اماں سے پوچھے۔
"تمہارا خاندان، ماں، باپ، بہن بھائی؟" مگر وہ کبھی نہ پوچھ پائی۔
اسے یقین سا تھا کہ اماں کبھی بھی سچ نہیں بتائے گی۔ کبھی اسے وہم گزرتا کہ اس کے پوچھنے پر اگر اماں نے ترنگ میں آکر سچ بتا بھی دیا تو اس سچ میں کچھ ایسی تلخی ہو گی جس کو سن کر اس کی روح تک کڑوی ہو جائے گی۔
"گن گن کے نوٹ، نوٹ گن گن کے بھجواتا تھا تیرا باپ فروق آباد اپنے ابے کو، پر وہاں سے کبھی کوئی خبر نہ آئی کہ مل گیا ہے روپیہ، پھر ایک دن گیا ملنے۔" اماں زیر لب مسکرا کر بتاتی۔ "وہاں جا کر پتہ چلا ابا تو دو سالوں کا مر گیا ہوا تھا، نوٹ سارے ڈاکیا اپنے جھوٹے دستخط ڈال کر ہڑپ کر جاتا تھا، بے چارہ روتا دھوتا واپس آ گیا۔ اپنے ابے کے علاوہ اس کا کوئی تھا ہی نہیں۔ اماں تو اس کی کبھی کی حق (مر) ہو چکی تھی، نہ کوئی بہن نہ بھائی نہ کوئی آگا نہ پیچھا، بس پھر لگ کے یہاں کرتا رہا میک اپ، بڑی ڈشک نکال کر (بج بن کر) نکلتے تھے خلیفے کے تھیٹر کے فنکار۔ اسٹیج پر بادشاہ اکبر بنا تھا (حال کے ایک معروف سینئر آرٹسٹ کا نام لے کر) ایک ڈرامے میں۔ واہ واہ کیا پوشاک تھی اطلس، کم خاب (کمخواب) کی، زری کا پاجامہ، نیچے باٹے (باٹا) کے بوٹ، تیرے ابے نے اسے سچ مچ کا بادشاہ بنا دیا تھا۔"
"بادشاہ اکبر باٹا کے بوٹ پہنتا تھا۔" سمیعہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔
"کیا ڈائریکٹر تھا خلیفہ بشیر، کیا بات تھی اس کی۔"
"باٹے کے نہیں تو سروس کے ہوں گے۔" اماں اس کے ہنسنے کی وجہ سمجھے بغیر صفائی دیتی۔ "خالص چمڑے کے تھے بند بوٹ، سر پر گتے کا تاج سنہری پنی سے اسے ڈیک ریٹ (ڈیکوریٹ) کیا گیا تھا، سوئے بازار سے موتی اور نگ منگائے تھے خلیفے نے اسے ڈیک ریٹ (سجانے) کرنے کے لیے۔"
سمیعہ اس بادشاہ اکبر (جو کوئی بھی وہ تھا) کا با آسانی تصور کر سکتی تھی۔ "تیرے ابے نے سنہری بال رنگے تھے اس کے۔ کالی مونچھیں، گلے میں موتیوں کے ہار، انگلیوں میں نگ جڑی انگوٹھیاں، جب وہ زور سے بولتا .... "دیکھو!" اماں رعب دار آواز میں بولتی تو مجمع لرز جاتا تھا سانس لینا بھول جاتا تھا پتہ تو عوام کو تب چلتا جب اکبر بادشاہ مر کے نیچے گر جاتا کہ ڈرامہ ختم ہو گیا پھر وہ تالیاں پٹتی جاتیں، وہ تالیاں، وہ سیٹیاں کہ اللہ کی پناہ ہاؤس فل پروگرام کیے خلیفے نے بھائی لاہوری اور مصری شاہ میں۔"
"اوہو ہو ہو۔" سمیعہ متاثر نظر آنے کی کوشش کرتی اور اماں خوش ہو جاتی گویا اس نے آغا حشر تھیٹر کے کسی ڈرامے کی روئیداد سنائی ہو۔
"بھائی، لوہاری سے ہی اٹھے ہیں یہ سب جنے۔" پھر وہ سمیعہ کو خبر دیتی۔
"محمد رفیع بھی ادھر کا ہی رہنے والا تھا۔" اس نے انکشاف کیا۔
"اسے بھی خلیفے بشیر نے ہی فنکار بنایا ہو گا۔" سمیعہ ناک سکوڑتی۔
"آئے ہائے، خلیفہ تو کاکا ہو گا ابھی جب محمد رفیع گلوکار بن کر یہاں سے اڑ بھی گیا۔ .... خلیفہ تو ہمیں کہانیاں سناتا تھا، ادھے شنکر گروپ کی، پرتھوی تھیٹر کی، انڈین پیپل تھیٹر کی۔ واہ واہ کیا زمانے تھے تھیٹر کا کام صاف ستھرا تھا بڑا، اب جو گڈوی والیاں، پیڑی واسیں ہیں، ساری آ گئیں تھیٹر میں کام کرنے۔ گند ڈال دیا تھیٹر میں۔"
اماں ماضی سے حال میں واپس آکر غصے میں کہتی۔
"اور تم کون اماں؟" وہ ایک سوال ایسے موقعوں پر بھی سمیعہ کے اندر سر اٹھانے لگتا۔
"ٹبی واس، بکھی واس، گڈوی والی.... نوٹنکی کی شہزادی، لاجونتی .... اس کے گرد اس سوال کے جواب کی بازگشت گردش کرنے لگتی۔
"کچھ بھی ہو اماں فن کی تاریخ کا ایک حصہ ہے، وہ

...س پر اگر کسی کہانی کے بھوت کے ... جائے تو اس کی شخصیت کو لیپ پوت ... کے میوزیم کی دیوار پر یوں سجا دے ... کے میوزیم کی دیوار پر سجا جھنگ کا پنکھا۔"
سمیعہ نے اپنی سوچوں کی دنیا سے نکلنے سے پہلے ... بات یہ سوچی تھی۔



نوشیرواں کے ساتھ "شہزادی اور مینڈک" کے ... تبادلہ خیال کرتے ہوئے سب ٹیم ممبرز اپنی اپنی ... پیش کر رہے تھے۔ یہ پتلی تماشا "پپٹ ورکشاپ" ... کے ذہین ترین دماغوں کی ٹیم تھی جس کا ہر ممبر ... سرے سے الگ تکنیکی مہارت کا حامل اور اپنے ... کام کا اعلا سند یافتہ تھا۔ مستند اور ماہر ارکان کی اس ٹیم کا ہر ممبر سوسائٹی کے جدید، روشن خیال اور امیر ترین طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

کہانی کے بنیادی خیال سے لے کر، مکالمہ نویسی، مکالمہ بازی، ہدایات، روشنیاں صوتی تاثرات، کٹھ پتلیوں کی بناوٹ، لمحہ لمحہ حرکات و سکنات باریک ترین پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ تمام نکات لکھے کے گرافکس ترتیب دیے گئے اور کام شروع کرنے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ یہ ایک طویل میٹنگ تھی۔

"اور اگر اورنج جوس کے ساتھ تم کو کچھ اور چاہیے لطف اندوز ہونے کے لیے تو میں کچھ پیش کروں؟" میٹنگ کے بعد نوشیرواں کے ساتھ اکیلے بیٹھے ہوئے سعد نے نوشیرواں سے سوال کیا۔

"یقیناً۔" نوشیرواں نے اپنی فرنچ کٹ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت مسرور اور شاداں نظر آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے کھاتے میں ایک اور کامیاب پتلی ڈرامہ آتے دیکھ رہی تھیں۔

سعد نے سمیعہ کا بنایا مینڈک کی پتلی کا خاکہ اس کے سامنے رکھا۔

"اوہ، ونڈر فل، زبردست!" نوشیرواں کا اورنج جوس حلق میں اٹک گیا جسے بمشکل اس نے حلق سے نیچے اتارنے کے بعد کہا۔

"میں جانتا ہوں، یہ زبردست ہے۔" سعد نے اسے بتایا "مگر کیا یہ تمہارے معیار پر پورا اترتا ہے؟"

"کس کا آئیڈیا ہے، تمہارا؟" نوشیرواں نے عینک آنکھوں پر جما کر غور سے خاکے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنی رائے دو تفصیل سے۔" سعد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سادہ ترین لفظوں میں اسے شان دار کہا جا سکتا ہے۔" نوشیرواں نے خاکے والے کاغذ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "تم بس کام شروع کر دو اس پر۔"

"اور اگر میں ایسا ہی شان دار کام باقی کرداروں پر بھی کر دوں تو...... تمہاری کری ایٹو آرٹ ٹیم ناراض تو نہیں ہو جائے گی؟" سعد نے اسے دیکھتے ہوئے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

"ہوں۔" نوشیرواں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غور کیا "کیا تم اپنے آئیڈیاز کو ٹیم ورک میں تبدیل نہیں کر سکتے، ممکن ہے کہ اس طرح کام کرنے سے تمہیں مزید آئیڈیاز ملیں۔"

"مثلاً "کس سے؟" سعد کو نوشیرواں کے جواب کا علم تھا مگر پھر بھی اس نے پوچھا۔

"مثلاً "انجیلا" سے، شہزاد سے اور فیصل سے، شاید تہمینہ سے بھی نوشیرواں کے لیے اس کے تخلیق کاروں کی ٹیم بہت اہم تھی اور وہ ان پر ناز بھی کرتا تھا۔

"کیا تمہارے اسپانسرز، اس بات پر اعتراض کریں گے کہ تم نے کس سے کیا کام لیا؟" سعد کو اپنے اس سوال کا جواب بھی معلوم تھا مگر اس نے پوچھا۔

"نہیں، یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔"

"پھر اپنی ٹیم کو کوئی اور کام سونپ دو کچھ عرصہ کے لیے اور مجھے اس کہانی پر کام کرنے دو۔" سعد نے اس کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یار..... ابھی یہ سارا قصہ ڈسکس ہوا ہے۔"
نوشیرواں متذبذب نظر آرہا تھا۔

"او کے۔ کوئی بات نہیں جیسے ڈسکس ہوا ہے ویسے ہی کام کر لیتے ہیں' یہ تو یونہی ایک آئیڈیا تھا۔" سعد نے اس کے سامنے پڑا کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"رکو۔" نوشیرواں نے اس سے کاغذ واپس لے لیا۔ "مجھے ذرا سوچنے دو۔"

"ہاں' ضرور سوچو' کچھ جلدی نہیں۔" سعد نے اپنا سیل فون میز سے اٹھاتے ہوئے کہا "دوبارہ سہ بارہ بھی سوچنا پڑے تو کوئی مسئلہ نہیں۔"

☼ ☼ ☼

"میلوں کا اور سرکسوں کا زمانہ ہی اچھا ہوتا ہے' کیا کہتی ہو۔" اماں نے بیسن کی روٹی بیل کر توے پر ڈالتے ہوئے کہا "پیٹ بھر کر کھاتے تو ہیں ان دنوں میں۔"

سمیعہ بے دھیانی سے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس کی پوری توجہ توے پر پڑی روٹی پر تھی' جس میں پیاز' ہری مرچیں' ثابت دھنیا' کٹی ہوئی سرخ مرچیں اپنی بہار دکھاتی نظر آرہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اس کو بھوک کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

وہ چھٹی کا دن تھا' اس نے جی جان سے اس چھوٹے سے کمرے کی صفائی کی تھی کپڑے دھوئے تھے اور نہائی تھی' جب وہ کاموں سے فارغ ہوئی تو بہت دن کی چلچلاتی دھوپ' گرمی اور حبس کے بعد اچانک آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا اور پل کے پل میں مینہ برسنے لگا تھا۔ اگرچہ یہ موسم اس قسم کی مخدوش عمارتوں کے لیے انتہائی خطرناک تھا جس میں وہ رہتی تھیں' مگر موسم کی تبدیلی نے اس کا موڈ بہت خوشگوار کر دیا تھا۔ اس پر اماں کو بھی بیسنی روٹیوں اور پودینے کی چٹنی کا خیال آگیا تھا اور اب توے پر پکتی روٹی کی خوشبو نے **سمیعہ** کے سارے حواسوں پر غلبہ پا لیا تھا۔

"خلیفہ کہتا تھا پتر! جونتی! فنکار کبھی بھوکا نہیں مرتا۔"
اماں کہہ رہی تھی۔

"فنکار ہر دور میں بھوکا مرتا رہا' مگر اب یہ دور ہے ایک مضبوط میڈیا کا۔" **سمیعہ** کو بے دھیانی میں نے خلیفہ بشیر کے سنہری قول کے جواب میں دور حاضر کے کسی دانشور کا قول یاد آگیا۔

"وہ کہتا تھا۔ فنکار کے لیے کام کی کمی نہیں' بس اپنا اسٹینڈر (سٹینڈرڈ) نہ اونچا کرے آدمی۔" اماں نے روٹی پر چٹنی رکھ کر پلیٹ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"پیٹ کی بھوک' ہر فن پر' ہر اسٹینڈرڈ پہ بھاری۔" **سمیعہ** نے بے تابی سے گرم روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے اپنے تئیں ایک سنہری بات سوچی۔

"ابھی بھی میری مانگ ہے' استاد کافو کہہ رہا تھا' بڑے فنکار آئے بڑی دھومیں مچائیں پر نہ ہوا کوئی تیرے جیسا' تو تو شہزادی ہے۔ سدا بہار نوٹنکی کی شہزادی۔"

"تھیٹر..... سنجیدہ تھیٹر کی دنیا میں آئے روز نت نئی جہت کا آغاز ہوتا رہتا ہے۔ تھیٹر سے وابستہ لوگ اپنے اپنے میدان کے ماہر اور مشاق' مختلف تھیٹر گروپس اور آرٹ اکیڈمیز نے اپنی شناخت اور پہچان کے لیے ایسے ٹائیٹل نیم' تخلیق کیے ہیں جن کو سن کر ہی کلاسیکیت کا احساس ہوتا ہے' اجوکا' این سی اے نوٹنکی' چترکار' ڈنکا آرٹس ایسے نام جیسے ماضی سے "پیوستگی کا احساس دیتے ہیں۔"

چند دن پہلے ہی **سمیعہ** نے ایک اردو روزنامے میں تھیٹر پر لکھا گیا ایک کالم پڑھا تھا۔ این سی اے نوٹنکی' اسے یہ نام پڑھ کر اماں اور خلیفہ بشیر کا خیال آیا تھا۔

"کیا اماں اور اس کے جیسے دوسرے لوگ تاریخ کی باقیات کہلائے جانے والے ہیں۔" اس نے سوچا تھا۔

"اوہ!" اماں نے دوسری روٹی اس کی پلیٹ میں رکھی تو وہ چونک گئی۔ "اس سے پہلے کہ میں اپنی سوچوں کی دنیا کے پاتال میں اتر جاؤں' مجھے اوپر ہی سے واپس آجانا چاہیے' تاکہ میں اس موسم اور اس مزے دار کھانے سے لطف اندوز ہو سکوں۔" اس نے سوچا۔

"اماں سرکس کی کوئین نہ ہوتی تو مہینے کی آخری

ہوں میں اس عیاشی کا متحمل کوئی کیسے ہو سکتا
"کھانا کھانے کے بعد اس نے چپکے سے خود سے

"بھوکی بھوک کے آگے سارے معیار ہیچ۔"
اس نے اس دن کی دوسری سنہری بات سوچی۔



"مینڈک کی آنکھیں معمول سے بڑی ہوتی ہیں کیونکہ سارے تاثرات روشنیوں کے ذریعے آنکھوں ہی سے دیے جاتے ہیں۔"

زور و شور سے جاری کام کے دوران سمیعہ اس طرح کے لقمے اکثر دینے کی عادی تھی۔ کبھی کبھار سعد کو الجھن ہوتی' یہ ایسی بات وقت پر کیوں نہیں کرتی۔ وہ مسکرا کر اپنی الجھن ظاہر کیے بغیر وہ اس کی بات پر من و عن عمل ضرور کرتا' کیونکہ وہ سمیعہ کے اندر چھپی ایک ایسی ہنرکار کو دریافت کر چکا تھا جو ماہر فن تھی مگر وہ ابھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کچھ جانتی تھی اور کیا کر سکتی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد نوشیرواں نے
Princess and the frog
(شہزادی اور مینڈک) کا منصوبہ مکمل طور پر سعد کے حوالے کر دیا تھا اور اپنی دوسری ٹیم کو کسی اور پلیٹ پر لگا دیا تھا۔ اس چیز نے بہت سے ساتھیوں کے موڈ خراب کیے تھے' مگر خود سعد کو بھی اپنا نام بنانے کا اس سے سنہری موقع کوئی دوسرا نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تم غلط گھوڑے پر شرط لگا رہے ہو۔" انجیلا نے اپنے دل کی تلخی کا اظہار اس کے سامنے دو تین بار کیا تھا۔

"میں' یا نوشیرواں؟" سعد نے اسے غور سے دیکھا تھا۔

"شاید تم دونوں۔" اس نے اپنی شعلہ بار نظریں ادھر ادھر گھماتے ہوئے کہا تھا۔ "اٹ ول بی وڈ ہیل ان دی اینڈ۔ آخر میں جا کر یہ تجربہ جہنم ثابت ہوگا۔"

"لیٹ اٹ بی (ہونے دو)" سعد نے بے نیازی سے

کہا۔ ”تباہی کا خوف تجربے کرنے سے روک دے تو انسان کی ترقی کا عمل رک جائے بالکل۔“
”غلط گھوڑے کا انتخاب۔“ انجیلا نے کہنا چاہا۔
"It can come out as a dark horse too"
سعد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرواتے ہوئے کہا۔
”ٹھنڈی ہو جاؤ انجیلا! فنکار کا فن ظاہر ہونے دو۔“
”دیکھیں گے۔“ اس نے شانوں تک جھولتے بال جھٹکے اور اٹھ کر چلی گئی۔
سعد جانتا تھا کہ اس کے ساتھی اس سے ناراض تھے، مگر پانچ سال کام کرنے کے بعد جو اس نے ایک ٹیم ممبر کی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتا تھا جو خالص اس کے اپنے نام کے کھاتے میں جائے۔ اس نے سمیعہ رحیم کے اندر چھپے جوہر کو تلاش کر لیا تھا اور وہ اسے اتنی خاموشی سے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا کہ کسی کو کیا خود سمیعہ رحیم کو بھی علم نہ ہو کہ اصل کام وہ کر رہی تھی۔ ابھی تک اس نے جو اندازہ لگایا تھا۔ اس کے مطابق سمیعہ سیع ہال کی ایک میز پر بیٹھ کر کنسٹرکشن میٹریل کی کتر بیونت کر کے پتلیاں بنانے سے اٹھ کر پتلی تماشے کی مکمل تخلیقات کا کام کر رہی تھی۔
اسے غالباً ”ڈرامے کی تخلیق کے دوسرے شعبوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا شوق تھا اور وہ اسی میں کھو گئی تھی۔ پتلیاں بنانے، اردو مکالمے لکھنے، ادائیگی، حرکات اور رنگوں روشنیوں کے استعمال ہر ہر مرحلے میں اس نے اپنی رائے دی تھی، اور اس کی رائے مستند معلوم ہوتی تھی۔
”یار! تم نے پہلے کہیں کسی تھیٹر میں یا پپٹ ورکشاپ میں کام کیا ہے ضرور۔“ کبھی کبھی کام کے دوران سعد چونک کر کہتا۔
”کہیں بھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔“ وہ سادگی سے جواب دیتی۔ ”مجھے تو صرف پتلیوں کے بالوں، آنکھوں چہروں، ہاتھوں اور جسم کی کٹائی سلائی کے سوا کچھ نہیں آتا۔“
”پھر تم باقی شعبوں کے بارے میں کیسے رائے دے لیتی ہو؟“ سعد حیرانی سے پوچھتا۔
”میری اتنی اوقات نہیں، مگر میں خیالوں میں اور تصورات میں اپنی بنائی پتلیوں کو مکالموں کے مطابق حرکت کرتے دیکھتی ہوں۔ لسپاٹ لائٹ کے نیچے کیسے اور پیچھے کیسے، انہیں زیادہ سے زیادہ حقیقی رکھنا ہے۔ مکالموں کی ادائیگی کے دوران ان کے منہ کے زاویے کیسے ہونے چاہئیں میں اس پر بھی اکثر سوچتی ہوں۔ میں یہاں یونہی آ گئی تھی جیسے انسان اپنی قسمت کی گھڑی کی ٹک ٹک سنتا بھٹکتا پھرتا ہے، میری گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز نوشیرواں کو دیکھ کر تیز ہو گئی اور میں نے سوچا کہ یہاں کام کرنے کے پیسے شاید زیادہ ملتے ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے یہاں سے بھی یونہی لوٹا دیا جائے گا، مگر نوشیرواں نے مجھے ”ضرورت مند“ قرار دے کر مجھ پر احسان کر دیا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ اس سادہ دکھنے والی پرسکون عمارت کے اندر مجھے فن کا ایک پورا جہان دیکھنے کو ملے گا۔ بس پھر یہاں آ کر اس ہال میں بیٹھ کر پتلیوں کا میٹریل کاٹتے بناتے مجھے اس فن سے پیار ہو گیا۔ میرے پاس کوئی ڈگری، کوئی سند اس فن سے متعلق نہیں ہے مگر اس پیار نے ہی مجھے سوچوں سوچوں میں ہر چیز سکھا دی۔“
”سکھا دی یا اس پر کمانڈ دے دی۔“
سعد مسکرایا، مگر اگلے ہی لمحے اس کو احساس ہوا کہ اسے سمیعہ کو یہ احساس نہیں دلانا کہ اس کے کام اور رائے میں مہارت ہے۔ وہ اس پروجیکٹ میں شامل کیے جانے کو سعد کا احسان مانتی تھی، اسے ایسا ہی ماننے رہنے دینا چاہیے۔



”مجھے کمپیوٹر چلانا آتا ہوتا تو میں بھی پہلے گرافکس کے ذریعے اپنے خیالات کو پیش کرتی۔“ سمیعہ نے کام کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔
”تیری تو ڈرائنگ ہی بہت اچھی ہے، تجھے کیا؟“

"... لی۔"

"یہ آہاں! تو ان باتوں کو نہیں سمجھے گی۔"

سمیعہ ... ہوئے لہجے میں کہا۔ "آج کل کام ... انداز بدل گئے ہیں۔ اب نہیں کوئی ... سمپس اور ونڈ ڈرائنگز کے چکر میں پڑتا۔"

... رل بالز اور گالف بالز کو علیحدہ علیحدہ ... میں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ کراس لنک اور ... کے کچھ ٹکڑے اس روز اپنے ساتھ ... لائی تھی۔ وہ چند ہتھ پتلیاں بنانا چاہ رہی تھی۔

"... ہی صحیح نہیں اس سے کیا کٹے گی یہ ... ۔" اماں نے اس کی بات ان سنی کرتے ... ہاتھ پر نظر ٹکائی۔

"... کیا ہوا اس کو؟" سمیعہ نے اپنے ہاتھ میں ... (Snips) کو ہونقوں کی طرح دیکھا۔

"... میری موٹی ہے، قینچی تیری چھوٹی ہے۔" ... لہراتے ہوئے کہا۔ "لا ادھر دے میں ... دکھاؤں تیرا بڈاوا (پتلی)" اماں نے ہاتھ ... ۔

... سلائی مشین سے نان اسٹک قینچی نکالی ... کے سامنے رکھی ڈرائنگ شیٹ کو پکڑ کر ... سامنے رکھا۔ آدھے گھنٹے کے کام کے بعد ... پتلی کے ٹکڑے کٹے پڑے تھے جسے سمیعہ ... اور ریمینڈک" کی کہانی میں اضافی کردار کے ... کے کہنے پر ڈالا تھا۔

"... یہ کام کیسے سمجھ میں آیا اماں؟" کچھ دیر گم ... کٹے ٹکڑوں کو دیکھتے رہنے کے بعد سمیعہ ... ۔

"... ڈول جلول کام ہے، ہم نے پتلیاں بنائی ہیں ... ہماری لوک کہانیوں پر پتلی تماشے کیے ہیں بی بی ... کی کتاب پر گا گا کر لوک داستانیں سنائی ہیں ... ہماری پتلیاں بڈاوے نہیں لگتی تھیں وہ ... کرتیں اپنی اپنی باری پر ساری بیت (شعر) ... لوگوں کو، ہم نے تو پتلیوں کے ساتھ کورد ... منظر بھی دکھائے لوگوں کو۔"

"وہ کیسے؟" سمیعہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"خلیفے بشیر نے اسٹریٹ تھیٹر پر بڑا کام کیا بے چارے نے۔" اماں کا من پسند موضوع شروع ہو گیا "یہ لاہور شہر تو چھوٹا تھا اس وقت ـــ یہ جو بیدیاں کی طرف سڑک جاتی ہے اور رائے ونڈ اور جلو موڑ کی طرف سب پنڈ تھے گاؤں۔" اماں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً "اپنے جملے میں لگا پنجابی کا ٹانکہ درست کیا۔

"ہم ہر جگہ جاتے تھے اپنی پتلیاں لے کر، ہم نے ہیر رانجھا بھی کیا اور سوہنی مہینوال بھی جب ٹکایا سوہنی کی بکھل (گود) چھوٹا سا مٹی کا گھڑا اور وہ آئی اسٹیج پر گلابی ساٹن کا لہنگا اپنے، گھنگھروؤں والا پراندا آگے ڈالے، بجلا لگا کے سرخی لگا کے تو کبھی نہ لگے کہ کٹھ پتلی ہے یہ لوگ دھاڑیں مار مار کے روتے تھے جب وہ ڈوب جاتی تھی گھڑا کچا نکلنے پر میں نے خود بیت گائے ہیں سوہنی کے۔"

عشق دی دشمن ہوئی بھابھو، کچا گھڑا رکھ سی
عشق کدے نہ مردا ظالم، بھانویں گھڑا مٹی ہو سی

اماں نے اسے گا کر سنانے کے بعد آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے۔

"کوئی قدر نہ پائی خلیفے بہشتی نے، پوری خلق کو ہنسایا اس نے، ڈرامے دکھائے، پتلی تماشے دکھائے، گانے دکھائے، پنڈال بھرے، تالیاں بجیں، سیٹیاں بجیں، پر وقت کے قالین کے ساتھ خلیفے کا نام بھی لپیٹا گیا۔" اماں سخت دکھی ہو گئی۔

"یہ بڈاوے بی بی! کچھ بھی نہیں ... کے تھیٹر کی پتلیوں کے سامنے، یہ جو سامان ہزاروں میں آتا ہے ان کو بنانے کا۔" اس نے ویلڈ ووڈ جیل کا ڈبا ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم نے تو شاہکار پتلیاں بنائیں کیل ڈبے جوڑ کر، ساٹن اور شیفون کر نکل کے کپڑے جوڑ کر ان کی پوشاکیں بنا کر، پر اصل کی مانند لگتی تھیں، دنیا ٹوٹ ٹوٹ پڑتی تھی ان تماشوں کو دیکھنے کے لیے۔"

"آج کا زمانہ بڑا فرق ہے اماں! مقابلہ ہے بڑا سخت' ٹرینڈ بدل گئے ہیں' اماں! آئے روز نت نئی چیزیں نکل رہی ہیں' نئے نئے اسٹائل' خلیفے بشیر کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب تو اس کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں۔ اس کے کام کے متعلق سنیں گے تو اکثر لوگ ہنسیں گے۔"

سالوں بعد جھلائی ہوئی سمیعہ کے لبوں پر وہ بات آ ہی گئی' جو وہ اماں سے کبھی نہیں کہنا چاہتی تھی۔

"سچا فنکار تھا' سچا استاد تھا خلیفہ' اس کا من سچا تھا اسی لیے اس کا فن بھی سچا تھا' اس نے دنیا کو فن سے آشنا کروایا' اس وقت جب دنیا کو فن سے کچھ واقفیت نہیں تھی۔" اماں نے اس کی بات پر شدید ردعمل ظاہر کیا' وہ سخت غصے میں آ گئی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے اماں! مگر اب کی دنیا اور اس وقت کی دنیا میں بہت فرق ہے۔ اب نہیں جانتا خلیفہ بشیر کو کوئی۔" سمیعہ نے اسے حقیقت سے روشناس کرانا چاہا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔" کچھ دیر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اماں نے شکست خوردہ آواز میں کہا "ٹھیک کہتی ہے تو' خلیفے کا زمانہ مک گیا' اب جھوٹ کا زمانہ ہے' نقل کا زمانہ ہے' اب سچے فنکار کی ناقدری کا زمانہ ہے' اب وہ اچھا فنکار ہے' جس کے تعلقات ہیں' شوشا ہے' جو انگریزی بول لیتا ہے اور ڈی مینڈ (ڈیمانڈ) پہچان لیتا ہے' ہاں آج کا فنکار بہت آگے ہے' آج کا زمانہ بدل گیا ہے۔"

وہ گویا خود کلامی میں مصروف تھی۔ وہ خود کو باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وقت بدل گیا تھا۔

سمیعہ کو اس کی بے بسی پر عجیب سی تکلیف ہوئی۔

"جب خلیفے کا وقت عروج پر تھا اماں! اس وقت بھی اعلا سنجیدہ تھیٹر موجود تھا' کمال احمد رضوی' نعیم طاہر کا تھیٹر' مگر تفریح کے ذرائع محدود تھے نا اس لیے لوگ بھاگ بھاگ کر خلیفے کی استادیوں کی طرف رخ کرتے تھے۔"

وہ اماں کو بتانا چاہتی تھی' مگر اس نے نہیں کہا۔

"لیکن یہ کمال فن ہے اماں! پھر اس نے کٹھ پتلی کے لیے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھایا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تجھے یہ کام آتا ہے' میں نے تو خود فٹ بال سینے کے بچے کھچے میٹریل پر کام کر کے یہ فن سیکھ لیا' پر تو تو مجھ سے کہیں آگے ہے اماں' تجھے ہر کام میں مہارت ہے' تو سچی فنکار ہے' بالکل سچی۔"

زندگی میں پہلی بار سمیعہ کو ادراک ہوا تھا کہ اس کی وہ ماں جس کے فن اور شوق کا وہ دل ہی دل میں مذاق اڑایا کرتی تھی' درحقیقت کس قدر ناقدری کا شکار تھی۔

☼ ☼ ☼

"زبردست!" تِلی تماشا پپٹ شو کے زیر اہتمام کھیل "شہزادی اور مینڈک" کے پہلے دن کے بعد ایک انگریزی اخبار کے آرٹ اینڈ کلچر کے صفحے پر اس کے بارے میں لیڈ آرٹیکل شائع ہوا تھا۔ یہ کھیل "پپٹ آرٹ فیسٹول ویک" میں پیش کیا گیا تھا اور اس کے ایک ایک تکنیکی پہلو پر تفصیل سے بات کی گئی تھی۔

"فیسٹول ویک کے اختتام پر اس کھیل کو اس سلسلے کا بہترین کھیل قرار دیا گیا تھا۔ نوشیرواں اور اس کی ٹیم کو خاص اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ اپنے اس کھیل پر بات کرتے ہوئے نوشیرواں نے سعد عثمان کی فنی صلاحیتوں کا خصوصی ذکر کیا تھا' وہ ایک باصلاحیت پروجیکٹ ڈائریکٹر کے طور پر سامنے آیا تھا۔

نوشیرواں نے اس کی تعریفوں کے خوب پل باندھے' کیونکہ وہ اپنے ورکشاپ کی پروجیکشن پر بہت خوش تھا۔ ہال میں بیٹھے سعد عثمان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

وہ جس سیڑھی پر قدم جما جما کر اوپر جانے کی کوشش کر رہا تھا' وہ سیڑھی اس سارے ہنگامے سے دور اسی شہر کے ایک تنگ اور گنجان محلے کے ایک تاریک اور چھوٹے سے مکان کے ساون کی مسلسل جھڑی سے بچ

...مانگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہمارے اندر پیدائشی صلاحیتیں ہیں بی بی!" سعد نے سمیعہ کو ایک روز بتایا تھا' وہ ان اضافی کرداروں کو ... سمیعہ کے ذہن کی تخلیق تھے اور جنہوں نے ... کی خوب صورتی میں اضافہ کیا تھا۔

"ہاں نہیں شاید ہوں۔" سمیعہ کا انداز اسی طرح ... ہمیشہ ہوتا تھا۔

"مجھے فن ورثے میں ملا ہے۔" اس کا دل کہہ رہا تھا وہ ان ورثے کا ذکر نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اس کی ... معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہم برادر گریم کی مزید اسٹوریز پر کام کریں' بہت مزا آئے گا' میں نوشیرواں سے بات کرنے والا ہوں اس سلسلے میں۔"

اس نے "شہزادی اور مینڈک" کے لیے بنائی جانے والی کٹھ پتلیوں کو سنوار کر اسٹور کے لیے محفوظ کرتی سمیعہ کی طرف دیکھا "کیا تم اس سلسلے پر کام کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"کون میں؟" سمیعہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' اس کے ہاتھ میں وہ بلا تھا جو اضافی کردار تھا اور جس کے مختلف حصے اماں نے کاٹے تھے۔

"یہ بہت حقیقی لگتا ہے۔" سعد نے بلے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم ہیر رانجھا' سوہنی مہینوال قسم کے ڈرامے کیوں نہیں کرتے؟" سمیعہ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"چھوڑو' اس کا زمانہ نہیں رہا اب' اب جہاں animated films چھا رہی ہیں اور موضوعات ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھیل بنائے جا رہے ہیں وہاں ان پرانی ہوئی داستانوں پر کون کام کرتا ہے۔" سعد نے بیزاری سے کہا۔

"ہاں۔ شاید ایسا ہی ہے۔" سمیعہ نے آخری بار کے بال اور اونی جسم کو برش سے درست کر کے گتے کے ڈبے میں پیک کرتے ہوئے کہا۔

"شاید نہیں یقیناً" ایسا ہی ہے" سعد نے اسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ "تم بتاؤ' پھر کرو گی کام کچھ نئے پروجیکٹس پر۔"

"مجھے اتنا تکنیکی کام آتا ہی نہیں۔" سمیعہ کی بے نیازی اور سادگی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ "پچھلے کھیل میں تو میں اپنے شوق میں ہی شامل ہوگئی تھی ورنہ مجھے تو نہیں پتا کہ تم لوگ کن کن پہلوؤں پر کام کرتے ہو۔"

"بہت ہی بے وقوف اور سادہ ہے یا پھر بن رہی ہے۔" سعد نے دل میں اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ "نہیں آتا تو سیکھ لو گی۔ کام تو کرو۔" اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"کیا کام کروں گی میں' میں تو صرف کٹھ پتلیاں ہی بنا سکتی ہوں۔ وہ جیسے بتاؤ گے اور جو مجھے بنانے کو کہو گے' بنادوں گی۔"

"تم نے جو شہزادی کے ڈائیلاگز ادا کیے تھے۔" وہ بھولا تو نہیں کوئی۔

سعد نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ ساتھ ساتھ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ سمیعہ کو اس کے کام کی اہمیت کا احساس نہ ہو۔

"وہ تو بس اتفاق سے ہوگیا' ورنہ میری آواز کی کوالٹی اچھی نہیں ہے۔" سمیعہ نے اسی سادگی سے جواب دیا تھا۔

"میری عمر میراثیوں کے ٹپے سنتے گزری ہے' میری آواز کہاں سے اچھی ہوگئی بھئی۔" اس نے دل میں سوچا تھا۔

"میری خواہش ہے کہ تم کام سیکھو۔" سعد نے بے بسی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میں کام سیکھ کر کیا کروں گی۔" سمیعہ کے ہونٹوں پر بھی ایک بے بس سی مسکراہٹ تھی "مجھے کام سیکھ لینے سے کوئی ترقی تو ملے گی نہیں' میں ضرورت مندوں کی کٹیگری میں کام کررہی ہوں یہاں' نوشیرواں کو اندازہ ہے کہ کم از کم کٹھ پتلی بنانے

میں مجھے مہارت ہے مگر میرے کام پر اس لیے بات نہیں کی جاتی کہ اس کی اہمیت نہیں ہے' میں جس بھاؤ کام کرنے میں مسکینی کے ساتھ خوش ہوں اُس کے دام اور وقعت بڑھانے کی انہیں کیا ضرورت ہے۔ اس لیے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کام کیوں سیکھوں۔

"کیا تمہیں اوپر جانے کا 'ناموری کا شوق نہیں؟" سعد نے اسے لالچ دینے کی کوشش کی۔

"شوق کسے نہیں ہوتا۔" اس نے لب بھینچے "مگر مجھے علم ہے کہ مجھے یہاں ایسا کرنے نہیں دیا جائے گا۔ میں اس ملک کے ایسے فنکاروں کی تاریخ سے واقف ہوں جو ماہر تھے مگر گمنام رہے۔ اس لیے کہ انہیں شہرت کی سیڑھی پر قدم رکھنے ہی نہیں دیا گیا۔"

"بہت مایوسی کا شکار ہو تم۔" سعد نے تاسف سے کہا۔

"مایوسی کا شکار نہیں حقیقت آشنا۔"

"جو بھی ہے۔" سعد بچوں کی طرح ضد کرنے لگا "میرا خیال تھا کہ تم میری بات مان لوگی۔"

"تم واحد شخص ہو جو آدمیوں کے اس سیٹ اپ میں انسان دکھتے ہو۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ "تم مجھ سے بات کر لیتے ہو' مجھے کام میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہو۔ مجھے کام سمجھاتے ہو۔ تم کامیاب رہو گے۔"

"تو پھر میرے ساتھ کام کرونا۔" سعد نے ایک بار پھر کوشش کی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مسکرائی اور سعد کے سر سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔



گاڈ فادر ڈیتھ (خدائی خدمت گار کی موت) بریمین کے موسیقار' بادام کا درخت' ستاروں کی دولت' ایک کے بعد ایک سعد نے پتلی تماشا پپٹ ورکشاپ کے نام کے تحت کئی کھیل بنائے۔ وہ اپنے ان شوز کو لے کر اندرون ملک کئی بڑے شہروں میں گیا اور اس نے اپنی ایک الگ شناخت بنالی تھی۔ اس سارے کام میں سمیعہ نے اس کے ساتھ جان توڑ محنت کی تھی' مگر سعد نے اسے ایک بار بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ اس کامیابی میں اس کا کتنا ہاتھ تھا۔ جب پہلی بار وہ اپنے کھیل لے کر بیرون ملک گیا' اس نے پتلی تماشا پپٹ ورکشاپ سے اپنا تعلق مستقل ختم کر دیا۔

اب وہ اس میدان میں اپنے نام سے قدم جمانا چاہتا تھا اپنی علیحدہ ورکشاپ' اپنا علیحدہ گروپ' اپنی الگ شناخت۔ وہ ان لوگوں اور معاونین کو وقت کی دھول میں اٹا چھوڑ کر آگے نکلنا چاہتا تھا۔



"میں نہایت افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں سمیعہ! کہ "پتلی تماشا" میں یہ تمہارا آخری دن ہے!" سمیعہ نے نوشیرواں کے اسسٹنٹ وقار احمد کی بات کو تحمل سے سنا اور حلق سے نیچے اتار لیا۔

"پرانے ساتھیوں کے ایک ایک کر کے چلے جانے کی وجہ سے گروپ کو نئے پروجیکٹس پر کام کرنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ اس لیے ہم اپنا اسٹاف بھی کم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں' تمہارے ساتھ اچھا وقت گزرا۔"

یہ نپے تلے الفاظ انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں کہے گئے تھے۔ سمیعہ نے کچھ کہے بغیر اپنے واجبات وصول کر کے دستخط کیے اور آہستہ قدموں سے چلتی اس عمارت سے باہر نکل آئی' جہاں وہ پچھلے دو برسوں سے بغیر ناغہ کیے روزانہ کام پر آتی تھی۔ عمارت کی خنک فضا سے باہر چلچلاتی دھوپ تھی اور صاف نیلا آسمان۔ اس کو نہ تو تجربے کا سرٹیفکیٹ دیا گیا تھا نہ ہی دو ماہ کی وہ تنخواہ جو گارنٹی کے طور پر رکھی گئی تھی۔

"پھر سے دریا کا سامنا۔" اس نے سوچا تھا اور پھر وہ بس اسٹاپ کی طرف چل دی تھی۔



"فنکار کی قدر شناسی ہو گئی۔" اماں نے اس کی بات سننے کے بعد تلخ لہجے میں کہا تھا۔ "زمانہ بدل گیا ہے نا'

...گئے ہیں۔" اماں نے سمیعہ کی کہی بات
... آج کی بات نہیں ہے بی بی! یہ ہر زمانے کا
... انصافی میں ابن آدم کا کوئی ثانی نہیں اور
... ہو بھی نہیں بدلتا۔"
... بول رہی تھی اور سمیعہ خاموش تھی۔ اس کا
... تھا اور اس کا ذہن تلخ ہو رہا تھا۔

اس نے اماں کے موبائل فون سے سعد کو کئی بار ... کرنے کی کوشش کی تھی مگر شاید وہ نمبر بدل چکا تھا۔

... نمبر نہیں بدلا تھا۔ سمیعہ کو اپنی تقدیر بدلتی ... رہی تھی۔ وہ ایک فن کدے سے باہر نکال دی ... تھی۔ اس کے کام کی کچھ قدر نہیں تھی اور اس ... کوئی ثبوت نہ تھا کہ وہ اس میدان میں کام کر ... تھی۔ پہلی تماشاپیٹ ورکشاپ کی آفیشلی ویب ... پر اس کے کارناموں اور تاریخ کا تو ذکر تھا مگر ان ... لڑکیوں کا ہوگا جو ہنرمند تھے مگر ڈگریوں سے ... تھے۔ اس کی آنکھوں میں پانی تھا اور سامنے کا ... دھندلا رہا تھا۔

"... مت کر۔" اچانک اماں کو احساس ہوا کہ وہ کچھ ... باتیں کیے چلی جا رہی تھی۔

"ایک در بند تو سو در کھلے۔" ایک روتی سی تسلی۔

"... سا در کھلا اماں! مجھے یاد ہے میں نے کون سے ... تک نہیں دی تھی۔" اسے دو سال پہلے کے ... آئے۔

"چپ کر سمیعہ! میں تجھے رونے نہیں دوں گی۔"

... میں پہلی بار اماں نے اس التفات کا مظاہرہ کیا ... اس کے لہجے میں غصہ تھا اور سخت ناراضی۔

"کوئی در نہیں کھلتا تو ہم اپنا در بنا لیں گے' ایسا در جو ... کے لیے کھلا رہے گا۔" وہ شاید شدید ... میں تھی اسی لیے بہکی بہکی باتیں کرنے لگی

"زمانہ کیا سمجھتا ہے' وہ نت نئے فیشن سامنے لاتا ... پرانے فیشن ختم ہو جاتے اصل میں زمانہ ... کو ہی نئے طریقے سے زندہ کرتا ..."

سمیعہ کو لگا' اماں کی نظریں دور کہیں خلاؤں میں کچھ منظر دیکھ رہی تھیں' اس کے چہرے پر عزم تھا اور جوش بھی۔

اس رات اماں نے ایک پرانے اٹیچی کیس کا زنگ آلود تالا کھول کر اس کے اندر رکھی ہفت اقلیم کی دولت سمیعہ کے حوالے کی تھی۔ سمیعہ کا ذہن کام کرنا چھوڑ رہا تھا۔ وہ کبھی اماں کے چہرے کو اور کبھی اس شکستہ حال اٹیچی کیس کو دیکھ رہی تھی جسے آج تک اس نے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ جس کو کھول کر اس کے اندر رکھی چیزوں کو دیکھنے کی اس نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ اٹیچی کیس سے نظریں ہٹا کر اب وہ اماں کے چہرے کو تکے جا رہی تھی' ہمیشہ کی طرح دنداسے سے رنگے ہونٹ بلیچنگ کریم سے سنہرے کیے بالوں کے گچھے' کانوں کے پانچ چھیدوں میں سستے نگوں والے ٹاپس چمکاتی اماں' سدا کی ڈرامے باز..... نوٹنکی کی شہزادی 'لاجونتی' کسی نے اسے یہ خطاب کیوں دیا تھا' سمیعہ کو اس روز سمجھ میں آیا تھا۔



سعد عثمان کی ورکشاپ نے اس سال کے چند بہترین کھیل پیش کیے تھے اور اس کے پرانے تخلیق کار ساتھی ایک ایک کرکے دوبارہ سے اس کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ پہلی تماشاپیٹ ورکشاپ' آہستہ آہستہ اپنی اہمیت اور نام کھو رہی تھی اور پھر ایک روز ان لوگوں نے سنا کہ نوشیرواں اپنی ورکشاپ اونے پونے داموں بیچ کر خود بیرون ملک جا بسا تھا۔

"بغیر کسی Bid کے اس نے سارے ایکوپمنٹس اور باقی سامان بیچ دیا۔"

"پتا ہوتا تو کچھ کام کی چیزیں ہمیں بھی سستے داموں مل جاتیں۔" ایک میٹنگ میں اسی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے عبیداللہ نے کہا تھا۔

"وہ چیزیں تو اسکریپ بن چکی ہوں گی۔" سعد کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی "ان کو خریدنے والا بھی کوئی اسکریپ ڈیلر ہی ہوگا۔ اس سے خرید کر مہنگے داموں بیچے گا۔"

"نوشیرواں کو اتنا مایوس نہیں ہو جانا چاہیے تھا۔ آخر اس کا نام ملک میں پپٹ تھیٹرز کے بانیوں میں آتا تھا' اس کو ٹیلنٹ ڈھونڈنا چاہیے تھا۔" کسی نے تبصرہ کیا تھا۔

"عزم اور جنون۔" سعد عثمان نے انتہائی مدبرانہ انداز میں رائے دی تھی دونوں کی کمی تھی نوشیرواں کے ہاں' اس کی ورکشاپ اس لیے چلی کہ اس وقت مقابلے پر کوئی نہ تھا' ٹیلنٹڈ لوگوں کے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی' نوشیرواں کو یہ غرور تھا کہ شاید یہ اس کا ہی کوئی کمال تھا' مگر ایسا نہیں تھا جوں ہی مقابلے پر آنے والے لوگوں کا سامنا ہوا' وہ ہمت ہار گیا' محنت اور لگن سے کام بنتے ہیں' یہ نہ ہو تو ہمیشہ کام بگڑتے ہیں' جب ٹیلنٹڈ لوگ ساتھ چھوڑ گئے تو اس کے غبارے سے بھی ہوا نکل گئی۔ بجائے نیا ٹیلنٹ ڈھونڈنے کے اس نے منہ چھپا لینے میں ہی عافیت جانی۔"

سعد عثمان پتلی تماشا پپٹ ورکشاپ کے شروع کے سالوں سے ہی اس سے وابستہ تھا۔ اس نے بیشتر کام وہاں سے سیکھا تھا اور بہت سے تجربے بھی وہیں کیے تھے' مگر آزادانہ کام کرنے کی خواہش اسے نوشیرواں کی حاکمانہ طبیعت سے دور کرتی رہی تھی۔ "شہزادی اور مینڈک" اس کے لیے آزادانہ ترقی کا زینہ ثابت ہوا تھا اور اب وہ اپنی ایک مقبول عام ورکشاپ کا مالک تھا۔

ترقی کے اس سفر میں وہ اس شخصیت کو قطعی بھول چکا تھا جو نہ ہوتی تو وہ خود بھی نوشیرواں کی ورکشاپ کی طرح بھولا ہوا قصہ بن چکا ہوتا۔ وہ اس شخصیت کو بھول چکا تھا مگر وہ اسے کبھی نہیں بھلا پائی تھی۔



جس ماحول اور جن باتوں سے سمیعہ سدا سے خائف تھی' اس روز اماں کی انگلی پکڑ کر وہ خود اپنے قدموں پر چلتی اس میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ ایک مختلف دنیا تھی۔ یہاں کے باسی پیٹ پالنے کی خاطر کچھ بھی کر سکتے تھے' اس نے یہاں کئی بظاہر معقول نظر آنے والے لوگوں کو خواجہ سرا بنتے دیکھا تھا اور سنجیدہ ذہن لوگوں کو بھانڈوں اور میراثیوں کی سی حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔

"فنکار کو Pun (لفظوں کے ذومعنی استعمال) پر مہارت حاصل ہونی چاہیے' سمیعہ پتر' Pun کو بڑے دانشور فنکار اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں' ہم اس پر مہارت حاصل کر لیں تو اسے جگت بازی کا نام دے دیتے ہیں۔ یہ جو بڑا فنکار ہے سچا اور سوہنا اپنا ضیاء الدین' اس سے سوہنا Pun کا ماہر کون ہو گا' پھر وہ پڑھا لکھا۔ ہم ہیں جاہل اس کا pun فی البدیہہ ٹکا... ہمارا pun جگت بازی' بس یہ ہی فرق ہے سنجیدہ تھیٹر اور شوقیہ تھیٹر میں۔"

اس نئی دنیا کا ایک بڑا نام اسے ایک دن سمجھا... تھا۔

وہ اسی طرح کی اور معلومات سے بھی روشناس ہو... مگر اس دنیا میں اس کا دل نہیں لگا۔ وہ خود کو بے... محسوس کرتی تھی۔ یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا اماں! کوئی در نہیں کھلتا تو اپنا در بنانے کی کوشش کریں گے' جو ہم جیسو... کے لیے ہمیشہ کھلا رہے گا۔"

ایک روز اس نے اماں کو بتایا تھا۔



"روایتی تھیٹر کا نئے ا... سے جنم۔"

سعد عثمان نے ریسٹورنٹ میں اپنی مخصوص ... پر بیٹھنے کے بعد عادتاً شیشے کی دیوار کے پاس نظر... عمارتوں پر نظر ڈالی اور بری طرح چونک گیا۔ "پتلی تما... پپٹ ورکشاپ" کی عمارت بھی ان ہی میں سے ا... تھی' جو پچھلے ایک عرصے سے بند اور ویران پڑی ... اس کی دیواروں کا روغن خراب ہو رہا تھا اور ڈ... بورڈ غائب تھا' مگر اس روز اس کی آنکھیں ایک نیا ... دیکھ رہی تھی۔ اسموک گرین رنگ کے نہایت ...

[illegible] عمارت کا تعارف لکھا تھا'
[illegible] کی دنوں میں بدل گئی تھی'
[illegible] کے بعد اس ریسٹورنٹ
Revival of trabitional [illegible]
theater in new style
[illegible] پر لکھے یہ الفاظ دور سے پڑھے جا
[illegible]

"Rebrth of khalifa [illegible] the legend"

[illegible] بشیر کا نام

ان الفاظ کے نیچے جلی حروف میں ایک اور جملہ لکھا [illegible] ساتھ میں کسی شخص کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر [illegible] آرڈر کینسل کروا کر وہ ریستوران سے باہر [illegible] اور پیدل چلتا ریستوران کے عقب میں واقع [illegible] عمارتوں کے قریب پہنچ گیا۔

[illegible] تماشا پپٹ ورکشاپ کی جگہ اسی قسم کا کوئی نیا [illegible] اپنے اندر سموئے وہ عمارت ایک نئی دھج [illegible] رہی تھی۔ اس ہفتے کے شوگیٹ کیپر کے پاس اپنا [illegible] کروا کر اندر داخل ہوتے ہی اس کی ایک [illegible] بورڈ پر پڑی۔

"[illegible]۔" خلیفہ بشیر کا تاریخی کھیل نئے انداز [illegible]

"[illegible] جمورا۔" ستر کی دہائی کا مشہور عالم اسٹریٹ پلے [illegible] کی جانب سے نوٹنکی کی شہزادی 'لاجونتی عروج' [illegible]

"[illegible] مہینوال۔" کٹھ پتلی تماشا کی دنیا میں انقلاب [illegible] ایک بے مثال پتلی تماشا۔

"[illegible] اور مینڈک۔" برادر گریم کہانیوں کا شہو[illegible] کھیل ایک نئے انداز میں۔

"میں اس ورکشاپ کے مالک کا نام جان سکتا ہوں؟" [illegible] ریسپشن پر بیٹھے لڑکے سے پوچھا۔

"[illegible] کام "لاجونتی انٹرپرائزز" کی جانب سے ہو [illegible]"

"[illegible]؟" سعد کے لہجے میں تجسس تھا۔

"اس وقت تو وہ آپ سے نہیں مل سکتیں۔ آپ ٹائم لے کر آئیے گا۔"

ریسپشنسٹ نے بے نیازی سے کہا اور ورکشاپ کا کارڈ اسے تھما دیا۔

"جو کوئی بھی ہے' یہ چیلنجنگ رول" ——— واپسی پر سعد کے دل و دماغ اسے باور کروا رہے تھے۔



ایک ایک کر کے سعد نے اس ورکشاپ کے سارے کھیل دیکھے' جو مختلف ہالز میں پیش کیے جا رہے تھے۔ تمام کھیلوں میں کام کرنے والے چہرے نئے مگر کام منجھا ہوا تھا۔ خصوصاً "بچہ جمورا" میں لیڈ رول لاجونتی کا' وہ تقریباً "سینتالیس اڑتالیس سال کی عورت تھی اور شکل کی کچھ خاص اچھی نہ تھی مگر اس کا کام بہت خوب صورت تھا۔ صحیح معنوں میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ جس کسی کا بھی آئیڈیا تھا کامیاب تھا' قدیم اور جدید انداز کا یہ امتزاج تنقید نگاروں' دیکھنے والوں اور آرٹ پروموٹرز کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

لاجونتی انٹرپرائزز' کی مالک سے ٹائم لیے بغیر ملاقات ممکن نہ ہو پا رہی تھی اور وہ ادھر ادھر سے اس کے بارے میں کچھ خاص معلومات بھی اکٹھی نہ کر پایا تھا۔ مگر اسے اس سارے کام میں ایک مانوس سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس نے اس ورکشاپ کے کھیلوں کی ڈی وی ڈیز بھی منگوا کر دیکھی تھیں۔ اس کام میں ایک عجیب سی بے ساختگی تھی' فنکاروں کے کام میں زرخیزی تھی' زبان اور لہجہ عوامی بھی تھا اور ثقافتی بھی۔

سوہنی مہینوال ایک ایسا کٹھ پتلی ڈرامہ تھا جس میں فوک کلچر کا رنگ نمایاں تھا' میلوں ٹھیلوں والے کٹھ پتلی تماشوں کا سا رنگ' مگر اس کے مکالمے اور ادائیگی انتہائی شائستہ تھی۔

"بچہ جمورا۔" سرکس میں کام کرنے والی ایک ایسی فنکار کی کہانی تھی جو ڈگڈگی کی آواز پر سرکس کے لیے

کوئی بھی کرتب دکھانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ اس کا لب ولہجہ طنزیہ مگر بہت مضبوط تھا۔ حقیقت میں اس نئی ورکشاپ نے پہلے سے کام کرنے والوں کی میزیں الٹانے کا کام شروع کر دیا تھا۔



"مینڈک اور شہزادی" کے بنیادی خیال کو ہم نے تھوڑا سا بدل دیا ہے۔ خلیفہ بشیر آرٹ ورکشاپ کی روح رواں نئے آنے والے کھیل پر تعارف پیش کر رہی تھیں۔

حاضرین میں موجود سعد عثمان کا دل اس شخصیت کو دیکھ کر کئی دھڑکنیں مس کر چکا تھا۔ "اس بار شہزادی مینڈک کو چوم کر شہزادہ نہیں بنائے گی' بلکہ مینڈک شہزادی کو چوم کر مینڈکی میں تبدیل کر دے گا۔" وہ بتا رہی تھی۔

"Change is all over the

"تبدیلی ہر جگہ پر ہے۔" سعد عثمان کے کانوں سے اپنی ہی کہی ہوئی آواز کی بازگشت ٹکرا رہی تھی۔

"وقت کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگی ضروری ہے مگر ماضی کے رنگ و آہنگ سے ناتا توڑ لینا ایک بڑی حماقت ہے۔ ہماری کامیابی کا راز ہی اس بات میں ہے کہ ہم نے جدید و قدیم کا رابطہ دوبارہ جوڑا اور توازن برقرار رکھا۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ کو یہ اچھوتا خیال کیسے آیا؟" کوئی پوچھ رہا تھا۔

"یہ خیال میرا نہیں' میری ماں کا ہے' میری ماں جو فن کی دنیا کا ایک بچھڑا اور گم نام ستارہ تھی' جس نے گم نامی اور فاقہ کشی سے سمجھوتا کر لیا مگر روایات سے منہ موڑنے پر رضامند نہ ہو سکی۔ یہ ان ہی کا خیال تھا اور یہ سب ان ہی کی شخصیت کی برکت ہے۔ میری ماں جسے وقت نے دوبارہ سینٹر اسٹیج پر لا کھڑا کیا اور جسے آپ سب "نوٹنکی کی شہزادی 'لاجونتی" کے نام سے بچہ جمورا میں دیکھ رہے ہیں۔

خلیفہ بشیر کی یہ ہونہار مگر خوددار شاگرد' خود کو ماضی کے کھنڈرات میں دفن ہوتا دیکھتی رہی' مگر اس نے خلیفہ بشیر کے تھیٹر کی روایات سے انحراف کرنا گوارا نہیں کیا۔ یہ چھوٹے موٹے تھیٹر رولز' سرکس فن اور گھر میں اچار چٹنیاں بنا کر بیچتی گزارا کرتی رہی مگر کوئی در ایسا نہ کھٹکھٹایا جس کے اندر داخل ہو کر اسے خلیفہ بشیر کی روح کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑتی۔

وقت نے جب اس کے ساتھ اس کی فن کے عشق میں مبتلا بیٹی پر بھی سب دروازے بند کر دیے تو پھر اس نے اسی بیٹی کی شادی کے لیے سینت سینت کر رکھی رقم خرچ کر کے اپنا در بنانے کی ٹھان لی۔ ایک ایسا در جو اس کے اور اس کی بیٹی کے جیسے لوگوں کے لیے ہمیشہ وا رہے گا۔ لاجونتی انٹرپرائزز' لاجونتی اور اس کے ساتھی فنکاروں کے عمر بھر کے بجائے سرمائے سے لانچ ہوا ہے' اس کی مالی مشکلات کو کچھ پرانی روایات کے دلدادہ فن شناسوں نے بانٹا اور مل جل کر اس ورکشاپ کا ڈھانچا کھڑا کر دیا جو عوام کے لیے ہے' عوامی ہے اور عوامی ہی رہے گا۔"

خلیفہ بشیر آرٹ ورکشاپ کی روح رواں سمیعہ رحیم پر اعتماد' آواز میں بول رہی تھی اور سعد سلمان اس کے خدوخال میں وہ لڑکی تلاش کر رہا تھا جو اپنے ٹیلنٹ سے نا آشنا' مرنجان مرنج' بے نیاز تھوڑے پر راضی' رضا رہنے والی تھی۔

"اسے اس بے نیازی اور ڈاؤن ٹو ارتھ صورت حال سے کس نے نکالا؟" وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔

"کوڑا کرکٹ سے فٹ بال سینے کے دھاگوں چمڑے کے چھوٹے ٹکڑوں اور کپڑوں کی کترنوں کو جمع کر کے ہی تو ہم اب تک رزق کماتے آئے ہیں۔" اسے سمیعہ کی کہی بات یاد آئی۔

"ہم؟" خود اس نے سمیعہ سے سوال کیا تھا۔

"ہم۔ میں اور میری ماں۔" سمیعہ نے بتایا تھا۔

"اوہ' اس نے دل میں جھرجھری لی تھی۔ یہ کوڑا چننے والی عورت کی بیٹی ہے۔" اس نے سوچا تھا۔ "جب ہی اتنی مسکین اور غیر متاثر کن شخصیت کی مالک ہے۔" اسے کراہت سی آئی تھی۔ اس نے اپنے

... نظر کا ایک گھٹیا سا خاکہ فرض
... اسے یہ سوچ کر بھی اطمینان سا ہوا
... کا بڑی آسانی سے استحصال
... بھی احساس بھی نہیں ہوگا اور وہ خود
... کی کیٹگری میں کام کرنے والی
... جائے گا کرتی جائے گی۔

"اور اب۔" سعد نے اپنے سامنے کا منظر دیکھا۔
... کوڑا چننے والی ماں کھادی کا پنک سوٹ پہنے،
... شیڈ میں رنگے نفیس جیولری پہنے بیٹھی
... کوڑا چننے والی عورت نہیں لگ رہی
... کے چہرے پر البتہ ایک عجیب سی کرختگی
... اور اس کے چہرے کے تاثرات کہیں کہیں اس
... کے فنکارانہ کیریر کی جھلک دکھلا رہے تھے۔

"... کی شہزادی لاجونتی۔" سعد نے کئی بار جیسا یہ
... میں دہرایا اور لاجونتی کے پیچھے دیوار پر لگی
... نظر ڈالی۔ جہاں لاجونتی انٹرپرائزز کی تعارفی
... چل رہی تھی۔ سفید تہبند اور سفید کرتا
... پٹکا باندھے چارپائی پر بیٹھا خلیفہ بشیر،
... آرٹ اکیڈمی کے شاہکار نئی فنکار لاجونتی
... پیش کردہ کھیلوں میں کام کر رہے تھے۔

"Khalifa Bashir the ...
... بار بار جلی حروف میں یہ الفاظ دکھا رہی تھی
"... کی راکھ میں دفن اس شخص کو کس نے راکھ
..."

... اور پھر اس نے ... رحیم کو دیکھا،
... کا انتہائی اچھا سلا ہوا سوٹ پہنے
... کسی بھی میک اپ سے
... اعتماد سے بولتی یہ وہ لڑکی تو نہ تھی جس
...

... کی ... اور احساس کمتری سے کس
... دوسرا سوال کیا۔
... آگاہی کی دولت مل جاتی
... اور ... بن جاتا ہے۔" مائیک
پر موجود کوئی شخص بول رہا تھا۔

"خلیفہ بشیر آرٹ ورکشاپ۔" ان لوگوں کا گھر ہے اور یہاں سے اٹھنے والی آواز ان لوگوں کی آواز ہے جنہیں بڑی بڑی آرٹ اکیڈمیوں میں بیٹھے سوٹڈ بوٹڈ، انگریزی دان، ہوانا سگار کے دھویں چھوڑتے دانشور مڑ کر درخور اعتنا نہیں سمجھتے، ان کے اندر کے فنکاروں کو پہچان نہیں پاتے مگر در حقیقت یہ ہی اصلی اور سچے فنکار ہیں، جن کے دل اور کام ان مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوتے تانبا بن چکے ہوتے ہیں جن کو یہ بڑے نام اسکرین پر اور اسٹیج پر ہائی لائٹ کرتے ہیں۔ ان فنکاروں کی فنکاری میں سچائی اور بے ساختہ پن اس لیے نظر آتا ہے کہ وہ ان ہی مسائل سے گزر رہے ہوتے ہیں، اسی لیے ان کا فن حقیقت سے قریب اور ان کے منہ سے ادا ہونے والے مکالمے قدرتی لگتے ہیں۔ لاجونتی انٹرپرائزز ان بڑے ناموں اور اونچی ورکشاپس اور آرٹ اکیڈمیز کے لیے ایک چیلنج بن کر سامنے آیا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے "ہم سا ہو تو سامنے آئے" اب اس بڑی اسکرین پر شہزادی اور مینڈک کا تھیم سونگ دکھایا جا رہا تھا۔

دروازہ کھولو میری پیاری شہزادی
اپنی سچی محبت کا دروازہ کھولو
جو تم نے ہم نے اقرار کیا تھا
کیا تم کو یاد نہیں

دیسی مینڈک اور دیسی شہزادی کٹھ پتلیوں کی شکل میں اسٹرنگز پر تھرک تھرک کر گا رہی تھیں۔

"خلیفہ بشیر کے مزاج اور جدید رجحانات کا امتزاج" ہال میں بیٹھے سامعین توصیفی جملے کہہ رہے تھے اور سعد عثمان پر نوشیرواں جیسی دھند چھا رہی تھی۔



نسیم ارشد

عکس اور آئینے



"گڈی کہیں گئی ہوئی ہے۔ منی پہلے ہی اس وقت گھر پر نہیں ہوتی۔ تم مجھے واپس لے چلو۔"

"اور آپ کا مٹھو' وہ کیا ہوا؟" خرم نے انتہائی طنزیہ انداز میں کہا۔

"وہ بھی نوکری پر گیا ہوگا۔" وہ اس کے جلے کٹے انداز کے برعکس بڑی روانی سے کہہ رہی تھیں۔ خرم نے انتہائی ناگواری سے گاڑی واپس موڑی۔

"آپ کی یہ گڈی کسی وقت گھر بھی ٹکتی ہے یا ہر وقت نوکری ہی کرتی رہتی ہے۔ اس کا لہجہ برہم تھا۔

"کیا ہوگیا ہے خرم۔ محنتی بچی ہے اور بہت ہی لائق اور نیک۔ تم تو ایسے ہی مرچیں چبائے رہتے ہو۔ بن ماں باپ کے بچے پر اتنے سیدھے اور فرماں بردار" وہ حسب معمول ان کی تعریفوں میں رطب اللسان ہونے لگیں۔

"امی! یہ ہمارا چوتھا چکر ہے اور گڈی صاحبہ ندارد! اوپر سے آپ کی ضد۔" خرم نے اسپیڈ بڑھائی۔

"ارے کیا ہوگیا ہے' آرام سے چلاؤ۔"

"آپ کی گڈی صاحبہ تو یقیناً بوتھکس میں ماری

ارى كپڑوں كے ڈیزائن چُراتى پھر رہى ہوں گى تاكہ لانئنلس كو كپڑے سى كر دے سكیں اور آپ۔" " سوچ كر رہ گیا۔

"ذى منى مٹھو كیا عجائب خانہ ہے اور میرى ماں ان كى شیدائى بہت بڑى قدر دان۔" وہ مسلسل جل رہا تھا۔ تین چار مرتبہ آنے كے باوجود گھر كا

ابھى وہ اپنے خالہ زاد بہن بھائیوں سے مل نہیں سكا تھا لیكن بن دیكھے ہى وہ ان سے چڑنے لگا تھا۔ اس كى اپنى بے اعتنائى اور كزنز كى گوناگوں مصروفیات۔ وہ ابھى تک ان سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں كر سكا تھا۔

"كون سى كلاس میں پڑھتى ہے آپ كى منى؟" اس نے چبا چبا كر پوچھ ڈالا۔



اوالا بند۔ تالا منہ چڑا رہا ہوتا تھا۔ نہ جانے تینوں بہن ملى كہاں كے سیر سپاٹوں اور آوارہ گردى میں مصروف رہتے ہیں۔

"منى كى پڑھائى بڑى سخت ہے۔ شام كے وقت یں اور پڑھنے جاتى ہے، صبح كے ٹائم اسكول جاتى ہے ہر وقت كتابوں میں سر دیے ركھتى ہے۔" امى نے طرف سے اس كا دل صاف كرنے كى كوشش كى جو رشتہ داروں سے بلا وجہ ضد باندھ بیٹھا تھا۔

"یہ كیا "آپ كى" "آپ كى" لگا ركھى ہے تم نے۔ تمہارى بھى كچھ لگتى ہے۔ چھوٹى بہن ہے تمہارى اور اس كى كلاس كا مجھے نہیں پتہ۔ كوئى مشكل سا نام لیتى ہے۔" انہوں نے خرم كى كلاس لینے كے ساتھ ساتھ جواب دیا۔

خرم كى نگاہوں میں گورنمنٹ اسكول كے یونیفارم میں برما سا بستہ كندھے پر لٹكائے دوپٹہ كانوں كے پیچھے اڑسے چہرے سے حماقت ٹپكاتى منى كا خیالى سراپا در

آیا۔ اس نے سر جھٹکا اور گاڑی روک کر گیٹ کھولنے لگا۔ ان کا گھر آچکا تھا۔

"امی! آپ کی گڈی بہت مصروف شخصیت ہے۔ آپ اس کا خیال دل سے نکالیں اور کوئی اور لڑکی دیکھ لیں لاہور میں بہت لڑکیاں ہیں۔" خرم نے بڑی فرماں برداری سے رفعت کے گھٹنے دباتے ہوئے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ بری طرح اچھلیں اور اس کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے جھٹکے۔

"خبردار کوئی ایسی الٹی سیدھی بات کی۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی "میری بہو بن کر اس گھر میں صرف گڈی ہی آئے گی۔ اگر نہیں تو پھر واپس چلے جاؤ۔ وہیں جہاں سے آئے ہو اور جہاں اب تک رہے ہو۔" وہ یکایک رنجیدہ ہو گئیں۔

"امی۔!" خرم نے دفاعی انداز میں ان کے ہاتھ تھامے۔

"ہاں تو ٹھیک ہے کرلو شادی۔ میں نے کب منع کیا ہے لاہور بھرا پڑا ہے لڑکیوں سے۔ تمہارے باپ کو مل گئی تھی، تمہیں بھی مل جائے گی بلکہ اسی کے خاندان میں کرلو جو تمہارے باپ کے پیچھے پڑی تھی۔ بہت ہوں گی اس کی بھانجیاں بھتیجیاں۔ باپ کو ماڈل ٹاؤن میں آتے ہی مل گئی تھی۔ تم تو امیر آدمی کے بیٹے ہو تمہیں کیا کمی۔ میں وہیں چلی جاؤں گی جہاں پہلے تھی۔ ان بچوں کے سہارے پہلے بھی تنہائی کاٹی ہے انہوں نے ماں سے بڑھ کر چاہا، محبت دی درجہ دیا اور میں بھی کیسی خود غرض کہ بیٹے کی شکل دیکھتے ہی انہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگی چلی آئی۔ انہیں اپنی شفقت کے سائے سے نکال کر۔

ان بچیوں کو جنہوں نے اپنی ماں کے بعد مجھے ماں سے بڑھ کر رکھا اور تم۔ تم نے آتے ہی ان سے بیر باندھ لیا ہے۔ پہلے باپ نے چار پیسے دیکھتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں تم بھی تو اسی پر جاؤ گے۔ کہاں سیدھی سادی گوالمنڈی کی پیداوار ماں اور ماں کے رشتہ دار۔ ماڈل ٹاؤن سے گوالمنڈی کا سفر واقعی بے وقوفی ہے۔ ماڈل ٹاؤن سے کم از کم بھی ڈیفنس ہونا چاہیے۔" وہ پھٹ پڑیں۔

خرم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ماں کی محبت میں مجبور ہی سہی۔ لیکن گوالمنڈی میں رہائش پذیر گڈی نامی خالہ زاد سے شادی کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن امی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔ اسے اپنی ماں کی محرومیوں کا بھرپور احساس تھا۔ اس کے باپ کی بے وفائی کے بعد ماں نے ساری عمر تنہا گزاری تھی۔

خرم کے والد نے جیسے ہی گوالمنڈی سے ماڈل ٹاؤن تک کا سفر طے کیا علاقے کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات بھی بدلتی چلی گئیں اور بدقسمتی سے ان کی ترجیحات میں بیوی بھی شامل تھی جو انہیں اپنے جدید گھر اور نئے سرکل کے لیے بہت ہی ناموزوں لگ رہی تھی۔ کاروبار کی وسعت کے ساتھ ہی انہوں نے سیدھی سادی اور ان پڑھ رفعت بیگم کو بڑے آرام سے نظر انداز کیا اور دوسری شادی کے بعد کاروبار سمیٹ کر کراچی سدھارے۔ جاتے جاتے وہ اپنا اتا پتا چھوڑے بغیر خرم کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ رفعت بیگم کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ شوہر کی بے وفائی اوپر سے بیٹے کی جدائی ان کی حالت بری ہو گئی تھی ایسے میں ان کی بہن عفت نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ماں باپ کے بعد میکے سے تعلق میں مضبوطی نہ رہی تھی اور پھر ایسی کٹی پھٹی حالت میں تعلق بوجھ ہی محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن عفت انہیں اپنے گھر لے گئی۔ عفت کے میاں اکرام نے بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح ان کا احترام کیا تھا۔

چھوٹی بہن کی دل جوئی اور تین بچوں کی مصروفیت نے انہیں کسی حد تک سنبھال لیا تھا۔ انہوں نے اپنی قسمت پر صبر شکر کر کے خود کو بہن کے بچوں سے بہلایا تھا لیکن گڈی، منی اور مٹھو کو دیکھ دیکھ کر انہیں خرم اور بھی زیادہ یاد آتا۔ وہ اپنی ساری ممتا ان تینوں بہن بھائیوں پر نچھاور کر کے اپنی تشنگی مٹانے کی کوشش کرتیں۔ عفت گھرداری کے جھمیلوں میں مصروف رہتیں اور دانستہ بچوں سے غافل رہتیں تاکہ بڑی آپا کا دل بہلا رہے اور وہ بچوں میں مصروف رہیں۔

خرم جس وقت پیدا ہوا' وہ لوگ گوالمنڈی میں ہی رہتے تھے۔ اس کے بعد کاروباری ترقی انہیں راس نہیں آئی۔ ان کی طبیعت کی حد درجہ سادگی کو احسان صاحب حماقت سمجھتے تھے' وہ ان سے کسی حد تک بیزار رہتے۔ ان کی ازدواجی زندگی میں ناہمواریاں اسی وقت آنے لگی تھیں اور ماڈل ٹاؤن میں شفٹ ہونے کے بعد احسان صاحب ان سے مزید دور ہوتے چلے گئے' رفعت بیگم بدلتے وقت اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں کلی طور پر ناکام رہیں بالآخر احسان صاحب کی دوسری شادی اور کراچی روانگی کے بعد وہ ماڈل ٹاؤن کے وسیع و عریض گھر میں اکیلی رہ گئیں گھر کی تعمیر سے پہلے پلاٹ رفعت بیگم کے نام تھا اس لیے مکان پر ملکیت جتائے بغیر طلاق کے کاغذات دے کر وہ ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے نکل گئے۔

عفت کی نیکی اور صلہ رحمی کا اجر اس کے بچوں کو ملا تھا' عفت اپنے شوہر اکرام کے ساتھ کسی شادی کی تقریب میں گئی تھی۔ تینوں بچے اس وقت اسکول جاتے تھے بچوں کو آپا کے پاس چھوڑا تاکہ آپا تنہا نہ ہوں اور بچوں کی پڑھائی متاثر نہ ہو۔ شادی سے واپسی پر ایک ہولناک حادثے میں دونوں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

صدمے سے چور رفعت بیگم نے جان سے پیاری بہن اور بھائیوں سے بڑھ کر عزیز بہنوئی کو کھویا تھا۔ ساتھ ہی تین بچے بھی ماں باپ جیسی عظیم نعمتوں سے محروم ہوگئے تھے۔ رفعت بیگم ان تینوں کے لیے ماں اور باپ دونوں بن گئیں۔ ان کی لاچاری میں بہن نے انہیں سہارا دیا تھا' اب بہن کے لخت جگر انہوں نے سینے سے لگالیے۔ زندگی ان کے سہارے کٹ رہی تھی۔

بچوں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے معاملات میں گم ہو کر وہ اپنے وجود سے غافل ہوگئیں۔

جن بچوں کے سر پر ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت کا سایہ نہ ہو وہ شعور کا سفر وقت سے پہلے طے کر لیتے ہیں۔ خالہ کی سادہ لوحی کے باوجود بچے بہت سمجھ دار اور سلجھے ہوئے تھے' انہوں نے کسی بھی مقام پر خالہ کو کسی مشکل سے دوچار نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہیں مایوس کیا تھا۔

اس رواں دواں اور ہنگامہ خیز زندگی میں تبدیلی اس وقت آئی جب خالہ کے بیٹے نے خالہ کو خط لکھا۔



"خرم ہائیر اسٹڈیز کے لیے باہر جانا چاہ رہا ہے۔" احسان صاحب نے چائے کے سپ لیتے ہوئے اپنی بیوی نائلہ احسان کو بتایا۔

"کیوں اسے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟" نائلہ نے ترشی سے پوچھا۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے' ارسلان بھی تو انگلینڈ میں ہے۔" احسان صاحب نے چھوٹے بیٹے کا حوالہ دیا۔

"تو کیا خرم اب ارسلان کی برابری کرے گا۔" نائلہ کے تاثرات عجیب ہوگئے۔

"کیا ارسلان خرم سے برتر ہے جو خرم اس کی برابری کرے گا۔" احسان صاحب کچھ برہم ہوئے۔ اپنے دھیان میں مگن اندر آتا خرم بری طرح ٹھٹک کر رکا۔

"ارسلان میرا بیٹا ہے اور خرم۔"

"خرم بھی تمہارا بیٹا ہے۔" احسان صاحب نے تیز لہجہ میں ان کی بات کاٹ دی۔

"نہیں ہے وہ میرا بیٹا۔ کیا اوقات ہے اس کی' بچپن سے لے کر اب تک اس لیے اس منحوس کو برداشت کرتی رہی کہ وہ میرے بچوں سے مقابلہ بازی کرے۔ وہ صرف ارسلان کی ضد میں باہر جانا چاہتا ہے۔ اور میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ رہتا وہیں اپنی خبطی' جاہل اور گنوار ماں کے پاس پھر اسے پتہ چلتا کہ وہ اپنے پاگل پن اور حماقت میں اس کی کیا تربیت کرتی ہے۔"

لفظ سنسناتے ہوئے تیروں کی مانند اس کے پتھر ہوئے وجود میں اتر گئے۔ گزرے ہوئے بہت سے پل' محرومیاں اور تنہائی اس کے سامنے مجسم آکھڑی ہوئی تھیں جب اپنے تینوں بہن بھائیوں کے برعکس وہ ایک کونے میں لگا کھڑا رہتا تھا اور.....

اس بدترین انکشاف کی زد میں اس کا وجود برف میں گم ہو رہا تھا۔ خون کی گردش' دل کی دھڑکن سب کچھ ایک نقطے پر رک چکے تھے۔

"کون ہے میری ماں۔" میری ماں۔ وہ احمق اور گنوار کہاں ہے؟" وہ دھیرے سے بڑبڑاتا آگے بڑھا۔

"کہاں ہے میری ماں؟" وہ ایک دم چیخ پڑا۔

"خرم!" احسان صاحب اس کی طرف بڑھے۔

"میری ماں کہاں ہے؟" وہ ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نائلہ بیگم تنفر سے بڑبڑاتی جا چکی تھیں۔

"ادھر بیٹھو خرم! بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" انہوں نے اس کا بازو تھاما۔

"ایک لفظ نہیں' صرف یہ کہ میری ماں کون ہے؟ اور کہاں ہے؟" اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو چکی تھیں۔ اس کی متغیر رنگت اور غیر معمولی تنفس۔ وہ خود پر قابو پانے کے لیے جتن کر رہا تھا۔ احسان صاحب نے شکستگی سے اسے دیکھا اور حقیقت بتادی۔

"میں اپنی محرومیوں اور اذیت کے لیے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا کبھی نہیں۔ تاقیامت نہیں۔"

وہ رک رک کر ایک ایک لفظ کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا وہاں جا کر اس نے اپنا ضروری ترین سامان سمیٹا اور اس گھر سے نکل آیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

"ہیلو دانش! کہاں ہو تم؟"

"میں تمہاری طرف آرہا ہوں"

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے کہا او فون بند کر دیا شدید ہیجان' اضطراب اور بے یقینی سے اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ اگر وہ ان کی باتیں نہ سن لیتا تو کیا ساری زندگی یونہی بے خبری میں یونہی ہوئے ترستے ہوئے گزر جاتی۔ ایک پرائی عورت ج سوتیلی ماں ہی سہی ماں نہ بن سکی اس سے ما تلاشتے۔

"اور ماں وہ کہاں ہوں گی' کس حال میں کیا زندہ بھ ہوں گی یا۔"

اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکا۔ اس کا جی چاہ تھا کہ اڑ کر اپنی ماں کے پاس چلا جائے لیکن اس کی حال ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنا طویل سفر کر پاتا۔ یا کسی ایئرلا سے اپنی فلائٹ وغیرہ کا پتہ کرتا۔ لیکن اس کا دل یہی رہا تھا کہ اڑ کر لاہور پہنچ جائے۔

ٹیکسی دانش کے گھر کے سامنے رکی تو وہ اپنی سوچ سے نبرد آزما ہوتا کرایہ ادا کر کے اندر چلا گیا۔ دانش ا کا انتظار کر رہا تھا۔ سفری بیگ اور سب سے بڑھ کر ا کے چہرے کی وحشت اور شکستگی دیکھ کر وہ چونک گیا۔

"کیا ہوا خرم! خیریت تو ہے سب؟ کہاں جار ہو؟" خرم کچھ کہے بغیر اس سے لپٹ کر بے آ سسکنے لگا۔ دانش بچپن سے ہی اس کی الجھنوں اور سوالوں سے واقف تھا جو نائلہ بیگم کے رویے سے ا کے ذہن میں ابھرتے تھے۔ اسے اپنی الجھنوں کا م اپنے سوالوں کا جواب مل گئے تھے۔ لیکن اس ا میں ملیں گے اس نے کبھی خواب میں نہیں سوچا دانش اس کی بات سن کر انتہائی سنجیدہ ہو گیا۔

"لو پانی پیو۔" اس نے خرم کو بیڈ پر بٹھا کر گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ خرم نے چند گھونٹ گلاس پیچھے کر دیا۔

...یں فلائٹ کا پتہ کرتا ہوں۔ ہم دونوں لاہور
...یں گے۔ تم خود کو بھی تنہا مت سمجھنا۔"

"جلدی کرو دانش! اگر فلائٹ نہیں ملتی تو میں بائی
...ہوا بائی روڈ چلا جاؤں گا' مجھ سے مزید انتظار نہیں
...

"خرم! تم اپنی والدہ کے پاس ضرور جاؤ لیکن یوں
...یلا ہمت چھوڑ کر۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے جن کو میں ساری عمر
...ھتا رہا وہ میرے نہیں رہے تو اور کیا ہے جس پر
...ا یاریوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

...ی سے کہتا ہوا بیڈ پر دراز ہو گیا۔ چند گھنٹوں کی
...صاب جنگ نے اسے بری طرح شکستہ کر دیا تھا۔ وہ
...ھال سا پڑا گہری سانسیں لے رہا تھا۔

"تم آرام کرو۔ میں فلائٹ کا پتا کر کے آتا ہوں۔"
...ں سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اگلے دن کی پرواز سے انہیں لاہور جانا تھا لیکن
...اپنی دباؤ کی وجہ سے خرم کی طبیعت بے حد
...گئی تھی اس کے لیے بیڈ سے اٹھنا دشوار
...ہا تھا۔ دانش نے شام تک اس کے سنبھلنے کا انتظار
...پھر اسے اسپتال لے گیا۔

"خرم! تم مجھے اپنی ماما کے گھر کا ایڈریس بتاؤ۔"
...ال میں خرم کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے خرم
...لیا۔

"تم کیا کرو گے؟"

"جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے تب تک ان
...رابطہ کرنے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے۔ میں عثمان
...کو ایڈریس دیتا ہوں۔ وہ کوئی کانٹیکٹ نمبر وغیرہ
...گا۔ یا کچھ بھی۔ کوشش کرنے میں کیا حرج
... اچھا ہے تم وہاں جانے سے پہلے ان سے بات
... انہیں اپنے آنے کے بارے میں انفارم
...

... نے بلا تردد اسے ایڈریس بتا دیا۔ احسان
... ایک بار بتانے پر یہ پتہ اس کی یادداشت
... لیے محفوظ ہو گیا تھا۔

دانش نے لاہور میں مقیم اپنے کزن سے بات کر کے اسے تمام صورت حال بتائی اور ساتھ ہی خرم کی طرف سے ایک خط انہیں پہنچانے کا کہا۔ عثمان نے پوری ذمہ داری سے کام کیا تھا۔



ہلکے نیلے رنگ کے لیٹر پیڈ پر کھلا خط منیزہ نے وصول کیا۔ چند سطریں پڑھ کر وہ بے ساختہ چیختی ہوئی خالہ کے کمرے میں بھاگی۔

"خالہ! خالہ خرم بھائی کا خط آیا ہے' وہ آپ سے ملنے آرہے ہیں۔" منیزہ ایک ہی جست میں خالہ کے پاس پہنچی۔ حسنہ منہ کھولے منیزہ کو دیکھ رہی تھی جبکہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پینٹ برش سے کپڑے پر الٹے سیدھے نقش و نگار بنتے جا رہے تھے۔

"میرا چشمہ پکڑاؤ۔" خالہ نے خط منیزہ کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ منیزہ نے چشمہ انہیں دیا اور سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر اچک کر خط میں لکھا خرم کا موبائل نمبر ملانے لگی۔

"خالہ! یہ لیں بیل جا رہی ہے' خرم بھائی سے بات کر لیں۔"

"پہلے خط تو پڑھ لوں۔" خالہ مارے حیرت اور خوشی کے بے ربط ہو رہی تھیں۔

"کال ریسیو ہو گئی ہے' بات کریں۔" منیزہ نے سرگوشی میں کہتے ہوئے موبائل ان کے کان سے لگا دیا حسنہ قمیص کا خراب ہوا ڈیزائن ایک طرف رکھ کر خالہ کے قریب کھسک آئی۔ منیزہ پہلے ہی ان کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔

"خرم! یہ میں ہوں تمہاری امی۔"

خوشی سے ان کی آواز کپکپا گئی۔ دوسری طرف دانش نے کچھ کہے بغیر موبائل خرم کی طرف بڑھایا۔ خرم نے نقاہت اور طبیعت کی خرابی پر قابو پاتے ہوئے بڑے ہشاش بشاش انداز میں امی سے بات کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ دوسری طرف رفعت بیگم کا بھی ایسا ہی حال تھا۔

"کہہ رہا تھا۔ ایک دو دن میں آئے گا۔ ماڈل ٹاؤن والا گھر کھلواؤ۔ کہہ رہا تھا اپنے گھر آئے گا۔" وہ تینوں بہن بھائی بچپن سے خرم کے ذکر کے عادی تھے۔ اب اس کے ذکر میں خرم کی باتیں بھی شامل ہو گئی تھیں' وہ چھوٹا سا بچہ جسے ان لوگوں نے صرف تصویروں میں دیکھا تھا۔ ان کی یادوں کے ساتھ ہی پل کر جوان ہوئی تھی۔ اب وہ انہیں اپنے گھر کا ایک فرد محسوس ہوتا۔

اس کی طبیعت اس دن جو خراب ہوئی تو اسے کئی دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ ابتدائی جذباتی دھچکے سے سنبھلنے کے بعد دانش کے سمجھانے پر وہ کراچی میں اپنے والد کے ساتھ اپنے حصہ کی جائیداد کے معاملات طے کر کے واپس جانا چاہ رہا تھا۔

"امی! خالہ واپس جا رہی ہیں اپنے گھر؟" منیزہ ان کی واپسی کا سنتے ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھی تھی۔

"اپنا گھر تو اپنا ہوتا ہے اور پھر ان کا بیٹا اتنے سالوں بعد ان سے ملنے آ رہا ہے۔"

حسنہ بڑے رسان سے اسے سمجھا رہی تھی ورنہ خالہ کے جانے پر وہ خود بھی بڑی بے چین تھی۔ ان کے بغیر گھر کیسے چلے گا وہ لوگ کیسے رہیں گے۔ حسنہ کو یہ سب بہت مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنی پریشانی بلال اور منیزہ سے چھپا رکھی تھی۔

"ہم اکیلے کیسے رہیں گے؟" اس کی آواز میں خوف تھا۔ حسنہ افسردگی سے مسکرا دی۔

"ہم اب بڑے ہو چکے ہیں۔ بلال ہے نا ہمارا بھائی۔ ہم کیوں اکیلے ہونے لگے۔"

"لیکن وہ تو اکثر رات کو گھر نہیں آتا۔"

"تو کیا ہوا؟" خالہ کا گھر برسوں سے بند پڑا ہے۔ ان کے ساتھ جا کر صفائی وغیرہ کروا دیں گے تاکہ رہنے کے قابل ہو سکے۔" حسنہ خود ہی پروگرام ترتیب دینے لگی۔

"خرم بھائی کو کیا تکلیف ہے۔ وہ یہاں ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔" منیزہ یاد آنے پر تنک کر بولی۔ حسنہ کو ہنسی آنے لگی۔

"وہ تمہارے خرم بھائی ہیں' تم ان کی منیزہ بہن نہیں ہو۔"

"مٹھو! اگر تم فارغ ہو تو کسی مالی کا پتہ کرو۔ وہاں گھر میں تو جھاڑ جھنکار اگ آیا ہے۔ رنگ روغن بھی خراب ہو کر جھڑ گیا ہے۔ گھر کو سدھارنے میں کافی وقت لگ جائے گا۔ خرم پتہ نہیں کب آ جائے گا۔"

خالہ خرم سے بات ہونے کے بعد فوراً" ماڈل ٹاؤن گئی تھیں۔ زنگ آلود تالا کھولنے کے بعد جب وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو خودرو جھاڑیوں اور گھاس پھونس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ خستہ حالی کا شکار تھا۔

"آپ بے فکر رہیں' سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ وقتاً" فوقتاً" گھر کا چکر لگاتی رہتیں تو اب آسانی رہتی۔ میں اسپتال سے چھٹی لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ کام ہو جائے گا۔"

بلال نے کندھوں سے تھام کر خالہ کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ وہ یونہی ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی تھیں۔ اب تو خرم کی آمد نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

"مزدور پینٹ کر رہے ہیں۔ حسنہ! تم صبح جا کر دیکھ لینا۔ میں جلدی وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا جو ضرورت کی چیزیں ہیں ان کی لسٹ بنا لینا تاکہ ایک ہی بار شاپنگ کی جا سکے۔ وقت واقعی کم ہے اور کام زیادہ۔"

منیزہ اور حسنہ خالہ کے ساتھ ان کے گھر آئیں تو رنگ و روغن کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ گھر کا سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ بے ترتیبی عروج پر تھی۔ اتنا پھیلاوا دیکھ کر خالہ حسب معمول بوکھلاہٹ کا شکار ہونے لگیں۔ حسنہ ان کی کیفیت پر ہنس رہی تھی۔

"سب کچھ ہو جائے گا آپ پریشان نہ ہوں۔"

حسنہ اور منیزہ نے مزدوروں سے کہہ کر سارا فرنیچر ہال اور لان میں نکلوایا تاکہ پالش ہو سکے۔ بہت سی چیزیں وقت کی ناقدری کے ہاتھوں خراب ہو چکی تھیں۔ خالہ جان نے گھر چھوڑا تو کبھی پلٹ کر نہیں آئیں اور اب آ کر زنگ آلود تالے توڑے گئے تھے۔

فرنیچر کی پالش شروع کروا کر انہوں نے کچن کا رخ کیا۔ کچن میں ضرورت کے برتن وغیرہ موجود تھے۔

لیکن بہت سی چیزوں کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ کیبنٹ گل سڑ گئے تھے۔

"کچن تو بالکل استعمال کے قابل نہیں رہا۔" منیزہ پریشانی سے بولی۔ کیبنٹس کے دروازے اکھڑے ہوئے تھے۔ گیس کا چولہا بھی اچھی حالت میں نہیں تھا۔ باتھ رومز میں بھی ایسی ہی ٹوٹ پھوٹ تھی۔

"بلال تو بالکل فارغ نہیں ہے۔ آج کل ایمرجنسی چل رہی ہے۔ جبکہ باتھ رومز میں سینٹری فٹنگ کی اشد ضرورت ہے۔ الیکٹریشن کی بھی ضرورت پڑے گی اٹھارہ بیس سال کافی طویل عرصہ ہوتا ہے۔"

"گڑی! اب کیا ہوگا؟" خالہ جان حواس باختہ ہوگئیں۔

"ابھی کافی وقت ہے۔ فرنیچر پالش کرنے والے یہاں کیبنٹ سیٹ کردیں گے۔ میں الیکٹریشن کا پتہ کرتی ہوں۔"

"تم کہاں سے پتہ کروگی۔ لاؤ مجھے مٹھو کا نمبر ملا کر دو وہ آدمی ہے اس طرح کے کاموں کا اسے پتہ ہے۔ منیزہ تم باہر سے ٹھیکے دار کو بلا لاؤ۔ تاکہ کچن کا کام بتائیں۔ میں بلال کو فون کرتی ہوں۔" حسنہ بلال کا نمبر ملانے لگی۔ اس سے الیکٹریشن بھیجنے کا کہہ کر وہ ٹھیکے دار کو کچن کیبنٹس کے بارے میں بتانے لگی۔

"آخری بار جب میں اس گھر سے گئی تو عفت میرے ساتھ تھی۔ اسی نے سارا گھر سمیٹ کر تالے لگائے تھے اور پھر اکرام کے ساتھ مجھے یہاں سے لے کر چلی گئی۔ اس نے اور اکرام نے مجھے اتنی عزت اور اپنائیت دی کہ وہی مجھے اپنا گھر لگتا تھا اور ان دونوں کے بعد تم لوگوں نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا ورنہ نہ جانے اس وقت میں کہاں ہوتی۔" وہ برتن نکالتے ہوئے ماضی میں پہنچ گئی تھیں۔

منیزہ اپنی ماں کے نادیدہ لمس کو ہر چیز پر محسوس کررہی تھی۔

"الیکٹریشن آرہا ہے۔ اسے تمام چیزوں کے بارے میں بتادیتے ہیں تاکہ وہ سامان لاکر کام شروع کرسکے۔" منیزہ انہیں لے کر مرکزی ہال میں چلی آئی۔ جہاں

...نے پر پالش کا کام ہو رہا تھا۔
"پتا نہیں خرم بھائی کو یہ سب پسند آئے یا ..." حسنہ کو خدشہ لاحق ہوا۔

"کوئی بات کرے تو سہی میں اس کا سر دونوں کانوں کے بیچ کر دوں گی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ تم وہیں آجاؤ، آکر گھر درست کرواتے رہنا۔ مگر کہہ رہا تھا۔ ہم ماں بیٹا اپنے گھر میں رہیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے ناں ہم صرف ضروری مرمّت کروائیں گے۔ باقی تبدیلیاں وہ خود ہی کروالیں گے اپنی پسند کے مطابق۔" حسنہ بڑے تحمل سے انہیں قائل کر رہی تھی۔

"میرا دماغ تھوڑا اکھڑ گیا ہے۔ کچھ تو عمر کا تقاضا ہے کچھ خرم کے آنے کی خوشی میں۔ خوامخواہ تمہیں تنگ کر رہی ہوں۔" خالہ کی ذہنی رو دوسری طرف بھٹک گئی۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ حسنہ نے جلدی سے بازو ان کے گرد حمائل کیے۔

"کیا کہہ رہی ہیں خالہ! ہم کیوں تنگ ہونے لگے۔ ہمیں کیا خوشی نہیں بھلا۔ ہمارا بھی تو بھائی آرہا ہے اتنے سالوں بعد ہم چار بہن بھائی ہو جائیں گے۔"

"ارے تمہارا کہاں سے بھائی ہو گیا۔" وہ بدک کر پیچھے ہٹیں۔ وہ حسنہ کے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں۔ حسنہ شرمندہ ہو گئی۔

"خالہ! کیا خرم بھی ہمارا بھائی نہیں۔ بلال کی طرح۔"

"ارے گڈی! کن باتوں میں الجھا دیا۔ ادھر منی اکیلی برتن دھو رہی ہے۔" وہ کمال صفائی سے اس کی بات نظر انداز کر گئیں۔ اوپری دل سے بھی وہ خرم کو حسنہ کا بھائی بنانے پر تیار نہ تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد بلال الیکٹریشن کو لے کر آگیا۔

"حسنہ! تم اسے سارا کام دکھا دو اور مطلوبہ سامان کی لسٹ بھی بنالو۔ میں شام کو لے آؤں گا۔ اس وقت میں شارٹ لیو پر آیا ہوں۔ مجھے اسپتال پہنچنا ہے۔"

"مٹھو! یہ لڑکیوں والے کام نہیں ہیں۔"

"خالہ! میں بہت جلدی میں ہوں۔ وہ تو الیکٹریشن کو گھر کا پتہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لیے مجھے ساتھ آنا پڑا۔"

وہ خاصی عجلت میں تھا۔ ان سے کہتا ہوا گاڑی بھگا کر چلا گیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے دیکھتی رہ گئیں۔ حسنہ مسکراہٹ دباتے ہوئے پلمبر اور الیکٹریشن کو تمام متاثرہ جگہیں گھوم پھر کر دکھانے لگی۔ اسی دوڑ دھوپ میں شام ہو گئی۔

"کل ان شاء اللہ کافی کام ختم ہو جائے گا۔" حسنہ واپسی پر خاصی مطمئن تھی۔

منیزہ تھکن اتارنے کے لیے فریش ہونے چلی گئی۔ حسنہ کچن میں آگئی۔ سالن فریج میں موجود تھا۔ لیکن روٹیاں پکانا تھیں ابھی بلال بھی آجاتا۔

"گڈی! یہ مٹھو ابھی تک کیوں نہیں آیا۔"

"وہ مارکیٹ گیا ہے۔ الیکٹریشن نے جو سامان بتایا تھا وہ خریدنے۔"

"ہائے بچہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ ایک نوکری کی مصروفیت اوپر سے یہ بھاگ دوڑ۔"

"اب تو تمام کام اختتامی مراحل میں ہیں۔ ایک دو دن میں ختم ہو جائیں گے منیزہ! دستر خوان لگاؤ بلال آنے والا ہو گا۔"

حسنہ تیزی سے سلاد اور رائتہ بنا رہی تھی۔ کھانا لگتے ہی بلال آگیا۔ کھانے کے دوران بھی خرم کی آمد اور گھر کی تعمیر و مرمّت کا موضوع زیرِ بحث رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"خرم! اب تو تین دن ہو گئے ہیں تمہیں آئے ہوئے۔ اب جی بھر کے مجھے دیکھ لیا ہے تو چل گڈی کی طرف چلیں۔ میں کبھی اتنے دن ان لوگوں سے دور نہیں رہی۔"

"لیکن وہ لوگ آپ کے بغیر آرام سے رہ رہے ہیں۔" خرم نے انہیں ٹالنا چاہا۔ اس کا کہیں جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پچھلے دو دنوں سے وہ گڈی، منی نام سن رہا تھا اور امی کو ٹال رہا تھا۔

"کہاں رہ رہے ہیں وہ۔ مٹھو بیچارا تو سارا دن

اسپتال میں لگا رہتا ہے۔ اسے کہاں فرصت، کبھی کہیں تو کبھی کہیں منی گھر پر نہیں ہے اور رہ گئی گڈی تو اس کی بھی نوکری ہے۔"

"یہ مٹھو یقیناً" کسی اسپتال میں وارڈ بوائے ہوگا۔ یا پھر شاید میڈیکل ریپ، دوائیاں سپلائی کرتا ہوگا تب ہی تو بقول امی کے کبھی کہیں تو کبھی کہیں ہوتا ہے۔"

خرم نے اپنی طرف سے اندازہ لگایا۔ یقیناً" اس کے رشتہ دار کافی پسماندہ تھے۔ اس کے پاپا نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس کے ننھیال اور امی کے بارے میں کافی تفصیل سے بتایا تھا۔ اس سب کا سیاق و سباق یہی تھا کہ اس کی امی اور باقی رشتہ دار حد سے زیادہ جاہل تھے۔ ان کا ماحول طور طریقے۔

خرم اپنے پاپا اور سوتیلے رشتہ داروں کا ڈسا ہوا تھا۔ اس لیے مزید رشتہ داروں سے ذرا بچ کر رہنا چاہتا تھا۔ خود اس کی امی رسمی سا پڑھی ہوئی سادہ مزاج خاتون خانہ تھیں۔

اب کیا سوچ رہے ہو، چلتے ہو یا نہیں۔"

"چلتے ہیں امی میں ذرا چینج کرلوں۔" وہ لاؤنج سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ "گھر تو کافی خوبصورتی سے سیٹ کیا ہے۔ اب منی، گڈی اور مٹھو میں سے باذوق نہ جانے کون ہے۔" خرم نے اپنے کمرے کے انٹیریر کو ایک بار پھر سراہا۔

آدھے گھنٹے بعد تیار ہو کر نیم دلی سے ان کے ساتھ روانہ ہوا تو اندرون لاہور کے پرہجوم اور پرپیچ راستوں نے اسے بیزار کر ڈالا۔ کافی دیر خواری کے بعد وہ اکرام دل پہنچے تو بند دروازہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

"اب کیا کریں؟" وہ جی بھر کر بدمزہ ہوا۔

"کرنا کیا ہے، مجھے تو گڈی اور مٹھو کا فون نمبر بھی یاد نہیں۔ وہی نمبر ملا دیا کرتے تھے۔" خالہ پریشان تھیں۔

"تین دن سے بچوں کی خیر خبر نہیں لی۔ میرے جیسا بے دھیان بھی کوئی ہوگا۔"

"اب یہیں بیٹھے رہیں یا واپس چلیں؟"

"واپس ہی چلو۔ گڈی گھر پر لڑکیوں کو کام سکھاتی ہے۔ اس وجہ سے بازار گئی ہوگی کوئی سامان خریدنے۔ میں گڈی کو اپنے گھر ہی لے جاؤں گی، ہر وقت کی فکر ختم ہوگی۔ مٹھو کی شادی کردوں گی اور منی تو وہ میرے پاس ہی رہے گی۔"

"منی بھی آپ کے پاس رہے گی۔ گڈی کو بھی اپنے گھر لے جائیں گی۔ تو باقی کیا بچا مٹھو تو اسے پنجرے میں ڈال کر رکھ لیں گے۔" وہ چڑ کر بولا۔

"کیوں فضول بولتے ہو گڈی کو بہو بنا کر لے جاؤں گی اور منی میری چھوٹی لاڈلی بیٹی ہے مٹھو شادی کے بعد اپنے گھر ہی رہے گا۔" خرم ان کا پہلا جملہ سن کر ہی سناٹے میں آگیا۔ اس نے ان کی باقی بات نہیں سنی تھی۔

"گڈی سے شادی۔ اوہ نو! امی سے محبت اپنی جگہ لیکن خود کو یوں داؤ پر لگاؤں نا وہ کبھی بھی ایسے نقار خانے میں شادی نہ کرتا۔

واپسی کا سفر امی کے اس جذباتی جملے کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے بے خبری میں کٹ گیا تھا۔

"اب میں ان لوگوں سے رابطہ کیسے کروں۔ فون تک نہیں کرسکتی۔" گھر آکر وہ پھر کہہ رہی تھیں۔ خرم کے پاس مٹھو کا نمبر تھا۔ لیکن اس نے جان بوجھ کر امی کو نہیں بتایا تھا۔

"تم نے مجھے اپنے ساتھ باندھ لیا ہے شادی تک اسی گھر میں رہتے تو کیا تھا۔"

وہ اپنی طرف سے پوری منصوبہ بندی کیے بیٹھی تھیں۔ خرم ان کی بات کا جواب دیے بغیر پاؤں پٹختا ہوا اندر چلا گیا۔



"خرم! تم کہاں گئے ہوئے تھے؟ اتنی دیر سے مٹھو تمہارا انتظار کرکے واپس چلا گیا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم گھر گئے تھے لیکن وہ تینوں گھر پر نہیں تھے۔ وہ اپنا اور گڈی کا فون نمبر لکھ کر دے گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فون۔ کہہ رہا تھا کہ میں جب چاہوں، ان سے بات کرلوں۔ کل وہ لوگ آئیں گے تم سے ملنے۔ اتوار ہے

نا۔" وہ مارکیٹ سے گھوم پھر کر واپس آیا تو امی نے اسے آتے ہی خبر سنائی۔

مٹھو کے موبائل دینے پر وہ خاصا تلملایا۔

"آپ کو موبائل کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہتیں۔ میں تو اس لیے نہیں لایا کیونکہ آپ کو آپریٹ کرنا نہیں آتا۔"

"میں نے کون سا اس سے کہا تھا' خود ہی دے گیا کہہ رہا تھا جب دل چاہے گا آپ سے بات کرلوں گا۔ گھر میں دوسرا فون جو نہیں ہے۔" وہ لینڈ لائن کی بات کررہی تھیں۔

"تو آپ نے اس سے موبائل کیوں لیا۔ میں خود آپ کو لے کر دیتا۔" وہ ابھی تک اسی نقطے پر تھا۔ امی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو! تمہاری اور مٹھو کی دلائی ہوئی چیزیں دو نہیں ہیں۔ میں آج تک اسی کی لائی ہوئی چیزیں استعمال کررہی ہوں۔ جب تک اس کا باپ زندہ رہا' اس نے بھی کوئی کمی نہیں کی۔ تنخواہ لاکر میرے ہاتھ پر رکھتا تھا۔ کہتا تھا آپ گھر کی بڑی ہیں اور ہماری بڑی بہن ہیں۔ کوئی سوغات یا پھل ہوتا تو میرے سامنے رکھتے تاکہ میں دوسروں کو بانٹ دوں۔" وہ آبدیدہ ہوگئیں۔

"اور تم ان بچوں سے خار کھاتے ہو۔"

خرم لب بھینچے ان سے تلخ سچائیاں سن رہا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس کی ماں نے بہت محرومیاں دیکھی تھیں اور جن محرومیوں سے محفوظ رہی تھیں یہ ان ہی لوگوں کی وجہ سے تھا۔

"مارکیٹ سے چیزیں لے آنا۔ میں اپنے بچوں کی مہمان داری کروں گی۔ پہلے تو جتنی بار آئے اسی گھر کی مرمت میں لگے رہے تھے۔ ڈھنگ سے کچھ خاطر بھی نہیں کرسکی۔"

وہ کل کے لیے پروگرام سیٹ کررہی تھیں۔ خرم ناشتے کے بعد مارکیٹ گیا اور کئی قسم کے اسنیکس' آئس کریم' جوسز' چاکلیٹ اور کولڈ ڈرنکس لے آیا تھا۔ بیکری کے بسکٹ' کیک' پیٹز اور بھی کافی کچھ۔

اس کی امی اپنے مہمانوں کی خاطر داری کرنا چاہ رہی تھیں۔ اسے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن ان مہمانوں سے ملنا اور وہ بھی ایک مخصوص پوائنٹ آف ویو سے' یہ اسے ناممکن لگ رہا تھا۔ اسی لیے سامان گھر پہنچا کر وہ انہیں بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔

منیزہ رات ہی ٹرپ سے واپس آئی تھی۔ اب تینوں بہن بھائی اتوار کی فراغت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے خالہ زاد کزن سے ملنے آئے تھے۔ بلال کو کسی بھی وقت اسپتال سے کال کیا جاسکتا تھا لیکن اس وقت وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

"خوب موجیں ہورہی ہیں۔ خرم بھائی کے ساتھ ہمیں بھول ہی گئیں" منیزہ ان سے لپٹ کر شکوہ کررہی تھی۔

"میں تو دو تین بار گئی لیکن گھر پر کوئی تھا ہی نہیں۔ تم ٹرپ پر گئی ہوئی تھیں' یہ مٹھو اور گڈی اپنے کاخوں پر۔"

"اب تو ہم لوگ آگئے ہیں اور آج آپ اور خرم بھائی ہمارے ساتھ چلیں گے۔" بلال صوفے پر ٹک گیا۔

"خالہ! خرم بھائی کہاں ہیں؟" تھوڑی دیر انتظار کے بعد حسنہ نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کہاں رہ گیا۔ کل سے تم لوگوں کے آنے کا سن کر اتنا خوش تھا۔ صبح ہی اتنا کچھ خرید کرلایا۔ اب ذرا باہر نکلا ہے تم لوگ بیٹھو۔ میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

"خالہ! آپ نے اتنا ڈھیر کیوں منگوایا؟" حسنہ ان کے ساتھ کچن میں آئی تھی' شیلف پر پڑے شاپرز دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"تم لوگوں کے لیے اور کیوں۔ تم لے کر باہر چلو۔" انہوں نے ٹرے میں کیک پیٹز اور بسکٹ کی پلیٹیں رکھ کر حسنہ کو تھمائی اور خود کولڈ ڈرنک کی بوتلیں سنبھال کر چل پڑیں۔

"جلدی کرو! ابھی اتنا کچھ باقی ہے۔" لاؤنج میں پہنچ کر انہوں نے حسنہ کو آواز دی۔

"خالہ! مجھے کیا پتہ تھا اتنی مزے کی چیزیں ملیں گی میں ناشتہ نہ کرتی۔" منیزہ ڈرم اسٹکس پر کیچپ ڈال کر بڑی رغبت سے کھا رہی تھی۔

"ہاں تو اب شام تک کھاتی رہنا۔" خالہ نے کیک پیس اس کی پلیٹ میں رکھا۔

"لگتا ہے، خرم بھائی پوری بیکری اٹھا لائے۔" حسنہ نے چاکلیٹ بسکٹ کھاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"ارے مٹھو! تمہیں انگور کتنے پسند ہیں۔ خرم لایا تھا بڑے ہی اچھے سرخ سرخ اور موٹے۔ میں نے دھو کر تمہارے لیے رکھے ہیں۔" خالہ یاد آنے پر پھر کچن میں چلی گئیں اور انگوروں سے بھری ہوئی ٹوکری لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔

"بس خالہ! میرا لنچ تو ہو گیا۔" مٹھو مسکراہٹ چھپاتا ہوا انگوروں کی ٹوکری گود میں رکھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ خرم بھائی ابھی تک آئے کیوں نہیں؟"

"ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی۔ پتہ نہیں کیوں نہیں آیا اب تک۔" خالہ ان کی خاطر مدارت میں مگن ہو کر خرم کی غیر موجودگی کو فراموش کر چکی تھیں۔ منیزہ کے یاد دلانے پر چونک گئیں۔

"خالہ جان! آپ انہیں فون کریں۔ ابھی آجاتے ہیں۔"

"لیکن گڈی میرے پاس اس کا نمبر نہیں ہے پھر مجھے یہ موا ای بیل (موبائل) چلانا بھی نہیں آتا۔" منیزہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ بلال اور حسنہ بھی ہنسنے لگے۔ خالہ ہونق بنی ان کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔

"کیوں پاگلوں کی طرح ہنس رہے ہو۔؟"

"خالہ! خرم بھائی کا نمبر آپ کے پاس نہیں ہے۔ وہ بے شک واپس کراچی چلے گئے ہوں۔ آپ کو پتا کیسے چلے گا۔" منیزہ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کی۔ خالہ جان کی رنگت زرد پڑ گئی۔

"نہیں منی! خرم اب کبھی واپس نہیں جائے گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے یہاں آگیا ہے۔ اب وہ یہیں رہے گا میرے پاس۔ وہ کہہ رہا تھا یہیں نوکری کرے گا اور شادی کر کے میرے پاس رہے گا۔" خالہ نے خرم کا دفاع کرتے ہوئے خود کو تسلی دی۔

بلال نے سرزنش کے انداز میں منیزہ کو گھورا۔ اچھا خاصا خوشگوار ماحول سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"خالہ! منیزہ کی تو عادت ہے مذاق کرنے کی۔ ہو سکتا ہے کسی کام سے گئے ہوں۔ دیر سویر ہو ہی جاتی ہے اور پھر لاہور کی ٹریفک کا آپ کو پتہ ہے۔ بلال نے ان کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔

"مٹھو! یہ تو مجھ اتنی دیر سے خیال ہی نہیں آیا' کہیں راستہ نہ بھول گیا ہو۔ وہ کون سا ہمیشہ سے یہاں کا رہنے والا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ راستہ بھول کر خوار ہو رہا ہو گا۔" ان کا دھیان دوسری طرف چلا گیا۔

"خالہ وہ کوئی چھوٹے بچے نہیں ہیں۔ گھر کا ایڈریس انہیں معلوم ہے۔ وہ راستہ کسی سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ بلال تم انہیں فون کرو' تمہارے پاس ان کا نمبر ہے۔"

خالہ بے چینی سے بلال کی طرف دیکھنے لگیں۔

"نمبر نہیں مل رہا۔ نیٹ ورک میں کوئی مسئلہ ہے۔" بلال یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ حسنہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔ رابعہ برتن اٹھا کر ٹیبل صاف کر رہی تھی۔

"بیل جا رہی تھی۔ انہوں نے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔" بلال نے آہستگی سے انگلش میں حسنہ کو بتایا۔

"تم دوبارہ ٹرائی کرو' شاید کال خود کٹ گئی ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم دونوں۔ مجھے کیوں نہیں بتا رہے۔ مٹھو کیا بات ہے یہ گڈی تمہیں کیا کہہ رہی ہے؟"

خالہ بے چین ہو گئیں خالہ کی جرح سے بچنے کے لیے جو بات خالہ کے سامنے نہ کرنی ہوتی وہ انگلش میں کر لیتے تھے۔ خالہ ان کو اچانک پڑنے والے ان دوروں پر چڑ جاتیں لیکن انہیں یہ پتہ نہ چلتا کہ ان سے کچھ چھپایا جا رہا ہے' بلال دوبارہ خرم کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ناٹ اگین۔" اس نے جھنجلا کر موبائل ٹیبل پر پٹخ دیا۔

"خالہ نمبر نہیں مل رہا پتہ نہیں یہ خرم بھائی کا نمبر ہے بھی یا نہیں۔" بلال خرم کے ردِعمل سے پژمردہ سا ہو گیا۔

"آجاتے ہیں ابھی، ہو سکتا ہے ہمارے لیے کھانا لینے چلے گئے ہوں۔" منیزہ نے ان کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

"ہاں دوپہر ہو گئی۔ تم لوگوں کو آئے ہوئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔" وہ ٹائم دیکھنے لگیں۔ بلال کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔

"دیکھو مٹھو! شاید خرم کا فون ہو۔" خالہ نے بڑی امید سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں خالہ! ہسپتال سے فون ہے مجھے ہسپتال پہنچنا ہے، چلتا ہوں۔" کال سننے کے بعد بلال اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم لوگ بھی چلتے ہیں۔ مجھے یونیورسٹی کی تیاری کرنی ہے، ٹرپ کی وجہ سے کافی بے ترتیبی ہو رہی ہے۔ خالہ! آپ کو پتہ ہے میں بھی اتوار کو پورے ہفتے کے لیے کپڑے وغیرہ تیار کرتی ہوں۔ کچن بھی دیکھنا ہے۔" منیزہ نے بھی عذر تراشا۔

"لیکن میں اکیلی۔ خرم بھی نہیں آیا۔" خالہ رو پڑیں۔

"خالہ جان! آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ بلال ہمیں گھر ڈراپ کرے گا بعد میں ہم رکشے ٹیکسی کے لیے دھکے کھائیں گے۔" حسنہ نے بڑی مناسب وجہ پیش کی۔

"نہیں تم لوگ جاؤ۔ میں خرم کے ساتھ آؤں گی۔" انہوں نے بے دلی سے ان کو رخصت کیا۔

"خالہ! کھانا بہت مزے کا تھا۔ ہماری طرف سے خرم بھائی کا شکریہ ادا کیجیے گا اور سلام کہیے گا۔" آتے ہوئے وہ تینوں جتنے پُرجوش تھے واپسی پر اتنے ہی سنجیدہ تھے۔

☼ ☼ ☼

خرم شام ڈھلے واپس آیا تھا۔ اتنی دیر میں دوبار حسنہ اور بلال نے انہیں فون کر کے اس کی واپسی کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ خرم کے آتے ہی اس پر برس پڑیں، وہ کان دبائے ان کی ڈانٹ سنتا رہا۔

"اتنی چاہت سے وہ لوگ ملنے آئے۔ فون کرتے رہے۔ میں الگ پریشان رہی اور تم بڑے آرام سے غائب رہے۔"

"امی! گاڑی خراب ہو گئی تھی، مجھے شہر کا پتہ نہیں۔ اس لیے مکینک تلاش کرنے گاڑی ٹھیک کروانے میں دیر لگ گئی۔"

"تو فون کر کے بتا نہیں سکتے تھے۔" وہ ہنوز ناراض تھیں۔ "مٹھو فون کرتا رہا۔ تم نے وہ بھی نہیں سنا۔"

"مجھے تو کوئی فون نہیں کیا کسی نے۔" وہ صاف مکر گیا۔

"اتنا ہی شوق تھا ان لوگوں کو مجھ سے ملنے کا تو رک جاتے ناں۔" وہ الٹا ان لوگوں پر برہم ہوا۔

"وہ تمہارے جتنے فارغ نہیں۔ مٹھو کو اسپتال سے فون آگیا۔ گڈی اور منی بھی جلدی میں تھیں۔ منی پڑھنے جاتی ہے گڈی کی اپنی نوکری ہے انہوں نے تیاری کرنی تھی۔" خرم نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔

"کل میرے ساتھ چل رہے ہو۔ میں مٹھو سے گڈی اور تمہاری شادی کی بات کروں۔ مٹھو کی منگنی ہو گئی ہے، دونوں کی اکٹھی شادی کر دوں گی۔" خرم بھر کر بدمزہ ہوا۔

"اماں! میں گڈی سے شادی نہیں کر سکتا۔ ابھی مجھے جاب تلاش کرنی ہے۔ مجھے سیٹ ہونے میں وقت لگے گا۔ میں کم از کم چار سال تک شادی نہیں کر سکتا۔ گڈی کی عمر شادی کی ہو چکی ہے تو اسے دیر بٹھانا مناسب نہیں۔ آپ اس کے لیے کوئی دیکھیں۔" وہ چند لمحوں کے لیے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"اگر گڈی کی شادی کہیں اور کر دوں تو منی کا تمہارے ساتھ جوڑ نہیں بنتا۔ وہ مٹھو اور گڈی سے چھوٹی ہے اور ابھی تو پڑھ رہی ہے۔"

"امی! میں کسی میٹرک کی اسٹوڈنٹ سے نہیں کروں گا۔ آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں۔"

"اس سے شادی نہیں کرو گے۔؟" وہ آنکھیں
پھیلا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔
"منی سے۔" اس نے دوٹوک انکار کیا۔
"میں کب کہہ رہی ہوں منی سے شادی کرو' وہ تو
بہت بھولی ہے۔ گڈی کا اور تمہارا جوڑ بنتا ہے۔" ان
کی سوئی ابھی تک اسی نکتے پر اٹکی ہوئی تھی۔
"ابھی مجھے جاب تلاش کرنی ہے۔ اکاؤنٹ میں
جو رقم ہے جو ابھی تک چل رہی ہے لیکن کب تک
اور شادی کے اتنے اخراجات 'گھر کی تعمیر و مرمت پر
کافی رقم خرچ ہوئی ہے۔ وہ یقیناً" آپ کے بھانجے
بھانجیوں نے دی ہوگی۔ ان پر اتنا بوجھ ڈالنا مناسب
نہیں ابھی وہ رقم واپس کرنی ہے۔"
"مٹھو اور گڈی کبھی بھی نہیں لیں گے۔ وہ مجھے
اپنی ماں سمجھتے ہیں۔ رزق کی ان کے گھر میں کوئی تنگی
نہیں۔ دونوں بہن بھائی بہت اچھا کمارہے ہیں۔ اکرام
کے بعد انہوں نے کافی سخت وقت دیکھا تھا۔ مٹھو اور
گڈی ٹیوشن پڑھا کر اپنے اخراجات پورے کرتے تھے
اکرام نے کچھ رقم بینک میں جمع کی ہوئی تھی باقی اس
کی وفات کے بعد محکمے کی طرف سے جو فنڈ وغیرہ ملے۔
وہ بھی بینک میں ڈال دیے۔ میں اس کی مدد سے گھر
چلاتی رہی۔
گڈی اور مٹھو نے دسویں جماعت کے بعد اپنی
تعلیم کا خرچہ خود برداشت کیا۔ گڈی بہت ہنر مند ہے
گھر میں سلائی کڑھائی کرلیتی تھی ان کی محنت رنگ لائی
اب دونوں بہن بھائی نوکری کرتے ہیں گھر میں
خوشحالی ہے میں نے گڈی کے لیے کافی جہیز بھی جمع کیا
ہے اب بات گھر کی ہے۔ وہ سارا سامان منی کے لیے
سنبھال رکھوں گی۔ ہمیں گڈی کا جہیز نہیں چاہیے۔"
خرم ان بھائی بہن کی جدوجہد سے بہت متاثر ہوا۔
طبقوں کی اونچ نیچ اور محرومی بہت بڑی حقیقت سہی
لیکن اس نے مالی مسائل اور تنگی کی شکل نہیں دیکھی
تھی جس ماحول میں وہ پلا بڑھا تھا۔ وہ گڈی' منی وغیرہ
سے میل نہیں کھاتا تھا' اس کے خیال میں گڈی کے
ساتھ اس کا جوڑ بالکل نامناسب تھا۔ یہی بات وہ امی کو
سمجھا نہیں پا رہا تھا۔



"کہاں جا رہے ہو؟" اسے صبح ہی تیار ہوتے دیکھ کر
امی نے استفسار کیا۔"
"امی جاب کے لیے اپلائی کیا ہے آج دو جگہ انٹرویو
ہیں۔ آپ دعا کیجئے گا بات بن جائے۔" وہ کچن میں ان
کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔
"مٹھو کا فون آیا تھا۔ گھر آنے کو کہہ رہا تھا۔ میں
نے کہا خرم کے ساتھ آجاؤں گی۔ تم اپنے کام سے
جا رہے ہو۔ مٹھو سے کہتی ہوں آکر مجھے لے جائے۔"
"میں ذرا جلدی میں ہوں ورنہ آپ کو چھوڑ دیتا۔
آپ ایسا کریں ٹیکسی سے چلی جائیں۔ مٹھو کہاں لوکل
ٹرانسپورٹ پر دھکے کھاتا ہوا آپ کو لینے آئے گا۔"
"نہیں۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ تم بے فکر رہو'
وہ نہ نہیں کرے گا۔" خرم سرہلا کر چائے پینے لگا۔
"فاریہ کے گھر والے آرہے ہیں اسی لیے بلایا
ہے۔"
"کون فاریہ؟" اس نے ایک معقول نام سن کر
سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔
"مٹھو کی منگیتر ہے۔ اس کے ساتھ اسپتال میں
نوکری کرتی ہے۔ بڑی اچھی بچی ہے۔"
"ہوں۔ شاید اسپتال میں نرس ہو۔" خرم نے خود
ہی اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ خرم ناشتے کے بعد
جانے لگا۔
"مجھے مٹھو کا نمبر ملا دو ناکہ میں اسے آنے کا
کہوں۔" اس نے خاموشی سے نمبر ملا کر موبائل ان کی
طرف بڑھایا۔
"تم بھی سلام دعا کر لو۔" امی نے اسے گھرکا۔
"السلام علیکم!" دوسری طرف سے کال ریسیو
کرکے براہ راست کہا گیا۔
"وعلیکم السلام۔ میں خرم بات کر رہا ہوں اور تم
یقیناً" مٹھو ہو۔"

"جی ہاں ' کیسے ہیں خرم بھائی۔" بلال نے بڑی گرمجوشی سے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں 'اصل میں امی کو تمہاری طرف آنا تھا۔ مجھے کہہ رہی تھیں کہ انہیں لے چلوں ۔میرے آج دو جگہ انٹرویو ہیں 'اس لیے میں ذرا جلدی میں ہوں اگر تم انہیں لینے آسکو تو ورنہ میں انہیں ٹیکسی کروادیتا ہوں۔" خرم نے فون کرنے کی وجہ بیان کی۔ بلال کچھ سنجیدہ ہوگیا۔

"نہیں۔ آپ ٹیکسی رہنے دیں۔ میں انہیں لے آؤں گا۔ میرا آج ہسپتال سے آف ہے۔"

"ٹھیک ہے ۔لو امی سے بات کرو۔" خرم نے موبائل انہیں دیا۔

"لڑکا کافی مہذب ہے۔" وہ خود کلامی کرتا ہوا کمرے سے فائل لینے چلا گیا۔ رفعت بیگم وہاں پہنچیں تو ایک افراتفری کا سماں تھا۔حسنہ کچن میں مصروف تھی جبکہ منیزہ کام والی کے ساتھ مل کر زور و شور سے گھر کی صفائی کروارہی تھی۔

"کیا بات ہے تم دونوں آج گھر پر ہو۔" انہوں نے حسنہ اور رابعہ سے ملتے ہوئے پوچھا۔

"فاریہ کے گھر والے آرہے ہیں۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھائیں گے 'اس لیے ہم دونوں نے چھٹی کرلی۔ قورمہ' شامی کباب اور چنے کوفتے تیار ہیں بریانی کے لیے مسالا بنارہی ہوں۔سویٹ ڈش میں ٹرائفل اور زردہ رکھا ہے زردہ تو آپ بنائیں گی میں نے چاول صاف کرکے رکھ دیے ہیں۔ آپ زردہ پکائیں اور بتادیں 'مزید کیا پکانا ہے۔"

"بریانی مرغی کی ہے یا دوسرے گوشت کی۔"

"قورمہ مرغی کا ہے۔ بریانی مٹن کی۔"

"اگر قیمہ گھر پر ہے تو مٹر قیمہ پکالو۔ سالن دو ہوجائیں گے۔ ساتھ میں ایک دو قسم کی سلاد اور رائتہ کرلینا۔ زردے کے لیے میوہ مجھے دو تاکہ میں کاٹ لوں۔بادام گرم پانی میں بھگو دو۔"

خالہ نے مینیو فائنل کیا۔حسنہ نے خشک میوہ کی پلیٹ انہیں دی اور فریج سے قیمہ نکالنے لگی۔

"مٹھو کے سسرال سے کون کون آرہا ہے۔؟"

"فاریہ کے ابو' چچا اور ساتھ ماموں 'بڑے بھائی ا
خالہ ہوں گی۔ فاریہ کے بھائی کی نسبت اپنے ماموں
کے گھر طے ہے وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اس
بلال سے ملنے آئیں گے۔" حسنہ نے تیزی سے م
کے دانے نکالتے ہوئے انہیں بتایا۔

"پانی ابل رہا ہے چاول ڈال دو۔" خالہ ا
ہدایات دینے لگیں۔

"بلال! تم خرم بھائی کو فون کردو۔ اگر لنچ تک فار
ہوجائیں تو یہیں آجائیں۔" حسنہ نے بلال سے ک
ہوئے خالہ کی طرف رائے لینے والے انداز میں دیکھا

"ہاں مٹھو! فون کردو۔ آج تو مل ہی لے تم س
سے پھر۔ کہہ رہا تھا دو جگہ انٹرویو ہیں 'اللہ میرے
کو کامیاب کرے اس کی نوکری لگ جائے تو فکر خ
ہو۔" بلال سرہلا کر خرم کا نمبر ملانے لگا۔

"خالہ جان! ایک جگہ انٹرویو دے آئے ہیں '
رہے تھے اچھا ہوگیا ہے دوسری جگہ ابھی انٹرویو شرو
نہیں ہوا اگر جلدی فارغ ہوگئے تو آجائیں گے۔"
بلال نے خرم سے بات کرکے خالہ کو بتایا۔



بلال کے سسرال والے شادی کی تاریخ طے کر
آئے تھے 'یہ بات کھانے کے بعد ان لوگوں نے بالک
اچانک بتائی 'خالہ حیران رہ گئی تھیں۔

"آپ نے ہمیں بتایا نہیں اور اس طرح۔"

"میرا بیٹا دوبئی سے آیا ہے صرف چند دن کی چھ
ہے۔ اس لیے اس کی موجودگی میں اپنی بیٹی کی شاد
کرنا چاہ رہا ہوں۔" فاریہ کے ماموں نے مجبوری بتائی

"فاریہ اور عرفان کی شادیاں ایک ساتھ ہوں گی
انہوں نے فاریہ کے بھائی اپنے ہونے والے داماد کا
لیا۔

"ہم آپ کے پاس اسی لیے آئے ہیں تاکہ آ
لوگ جو تاریخ بتائیں ہم اس کے مطابق اپنے گھر
بات کریں۔ میرے بیٹے کی چھٹی بہت تھوڑی ہے

آپ پندرہ بیس دنوں میں فاریہ کو رخصت کروالیں۔ زیادہ تیاری کی ضرورت نہیں۔"

منیزہ اس اچانک شادی پر بہت خوش جبکہ خالہ حسنہ اور بلال فکر مند تھے۔

ٹھیک سترہ دن بعد آنے والے اتوار کو بارات جارہی تھی۔ تیاری کے لیے وقت بہت کم تھا۔

"نکاح ہمارے نبی کی سنت ہے۔ اتنے مبارک کام کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ بے فکر رہو۔ ہمیں صرف بری تیار کرنا ہے دونوں بیٹوں کی۔ اس میں کون سا زیادہ وقت لگتا ہے۔ ہر چیز بازار میں بنی بنائی مل جائے گی۔" خالہ جان نے اطمینان سے کہا۔

"دونوں بیٹوں کی۔؟" منیزہ نے نا سمجھتے ہوئے الجھنے سے خالہ سے پوچھا۔ باقی دونوں بھی ان کی شکل دیکھ رہے تھے۔

"ہاں دونوں بھائیوں کی مٹھو اور خرم۔ اتوار کو مٹھو کی بارات جائے گی۔ اس سے پہلے آنے والے مبارک جمعہ کو میں حسنہ کو رخصت کروالوں گی۔ خرم اور حسنہ کی جوڑی خوب سجے گی۔ پڑھا لکھا ہے اپنا گھر گاڑی ۔ بس نوکری نہیں وہ بھی مل جائے گی۔" وہ تینوں خالہ کے انکشاف کے زیر اثر ششدر بیٹھے تھے۔

حسنہ کی حالت سب سے زیادہ عجیب تھی۔ بلال اپنی بہن کے لیے فکر مند۔ جبکہ منیزہ اس اچانک رشتے پر ویسے ہی حیران تھی۔

"خالہ! آپ نے خرم بھائی سے بات کی؟ گنتی کے چند دن ہوئے تھے اسے آئے ۔ بغیر دیکھے ملے یہ سب۔" بلال نے بڑی کوشش سے خود کو بولنے کے قابل پایا۔

"ہاں، خرم سے میں نے آتے ہی کہہ دیا تھا۔ بس کہہ رہا تھا ابھی نوکری نہیں۔ نوکری کا کیا ہے مل جائے گی پڑھا لکھا ہے پڑھے لکھے بچوں کو نوکریوں کی کیا کمی۔"

خرم کی تعلیمی قابلیت کے بارے میں خالہ سے پوچھنا عبث تھا۔ وہ یونیورسٹی کو اسکول کہتی تھیں۔

خرم کی ڈگری کے بارے میں کیا بتاتیں۔ بلال نے استفہامیہ انداز میں حسنہ کو دیکھا۔ وہ بالکل گم صم تھی خالہ نے جس محبت مان اور اعتماد کے ساتھ بات کی تھی بلکہ شادی کی تاریخ طے کی تھی ایسے میں کچھ کہنا حسنہ کے لیے انتہائی دشوار تھا۔ اس غیر معمولی خاموشی پر خالہ پریشان ہوگئیں۔

"کیا بات ہے تم لوگوں کو کیا ہوگیا۔ میں گڈی کی ماں پہلے ہوں۔ خرم کی بعد میں پھر بھی اگر تمہیں لگتا ہے تمیں اس کے لیے کچھ غلط سوچ سکتی ہوں تو اس بات کو یہیں ختم کردیتے ہیں۔" ان کا لہجہ شکستہ تھا۔

"نہیں خالہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ بس اچانک یہ سب ہوا ناں اس لیے آپ نے سرپرائز ہی ایسا دیا ہے۔" حسنہ نے خود کو سنبھال کر خالہ کی تشفی کروائی۔

"جیتی رہو میری بچی! ہمیشہ یونہی میری آنکھوں کی ٹھنڈک' دل کا نور رہو۔" انہوں نے حسنہ کو اپنے ساتھ لگالیا۔ "اتنی بڑی ہوگئی ہو پر میری لیے وہی گڈی ہو جسے میں نے پہلی بار دیکھا تو مجھے کسی گڈی کا گمان ہوا تھا تب سے آج تک تم میرے لیے وہی گڈی ہو' چمکیلی آنکھوں اور چھوٹے چھوٹے گلابی ہونٹوں والی۔" انہوں نے حسنہ کی پیشانی چوم لی۔

"مٹھو! مٹھائی لے آؤ۔ میں محلے میں بھیج دوں' گھر جاکر بھی آس پاس ہمسایوں کے گھروں میں تقسیم کردوں گی' میرے تین بچوں کی شادی طے ہوگئی ہے۔"

"فاریہ کے گھر والے مٹھائی لائے ہیں۔ آپ وہی لے جائیں۔" بلال کے اندر سناٹا اتر آیا تھا۔ حسنہ اور منیزہ اسے بہت عزیز تھیں۔ خالہ کی محبت اور خلوص کسی شک و شبے سے بالاتر تھا لیکن ان کی سادہ لوحی اور طبیعت کی معصومیت شاید حسنہ کے لیے مسائل کھڑے کرتی۔

"میں خرم کو تاریخ کے بارے میں بتادوں۔ خریداری تو گڈی اور منی مل کر کریں گی۔ مجھے آج کل کے فیشن کا کیا پتہ پھر میں یہیں رہوں گی۔ شادی کی تیاری کرنے۔ خرم اب نہیں آئے گا۔ شادی سے

پہلے میں گڈی کا پردہ کراؤں گی۔" خالہ خوشی میں بے تکان بول رہی تھیں
"میں آپ کو چھوڑ آؤں۔" بلال پژمردگی سے بولا۔
"کپڑے بدل لیں۔" منیزہ نے آہستگی سے کہا۔
"نہیں ٹھیک ہے۔" اس نے شکن آلود براؤن شلوار قمیص کو دیکھا۔
مہمانوں کی واپسی کے بعد وہ بہت آرام دہ اور بے فکر انداز میں کارپٹ پر بیٹھے تھے۔ جب خالہ نے دھماکہ کیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ بے چین تھا۔
"منیزہ! مٹھائی لے آؤ۔"
منیزہ نے مٹھائی کا ڈبہ انہیں تھمایا۔ بلال گاڑی نکال کہ ان کا انتظار کرنے لگا۔ جس وقت وہ خالہ کے گھر پہنچے خرم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بلال اس کا انتظار کرنے لگا۔ اب اس سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ بلال کو کافی دیر بیٹھنا پڑا تھا۔
خرم شام ڈھلے گھر پہنچا تو کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ بلال سے وہ فارمل انداز میں ملا تھا۔
بلال اس کی حرکات و سکنات پوری حسیات سے جانچ رہا تھا۔
"انٹرویوز کیسے رہے؟" وہ بڑے اخلاق سے خرم سے بات کر رہا تھا۔
"تقریباً" اچھے۔ ایک جگہ تو بڑی امید ہے بات بن جائے گی۔ دوسرا انٹرویو اچھا ہوا لیکن مجھے لگا جیسے فارملیٹی تھی ان لوگوں نے سلیکشن پہلے ہی کر لی تھی۔" خرم کا انداز کافی پرتکلف تھا۔
"پہلی ملاقات ہے شاید اس لیے یہ فارمل ہے۔"
بلال تنقیدی انداز میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ خرم کو اس کے انداز سے الجھن ہوئی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر بلال سنبھل گیا۔
"خالہ! میں اب چلتا ہوں۔ اچھا خرم بھائی۔" اس نے مصافحہ کیا۔ خرم نے غور سے اس کا حلیہ دیکھا۔
ایک میڈیکل ریپ یا وارڈ بوائے ہونے کے باوجود اس کا حلیہ، بات چیت کا انداز بہت سلجھا ہوا اور پُر اعتماد تھا۔
بلال کو اس سے مل کر کافی تسلی ہوئی تھی۔ ریزرو مغرور ہونے کے باوجود اس کی مجموعی شخصیت متاثر کن تھی۔ اس کی بے نیازی اور اٹھان اس کے اچھے ماحول کی دین تھی۔ اس نے خرم سے اس کی تعلیم کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ خرم پہلے ہی کانشس ہو گیا تھا۔ گھر واپسی پر وہ قدرے پُرسکون تھا۔
"خرم! منہ میٹھا کرو۔" رفعت مٹھائی لے کر چلی آئیں۔
"کس خوشی میں۔ ابھی مجھے جاب نہیں ملی۔" اس نے گلاب جامن کا تھوڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔
"جاب بھی مل جائے گی۔ یہ مٹھائی تمہاری شادی کی خوشی میں ہے۔ میں نے تمہاری بات پکی کر دی ہے گڈی کے ساتھ۔" خرم یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیا کہہ رہی ہیں؟" اس کی آواز سے بے یقینی مترشح تھی۔
"پندرہ دن بعد شادی ہے۔ مٹھو کے سسرال والے شادی کی تاریخ لینے آئے تھے۔ میں نے ساتھ ہی تمہاری تاریخ رکھ دی۔ دونوں کام ایک ساتھ نمٹ جائیں گے۔" وہ اپنی کارکردگی سے آگاہ کر رہی تھیں۔
خرم بے حس و حرکت کھڑا تھا۔
"کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھو۔ چائے پیو۔" انہوں نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔ خرم نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔
"امی! آپ کے خیال میں، میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لوں گا جسے میں نے دیکھا تک نہیں۔"
اس کے ساکت وجود میں تحریک پیدا ہوئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھ کر تلخی سے کہا۔
"گڈی نے بھی تمہیں نہیں دیکھا۔ اس نے تو ایسا کوئی اعتراض نہیں کیا۔" انہوں نے برہمی سے کہا۔
"لیکن میں "گڈا" نہیں ہوں جو کسی گڈی سے شادی کر لوں۔" وہ غصے میں بدلحاظ ہوا۔

"میرے لیے گڈے ہی ہو۔ اتنے سے تھے' جب میری گود میں آئے۔ ابھی گڈے ہی تھے۔ جب تمہارا ظالم باپ چھین کر لے گیا۔"

"وہ وقت گزر چکا ہے۔ آپ مجھے پھر کھونا چاہتی ہیں" خرم غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

رفعت بیگم لڑکھڑا گئیں۔ ان کی رنگت ہلدی کی طرح ہو گئی۔ خرم کو اپنے الفاظ کی سنگینی کا احساس ہوا۔

"امی!" وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ وہ بے جان سی ہو کر وہیں ڈھے گئیں۔

"آئی ایم سوری امی!" خرم نے ان کے کانپتے ہوئے یخ ٹھنڈے ہاتھ تھام لیے۔ وہ بالکل خاموش تھیں۔

"امی! آپ میری بات تو سمجھیں۔" اس طرح بالکل اچانک۔" وہ بے بسی سے بات ادھوری چھوڑ گیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ خرم تڑپ کر ان کے قدموں میں بیٹھا۔

"خرم! تم واپس چلے جاؤ۔" انہوں نے بمشکل جملہ پورا کیا۔ ان کا جسم پوری طرح کپکپا رہا تھا۔

"امی! میں کہیں نہیں جا رہا کبھی بھی نہیں۔" خرم ان کے اتنے شدید ردعمل پر گھبرا گیا تھا۔

"میرا یقین۔ کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آئے ہو۔ ٹوٹ گیا ہے۔" لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ان کے لبوں سے نکل رہے تھے۔

"مجھے یہ خوف جینے نہیں دے گا کہ تم مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ میں ہر وقت مرتی رہوں گی۔ ایک بار مرنا آسان ہے۔ تم چلے جاؤ۔" ان کی آواز بتدریج دھیمی ہو گئی۔

"یا پھر میں چلی جاتی ہوں۔ مٹھو سے' کہو مجھے لے جائے۔"

"امی! خدا کے لیے ایسے مت کہیں۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کو چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ غصے میں پتہ نہیں کیا بکواس کر گیا۔" خرم نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے وہ خاموش رہیں۔

"آئیں' کمرے میں آئیں۔" وہ کندھوں سے تھام کر انہیں ان کے بیڈ روم میں لے گیا۔ انہیں چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ خرم نے فکر مندی سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"آپ لیٹیں۔ آپ کے لیے چائے لاتا ہوں۔" انہیں بیڈ پر لٹا کر اس نے کمبل ان کے اوپر ڈالا۔ وہ چائے اور ابلا انڈا لے کر آیا تو وہ منہ پر کمبل لیے پڑی تھیں۔

"امی! انڈا لیں۔" خرم نے انڈے کا ٹکڑا ان کی طرف بڑھایا۔

"نہیں۔ بس چائے پیوں گی۔ کچن میں کھانا پڑا ہے گرم کر کے کھا لو۔" خرم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کے چائے پینے تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ خالی کپ لے کر کچن میں آیا تو کھانا مختلف ڈبوں میں پڑا تھا۔

"یقیناً" میری سسرال سے آیا ہے۔" وہ زہر خند ہوا اور کسی چیز کو ہاتھ لگائے بغیر باہر نکل گیا۔



جاگنگ سے واپس آ کر اس نے غسل کیا اور تیار ہو کر باہر آ گیا۔ رفعت آج لان میں نہیں آئی تھیں' وہ تشویش سے ان کے کمرے میں آیا۔

"امی ابھی تک اٹھی کیوں نہیں۔" وہ انہیں بستر میں لیٹا دیکھ کر حیران ہوا۔

"امی۔ امی۔!" دو تین آوازیں دینے پر ان کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی خرم نے آگے بڑھ کر کمبل کا کونا سرکایا۔

"امی!" ان کا چہرہ بخار کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ بے سدھ پڑی تھیں۔ خرم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے "امی!" اس نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"اوہ میرے خدایا۔ امی! اٹھیں۔" وہ انہیں ہلانے لگا۔ انہوں نے بدقت تمام آنکھیں کھولیں' ان کی سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں۔

"تھوڑی سی ہمت کریں۔ اٹھیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔" انہیں سہارا دے کر اٹھانے لگا۔

"مٹھو کو فون کرو۔" بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ شدید پریشانی میں بھی خرم کا خون کھول اٹھا۔

"وہ مجھے دوا دے گا۔" وہ آہستگی سے کہہ رہی تھیں۔

"ہاں' وہ تو بڑا فزیشن ہے۔" خرم نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کچھ کہنے سے روکا۔ اور انہیں کندھوں سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے اتارا۔

"مٹھو مجھے چیک کرے گا پہلے بھی وہی دوا دیتا ہے۔" انہوں نے خرم کو سمجھانا چاہا' وہ نظرانداز کر کے انہیں کمرے سے باہر لے آیا۔



"امی! دوا سے پہلے کچھ کھانا ضروری ہے' آپ نے صبح ناشتہ نہیں کیا؟" خرم بریڈ سلائس' انڈا اور ہلکی سی پتی والی چائے ٹرے میں رکھے ان کے پاس بیٹھا تھا۔

"میرا دل نہیں کر رہا۔" وہ آنکھیں موندھے نڈھال سی لیٹی ہوئی تھیں۔

"میڈیسن لیے بغیر بخار کیسے اترے گا۔" خرم نے ٹرے بیڈ پر رکھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن ان کی پلکیں گیلی ہو رہی تھیں۔ خرم کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"امی پلیز ڈپریشن کی وجہ سے آپ کی طبیعت اتنی خراب ہوئی ہے۔ بلڈ پریشر بھی ہائی ہے آپ ٹینشن نہ لیں۔" وہ اپنی انگلیوں کے پوروں سے ان کے آنسو صاف کرنے لگا۔

"مٹھو کو فون کرو۔" وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولیں۔

"کیوں؟" خرم ٹھٹک گیا۔

"اس سے کہو مجھے لے جائے۔ میرا اصل ٹھکانہ وہی ہے۔ کچھ لوگوں کی زندگی ایسے ہی دربدری میں گزرتی ہے میں بے وقوف تھی' ساری عمر تپتی دھوپ میں بے سائبانی میں چلتے ہوئے سائبان کے خواب دیکھتی رہی۔" وہ بری طرح رونے لگیں۔

"میں ایسا کیا کروں۔ جس سے میری کہی ہوئی بات کی تلافی ہو سکے۔" خرم نے لاچاری سے ان کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں کہنیوں پر ہاتھ رکھ کر سر کو جھٹکے دینے لگیں۔ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ان کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ خرم بے حد پریشان ہو گیا۔

"امی لیٹ جائیں۔" وہ ان کے ہاتھ سہلانے لگا۔

"یہ لیں۔" بلڈ پریشر کی گولی اور پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھایا۔

"امی! اگر آپ اسی طرح بستر پہ پڑی رہیں تو شادی کی تیاری کون کرے گا۔ صرف چودہ دن رہ گئے ہیں۔" خرم نے یہ بات کس دل سے کہی تھی وہی جانتا تھا۔ لیکن ماں کی خاطر اس نے یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا امی جان نے آنکھیں کھول کر بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"سوچنا بھی مت خرم۔ کہ میں یہ مجبوری کا بندھن باندھنے کی حماقت کروں گی۔ میرے لیے اپنی زندگی کا تلخ تجربہ ہی کافی ہے۔ میں ایک اور رفعت پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے تو میری بہن اور اس کے بعد ان تینوں بچوں نے سہارا دیا۔ ضروری نہیں کہ گڈی کے لیے منی اور مٹھو کے پاس اتنی محبت اور گنجائش ہو۔" وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔ خرم پلکیں جھپکائے بنا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"گڈی کے لیے رشتے بہت' وہ کوئی ایسی گری پڑی نہیں کہ میں اس پر ظلم کرتی پھروں۔ مٹھو پہلے ہی ہچکچا رہا تھا۔ میں نے اپنی ممتا کا حوالہ دے کر اسے مطمئن کیا تھا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ ممتا بہت سستی ہے۔ میں نے گڈی اور مٹھو کی فرماں برداری دیکھی ہے اور میری بے وقوفی کہ سب کو ان جیسا سمجھتی رہی۔" وہ تھک کر خاموش ہو گئیں۔

"امی! میری شادی صرف گڈی سے ہو گی۔ میں اس سلسلے میں کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتا۔ میرے لیے سب سے بڑا یقین' سب سے بڑا تحفظ یہ ہے کہ

میں آپ کا بیٹا ہوں۔ مجھے آپ نے جنم دیا ہے' آپ کے دودھ کی تاثیر میری فطرت میں رچی ہوئی ہے۔ کیا اس سب کے باوجود میری طرف سے بے اعتبار ہیں۔" خرم بڑے گداز سے ان کی طرف متوجہ تھا۔

"محرومی اور تنہائی صرف آپ نے نہیں دیکھی امی! میں بھی اس دھوپ میں جلا ہوں۔ میں نے صرف ایک رشتے سے محروم ہو کر زندگی نہیں گزاری۔ میں ایک دنیا سے محروم ہو کر جیا ہوں۔ آپ کسی اور رفعت کو جنم لیتے نہیں دیکھ سکتیں تو میں بھی کوئی اور خرم پیدا نہیں کرنا چاہتا۔

میں گڈی کو پورے دل و دماغ کی آمادگی سے بیاہ کر لاؤں گا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر چلوں گا۔ پوری دیانت داری سے اپنے برابر جگہ دوں گا۔ اس کے باوجود آپ کو کوئی خدشہ ستائے تو میں سمجھوں گا' کمی مجھ میں ہے جو میں آپ کا اعتبار حاصل نہیں کر پایا۔"

وہ ان کے پاس بیٹھا ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے ان کے جواب کا منتظر تھا۔ ایک طویل عرصے بعد اس نے اس رشتے کی چاشنی پائی تھی۔ دوبارہ دور ہونے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا اور انہیں دکھی وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔



اگلے دن رفعت بیگم کو ڈاکٹر سے چیک کروا کر واپس آیا تو گیٹ کے باہر بلال کو گاڑی میں دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ بلال نے فون پر خالہ سے بات کی تھی' وہ انہیں لینے آیا تو گیٹ پر تالا دیکھ کر وہیں ان کا انتظار کرنے لگا۔

"میں خالہ کو لینے آیا ہوں۔" خرم سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

"ان کی طبیعت خراب ہے۔" خرم گیٹ کھول کر گاڑی اندر لے آیا۔

"کیوں کیا ہوا ان کو؟" بلال تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ خرم گاڑی کا دروازہ کھول کر انہیں باہر لا رہا تھا۔ بلال نے دوسری طرف سے سہارا دیا۔

"خالہ جان! کیا ہوا ہے۔ میں تو آپ کو بالکل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گیا تھا۔ اگر طبیعت خراب تھی تو مجھے بتایا ہوتا میں آجاتا۔" وہ فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔

"تم آکر کیا کر لیتے۔ علاج تو ڈاکٹر نے کرنا تھا اور میں انہیں مستند ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔" خرم نے چبا چبا کر کہا۔ بلال ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔

"مٹھو بھی بڑی اچھی دوائی دیتا ہے۔ یہ بھی ڈاکٹر ہے۔" خالہ نے کہا تو خرم نے استہزائیہ مسکراتے ہوئے بے یقینی سے سر جھٹکا۔

"میں نے خرم سے کہا تھا تمہیں بلائے۔ پہلے بھی تم ہی دوائی دیتے ہو۔ بلڈ پریشر کی' جوڑوں کے درد کی لیکن یہ مجھے کہیں اور لے گیا۔" بلال ان کی بات پر خاموش رہا۔

"امی! علاج ہمیشہ مستند ڈاکٹر سے کروانا چاہیے۔ ورنہ فائدے کے بجائے نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عام رواج ہے جو آدمی کسی ڈاکٹر کے پاس دو چار ماہ ہیلپر کے طور پر کام کرتا ہے۔ خود کو ڈاکٹر سمجھ کر دوسروں کی صحت سے کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔" بلال اس کے کھلے طنز پر بے تاثر رہا۔ وہ کسی ڈاکٹر کا ہیلپر یا کمپاؤنڈر نہیں تھا۔ بلکہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا۔

"پر مٹھو نے ڈاکٹری پڑھی ہے۔" رفعت نے بحث کی۔

"جی امی! ہومیو پیتھک کورسز ہوتے ہیں اس کے علاوہ پیرامیڈیکل اسٹاف بھی ٹریننگ وغیرہ لیتا ہے۔"

بلال کو اس کی غلط فہمی پر ہنسی آنے لگی۔ یقیناً خالہ جان کی شعلہ بیانی نے خرم کو غلط فہمی میں ڈال دیا تھا۔

"خالہ جان! آپ میرے ساتھ چل رہی ہیں یا نہیں۔" وہ بڑے خوشگوار موڈ میں بولا۔ اس نے خرم کی غلط فہمی دور کرنا ضروری نہ سمجھا۔

"امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کیسے جا سکتی ہیں۔" ان سے پہلے خرم بول پڑا۔

"نہیں۔ میں مٹھو کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ اب میں پہلے سے بہتر ہوں۔ مٹھو کی شادی میں تھوڑے

ان رہ گئے ہیں۔" انہوں نے دانستہ خرم کا نام نہیں لیا۔

"اور یہاں کون انتظامات کرے گا؟" رفعت بیگم فوراً" تازہ دم ہو گئیں۔

"بچیاں اکیلی تو نہیں کر سکتیں انہیں شادی کے معاملات کا کیا پتہ تمہاری بری ادھر ہی تیار ہو جائے گی بس چند دن کی بات ہے۔"

"اچھا کل چلی جائیے گا۔ ابھی آپ ٹھیک نہیں ہیں میں بینک سے رقم نکلوالوں گا۔ آپ شاپنگ کرلیجئے گا۔" بلال خالہ کی دواؤں کا جائزہ لے رہا تھا اس نے ایک گولی الگ کردی۔

"آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ یہ ٹیبلٹ آپ کے لیے مناسب نہیں" خرم نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔

"میں چلتا ہوں خالہ! مجھے اسپتال جانا ہے۔" بلال کے انداز پر وہ ہنسی ضبط کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا تھا اگر تم پہلے جا کر گڈی اور منی سے مل لیتے۔"

"آپ نے موقع ہی نہیں دیا۔ خیر دیکھ لوں گا۔" (اب تو ساری عمر دیکھنا ہے) وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

"شادی کے بعد مل لوں گا۔" وہ نیم دلی سے بولا۔



"امی نے ساری زندگی تنہا گزار دی۔ ابو کے ساتھ ان کی ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اب زبردستی بے جوڑ شادی کروا کر یہ ایک بار پھر وہی تاریخ دہرانا چاہ رہی ہیں۔" ذہن میں ابھرتی سوچ پر وہ لمحہ بھر کو حیران رہ گیا۔ پھر جی بھر کر شرمندہ ہوا۔

"سادگی یا کم تعلیم یافتہ ہونا کوئی عیب نہیں۔ نا ہی ایسا جرم جس کی بنا پر کسی کی زندگی برباد کی جاسکے۔" اس نے سختی سے خود کو سرزنش کی۔

"میں اپنے پاپا کے نقش قدم پر نہیں چلوں گا بلکہ پورے خلوص نیت سے اس رشتے کو نبھاؤں گا۔ اگر وہ میرے ساتھ نہ چل سکی تو میں ہاتھ پکڑ کر اسے چلنا سکھاؤں گا۔ وہ محرومیاں جو میری امی نے دیکھیں وہ کسی گڈی کو میری وجہ سے نہیں دیکھنی پڑیں گی۔ جو محرومیاں میں نے دیکھیں وہ کسی اور خرم کو نہیں دیکھنی پڑیں گی۔ کوئی اور خرم میری طرح بروکن فیملی کا فرد نہیں بنے گا۔"

گڈی عرف حسنہ اکرام کو تین بار نکاح میں قبول کرنے کے بعد اس نے اپنے دل میں عہد کیا تھا۔ اسٹیج پر خرم کے ننھیالی عزیز رشتہ دار جمع تھے۔ وہ ان چند دنوں میں کچھ سے مل سکا تھا اور کچھ سے آج مل رہا تھا۔ اس کی شادی پر وہ سب ایسے پرجوش تھے جیسے برسوں کی سنگت اور یارانہ ہو۔ شادی ہال میں گہما گہمی عروج پر تھی۔ اس نے ہال میں ادھر ادھر چلتی ہوئی رفعت بیگم کو دیکھا۔ گرے اور پنک لباس میں وہ بہت گریس فل لگ رہی تھیں۔ چہرے پر چمکتی مسکراہٹ اور آسودگی نے چہرے کے نقوش کو اجال دیا تھا۔

"آج سے بیس سال پہلے یہ چہرہ کتنا تابناک ہو گا۔ ان کے کردار کی خوبصورتی' ان کا حسن سلیقہ' کچھ بھی ان کے کام نہ آسکا۔" اس کے دل میں درد پھیلنے لگا۔

"ان کی زندگی دوسرے کے سہارے گزر گئی اور میری بھی۔" اس کی آنکھوں میں خنکی چبھنے لگی۔ تبھی ہال میں کچھ ہلچل سی محسوس ہونے لگی۔

دولہن کو اسٹیج پر لایا جا رہا تھا ابھی سلامی اور دوسری تمام رسمیں باقی تھیں۔ رفعت کچھ پریشان سی نظر آئیں۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر ان کے قریب آگیا۔

"کیا بات ہے امی؟"

"پتہ نہیں بم دھماکوں کی افواہ ہے شاید کہیں دھماکہ خیز مواد پکڑا گیا ہے۔ اچھرہ اور انار کلی سے۔ شہر میں افراتفری ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ فنکشن فوراً" ختم کرنے کا کہہ رہی ہے۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں' اس لیے کوئی رسک نہیں لیا جاسکتا۔ بلال بھائی کو ہسپتال کال کرلیا گیا ہے وہ بھی چلے گئے ہیں۔"

امی کے بجائے پاس کھڑی منیزہ نے تفصیل سے جواب دیا۔ خرم الجھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

پتہ نہیں کوئی کزن تھی یا۔ اسے یاد نہیں آسکا۔

"آپ کون ہیں اور کس بلال کی بات کررہی ہیں۔" خرم اس خوش لباس لڑکی سے پوچھنے لگا۔ پریشانی جس کے چہرے سے مترشح تھی۔ منیزہ بری طرح شرمندہ ہوگئی۔

"خرم! یہ منی ہے گڈی کی بہن اور تمہیں مٹھو کا نہیں پتہ۔ کتنی بار تو اس سے ملے ہو وہ ڈاکٹر ہے نا اسے اسپتال سے فون آگیا۔ ایمرجنسی لگ گئی ہے اسپتال میں چلا گیا۔ بیچارا بہن کو رخصت بھی نہ کرسکا۔"

"اوہ سوری۔ اصل میں امی بلال کو مٹھو کہتی ہیں اس لیے مجھے پتہ نہیں چل سکا اور آپ سے تو میں پہلی بار مل رہا ہوں۔" خرم نے معذرت کرتے ہوئے اس کا اپنائیت سے کندھا تھپتھپایا۔

"امی تو بتاتی تھیں۔ منی اسکول میں پڑھتی ہے۔ یہ منی اتنی بھی منی نہیں۔" خرم منیزہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ کر رہ گیا۔

"آپا! رخصتی کروالیں۔ سارے مہمان جا رہے ہیں۔" خرم کے بڑے ماموں، رفعت بیگم کے پاس چلے آئے۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔ شکر ہے مہمانوں نے کھانا کھالیا ہے۔"

"منیزہ! حسنہ کو پارکنگ میں لاؤ۔ جلدی کرو تم سب۔" ماموں تیزی سے کہتے ہوئے باہر کی طرف چلے گئے۔

"خرم! گاڑی نکالو، ہم حسنہ کو لاتے ہیں۔" خرم سے کہتے ہوئے رفعت منیزہ کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھیں۔

ان کے ساتھ چند قریبی رشتہ دار خواتین تھیں۔ ہال تیزی سے خالی ہوگیا تھا۔ اسی بھاگ دوڑ میں رخصتی ہوگئی۔ شادی کی تقریبات والا روایتی جوش و خروش اور ہنگامہ عنقا تھا۔ سب ہی ایک بے چینی اور جلد بازی کی لپیٹ میں تھے۔ حسنہ کے ساتھ گاڑی میں منیزہ اور کوئی اور لڑکی تھی۔ ڈرائیور کے فرائض خرم کا کوئی خالہ زاد یا پھر ماموں زاد انجام دے رہا تھا۔ باقی مہمان بھی اسی طرح کچھ اپنی گاڑیوں میں کچھ بارات کے لیے ہائیر کی گئی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تھے۔



گہرے سرخ رنگ کے عروسی لباس، جس پر سلور اور سرخ امتزاج کا نفیس کام تھا۔ اسی امتزاج کے جدید انداز کے زیورات جن میں خوبصورت پتھر جڑے ہوئے تھے۔ نرم و نازک ہاتھوں اور بازوؤں پر حنا کا گہرا رنگ (خالہ کی محبت) کلائیوں میں مہکتے گجرے، ایک کلائی میں طلائی اور دوسری میں کانچ کی چوڑیاں پہنے پور پور سجی گڈی پر کسی گڑیا کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت حسین تھی یا پھر مشاطہ کے ہنرمند ہاتھوں کا کمال تھا۔

خرم چند لمحوں کے لیے منظر کی دلکشی میں ڈوب گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ آج کل کے زمانے میں بھی بہت سارے لڑکے لڑکیاں ایسے ہوں گے جو شادی کے دن اپنی دلہن یا دولہا کو دیکھتے ہوں گے لیکن سگے خالہ زاد ہونے کے باوجود ایسا اتفاق ایسا بہت کم ہوتا ہوگا۔" خرم نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

"میں تمہیں دیکھ چکا ہوں۔ اب تم بھی مجھے دیکھ لو۔ تاکہ یہ سرپرائز اختتام پذیر ہو۔" خرم نے اس کا جھکا ہوا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اوپر کیا۔

"کم آن۔" اس کی جھکی پلکیں دیکھ کر اس نے اصرار کیا۔ حسنہ نے لرزتی ہوئی پلکیں ایک لحظے کے لیے اٹھائیں اور دوبارہ چہرہ جھکالیا۔

وہ خرم کی گہری نگاہوں اور رنگ بدلتی آنکھوں کا سامنا نہیں کرپائی۔ خرم نے جیب سے انگوٹھی نکال کر اسے پہنائی اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کے ہاتھ پر بنے مہندی کے نقش و نگار بڑے غور سے دیکھنے لگا۔



خرم کی آنکھ کھلی تو حسنہ بال بکھرائے صوفے پر بیٹھی ہاتھوں پر مساج کررہی تھی اسے اٹھتا دیکھ کر اس نے دھیرے سے سلام کیا۔ وہ سر کے اشارے سے جواب دیتا ہوا اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ جب تک وہ کمرے میں آیا۔ حسنہ کی کزنز، چچیاں ممانیاں وغیرہ

کمرے میں آچکی تھیں۔

وہ بالوں میں برش کیے بغیر انگلیوں سے بال سنوارتا باہر نکل گیا۔ اس کے اس طرح چلے جانے پر خواتین میں نظروں کا تبادلہ ہوا حسنہ یہ سب محسوس کر کے خفیف سی بیٹھی تھی کمرے میں معنی خیز خاموشی پھیل گئی۔

"چلیں بھئی آپ سب کمرہ خالی کریں میری بیٹی کو ناشتہ کرنے دیں۔" خالہ جان ناشتے کے لوازمات سجانے آئیں تو حسنہ نے پرسکون ہو کر نشست بدلی خالہ جان کی آمد بڑے اچھے وقت پر ہوئی تھی۔ صورت حال عجیب و غریب ہونے سے پہلے ہی بدل گئی۔

"میں خرم کو بھیجتی ہوں۔ تم ناشتہ کر کے تیار ہو جاؤ۔ ولیمہ کی تقریب مٹھو اور خرم کی اکٹھی ہو گی۔ لیکن تم تو نئی نویلی دلہن ہو۔" وہ بڑی چاہت سے اس کے پاس بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔

حسنہ سر پر دوپٹہ لیے مؤدب بیٹھی تھی۔ اسے خالہ جان سے عجیب سی شرم آرہی تھی۔ کل تک وہ ان کی بھی تھی اور آج بہو بنی ناز اٹھوا رہی تھی' خالہ جان اس کا شرمیلا روپ دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے خرم کو بلانے چلیں گئیں۔

خرم کمرے میں آیا تو حسنہ نے ابھی ناشتہ شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے آنے پر بھی منتظر بیٹھی تھی کہ خرم پہلے ناشتہ شروع کرے۔ خرم نے کچھ کہے بغیر سلائس پر مکھن لگایا اور پلیٹ میں فرائی انڈا نکال کر کھانے لگا۔ حسنہ نے اپنے لیے چائے کپ میں ڈالی اور آملیٹ کے پیس کانٹے کی مدد سے کھانے لگی اسے خرم کی خاموشی الجھا رہی تھی' خرم بڑی باریک بینی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بڑی مہارت اور نفاست سے کانٹا اور چھری استعمال کرتے ہوئے بریڈ سلائس اور آملیٹ کھا رہی تھی۔ خرم کی گمبھیر خاموشی اور خود پر جمی نگاہوں سے نروس ہو کر حسنہ نے بہت جلد ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا وہ جلدی جلدی چائے ختم کرنے لگی جبکہ خرم بڑے اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا۔

"شکل و صورت بھی اچھی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ سلیقہ بھی۔ اتنی کم تعلیم یافتہ لگتی تو نہیں جس طرح کی جاب کرتی رہی ہے۔" خرم مسلسل اندازے لگانے میں مصروف تھا۔

"تم یہ کلر آئندہ مت پہننا' مجھے اچھا نہیں لگتا۔" ناشتے سے فارغ ہو کر خرم نے قطعی غیر متوقع بات کی تھی' حسنہ حیران پریشان پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے برائٹ کلر اچھے نہیں لگتے۔" خرم نے اس کے شاکنگ پنک سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ حسنہ کی سفید رنگت پر یہ رنگ بہت بچ رہا تھا۔ لیکن خرم کی تنقید اور تبصرہ اس کا دل بوجھل ہونے لگا۔ خرم کا رویہ اس کے ساتھ بہت لیا دیا سا تھا اور شادی کے محض ایک دن بعد ناپسندیدگی کا پہلا اظہار۔

"میں آئندہ خیال رکھوں گی۔" اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"بلال کی شادی کے سلسلے میں سب ریلیٹوز تمہارے گھر جا رہے ہیں میرا مطلب ہے تمہارے میکے۔ ظاہر ہے امی بھی جائیں گی۔ شادی بہت اچانک طے ہوئی تھی۔ میں جاب کے سلسلے میں کچھ مصروف تھا' درمیان میں یہ سب شروع ہو گیا۔ "مجھے جاب کے لیے ایک دو جگہ جانا ہے۔ تم امی کے ساتھ چلی جانا۔ میں شام کو تمہیں لینے آجاؤں گا۔"

"لیکن رات کو بلال کی مہندی کا فنکشن ہو گا۔" حسنہ نے بے ساختہ اس کی بات قطع کی۔

"اوہ۔ اوہ۔" پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگا۔

"ٹھیک ہے میں شام کو وہیں آجاؤں گا۔" وہ بیڈ سائیڈ کی دراز کھول کر کچھ نکالنے لگا۔ حسنہ کو اس کے انداز اور رویہ چونکا رہے تھے۔ اتنی سنجیدگی اور رسمی رویہ۔ چہرے پر خوشی سرشاری اس نئے بندھن کے حوالے سے کوئی انوکھا احساس نہ تھا جیسے مجبوراً" مارے باندھے اس رشتے کو نبھا رہا ہو۔

"مجبوری۔" حسنہ کانپ اٹھی۔ "کہیں خالہ نے

زبردستی تو خرم کی شادی میرے ساتھ نہیں کروادی۔“
اسے آناً فاناً شادی کی تاریخ رکھنا یاد آیا۔

”یا اللہ۔ یہ کیا کردیا آپ نے خالہ۔!“ وہ اپنی پریشان کن سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ اضطراب نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خرم جاچکا تھا۔

حسنہ نے بے دلی سے اٹھ کر ضروری چیزیں بیگ میں رکھیں، دو تین دن اسے وہیں رہنا تھا، پچھلے دو دن سے سارے مہمان خالہ جان کے گھر میں جمع تھے۔ خرم کی شادی میں شرکت کے لیے خود منیزہ بھی بارات کے ساتھ واپسی پر یہیں آئی تھی۔ اب تمام مہمانوں کو بلال کی شادی کے لیے ان کے گھر جانا تھا۔ مہمانوں میں زیادہ تر لڑکے اور لڑکیاں ہی تھے جو بے فکری سے شادی کے ملے گلے سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ یا پھر ایسے مرد و خواتین جو بغیر کسی دقت کے ایک آدھ ہفتہ گھر سے باہر گزار سکتے تھے۔ باقی لوگ مہندی کے فنکشن میں آئے تھے یا بارات کے ساتھ شادی ہال میں اور وہاں سے سیدھے اپنے گھروں کو۔

مہندی کی رسم کے لیے تیاریاں عروج پر تھیں۔ ہر کوئی بڑا مصروف تھا، لڑکے صحن میں اسٹیج سیٹ کررہے تھے۔ لڑکیاں اپنی آرائش و زیبائش کے معاملے میں بوکھلائی ہوئی تھیں۔ مہندی کے تھال سجاتے ہوئے حسنہ اندر اندر فکرمند ہورہی تھی رات گہری ہورہی تھی اور خرم ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک بار فون کیا تو خرم نے ریسیو نہیں کیا۔

لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر زور و شور سے گلے پھاڑ کر گارہی تھیں۔ خالہ ان سب کے ساتھ مصروف تھیں۔ شکر ہے انہیں خرم کا خیال نہیں آیا تھا ورنہ بات سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ اس کی نظریں بلا ارادہ بار بار کبھی دروازے کی طرف اٹھتیں اور کبھی گھڑی کی طرف۔

”آپی! کھانا اپنے کمرے میں لے جائیں، خرم بھائی وہیں بیٹھے ہیں۔“ وہ کچن میں چائے بنارہی تھی۔ جب منیزہ جلدی جلدی کہتی ہوئی واپس پلٹ گئی وہ ڈھولک سے اٹھ کر آئی تھی، حسنہ کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں اس نے تیزی سے کھانا گرم کیا۔ چائے بنانے کی ذمہ داری کسی اور پر ڈالی اور کھانا لے کر اپنے اور عنیزہ کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔

بیڈ پر الٹے سیدھے کئی بچے سورہے تھے۔ کارپٹ پر کپڑوں کے بیگ اور کپڑے جوتے بکھرے ہوئے تھے۔ لڑکیاں تیار ہو کر چیزیں سمیٹے بغیر کمرے کو اسی ابتر حالت میں چھوڑ کر باہر چلی گئی تھیں۔ حسنہ کمرے کی حالت دیکھ کر شرمندہ ہوگئی۔

خرم صوفے کے ایک کونے پر کپڑوں کا ڈھیر ہٹا کر بڑے پُرتکلف انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن اور اکتاہٹ کے تاثرات تھے۔ حسنہ نے ٹرے کارپٹ پر رکھ کر میز خالی کی اور کھانا اس پر رکھ کر صوفے پر سے کپڑے ہٹانے لگی۔ خرم جب کھانا کھانے لگا تو اس دوران وہ کپڑے وغیرہ سمیٹ کر کافی حد تک کمرہ درست کرچکی تھی۔

بچے نیند میں ٹانگیں بازو چلاتے ہوئے کمبل ہٹا کر ویسے ہی سورہے تھے۔ حسنہ نے بیڈ سے نیچے لٹکتا کمبل اٹھا کر بچوں پر ڈالا۔

”چائے لاؤں آپ کے لیے؟“ خرم کھانا ختم کرچکا تو حسنہ نے خاموشی کو توڑا۔

”نہیں چائے پی لی تو نیند نہیں آئے گی۔“

”آپ فریش ہو کر کپڑے بدل لیں باہر سب آپ کا انتظار کررہے ہیں۔“

حسنہ نے الماری میں سے نیوی بلیو کرتا شلوار نکال کر اس کی طرف بڑھایا وہ اس کی نیند والی بات کو نظرانداز کرگئی۔

”میں بہت تھکا ہوا ہوں اور مجھے سخت نیند آرہی ہے، مجھے پُرسکون سا بستر دو۔ اگر یہاں جگہ نہیں تو میں گھر چلا جاتا ہوں۔“ ہر طرف شور شرابا اسے کوفت میں مبتلا کررہے تھے، پچھلے کئی دنوں سے یہی سلسلہ تھا اور آج اس کا اپنا گھر بالکل پُرسکون تھا لیکن اسے یہاں آنا پڑا۔“

لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں مردوں کے بستر تھے۔ جبکہ باقی دو کمروں جن میں سے ایک خالہ کا تھا، خواتین

جمایا ہوا تھا۔ منیزہ اور اس کے مشترکہ کمرے میں بچے اور لڑکیاں براجمان تھیں' صرف بلال کا بیڈ روم خالی تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اسے منیزہ بلال کے کمرے میں لے آئی۔

بلال کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ اوپر موجود دوسرے کمرے میں خالائیں' چچیاں اور اسی قبیل کی دوسری خواتین قیام پذیر تھیں' اس لیے شور ہونے کا کوئی خدشہ نہ تھا۔

بلال کا کمرہ دیکھ کر خرم کو حیرت ہوئی۔ باقی گھر میں بے ترتیبی تھی فرنیچر کو اوپر تلے رکھ کر صوفے دیواروں کے ساتھ لگا کر جگہ بنائی گئی تھی۔ بلال کا کمرہ صاف ستھرا اور خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔

ہلکے نیلے اور گہرے نیلے رنگ کا فرنیچر' اسی رنگ سے ملتے جلتے پردے اور دیواروں کا رنگ تھا۔ کشادہ کمرے میں ایک طرف بڑی ساری میز پر کمپیوٹر اور ریک کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دیوار میں بنی ہوئی الماری چار خانوں پر مشتمل تھی۔ ملحقہ باتھ روم روم فریج۔ ایر کنڈیشنر ہر طرح کی سہولت کمرے میں موجود تھی۔

"ڈاکٹر صاحب خود تو بڑے عیش سے رہ رہے ہیں' ساری کسر بہنوں پر نکال دی۔" کمرے کا مکمل جائزہ لے کر خرم نے سوچا۔

حسنہ نے کھڑکی بند کر کے پردے اچھی طرح برابر کردیے۔ نیچے صحن سے آتی ہوئی آوازیں قدرے کم ہوگئیں۔ "آپ یہاں سوجائیں' نیچے کوئی کمرہ خالی نہیں ہے ویسے بھی یہاں شور کم سنائی دے رہا ہے' اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتادیں۔" حسنہ نے اپنی طرف سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"یہ آپ کے کپڑے۔" اس نے بادامی رنگ کا آرام دہ کرتا شلوار اسے دیا۔ خرم نے نظر بھر کر حسنہ کی طرف دیکھا۔ رائل بلیو شیفون کی ساڑھی میں ہلکے سے زیور' بالوں کو آدھا باندھے اور میک اپ کے ساتھ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ خرم کا جی چاہا اسے یہیں روک لے۔

"اٹس اوکے۔" وہ کپڑے لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ حسنہ جلدی سے نیچے آئی۔ صحن میں خوب رونق لگی تھی۔

"حسنہ چائے نہیں آئی۔" اسے دیکھتے ہی چچی شاہدہ کو چائے یاد آئی۔

"میں نے عقیلہ سے کہا تھا' سب کو چائے دے دے۔" وہ عقیلہ کی طرف مڑی۔

"چائے ابھی نہیں بنی تھی۔ میں نے چولہا بند کردیا تھا۔"

عقیلہ نے گانا روک کر اسے جواب دیا اور دوبارہ فل آواز میں گانے لگی۔ صفیہ (ملازمہ) بھی بڑے شوق سے تالیاں بجارہی تھی۔ کچھ کہنا بیکار تھا وہ سر جھٹک کر کچن میں چلی گئی۔ چائے لے کر وہ باہر آئی تو مہندی کی رسم شروع ہوچکی تھی۔

"خرم کہاں ہے؟"

"دولہا بھائی کہاں ہیں۔؟"

"خرم بھائی کو بلاؤ' سالے کو مہندی لگائیں۔" کئی طرف سے آوازیں آئیں۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' وہ آرام کررہے ہیں۔" سب کو وضاحتیں دیتے دیتے وہ تھکنے لگی۔

"آپ نے انتہائی ابتدائی مرحلوں میں میرے سامنے کئی سوالیہ نشان کھڑے کردیے ہیں۔ آگے آگے کیا ہوگا۔" وہ افسردگی سے سوچ رہی تھی۔



بلال کی شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو حسنہ' خالہ کے ساتھ واپس آگئی فاریہ اور منیزہ میں بہت دوستی تھی۔ بلال ویسے بھی دونوں بہنوں کے معاملے میں بہت کیئرنگ تھا' اس لیے حسنہ' منیزہ کی طرف سے بے فکر تھی۔

"خرم! تم حسنہ کو کہیں گھمانے پھرانے لے جاؤ' شادی کے بعد سارے لوگ سیر کے لیے جاتے ہیں۔"

"میں منڈے سے آفس جوائن کررہا ہوں' اس لیے فی الحال تو کہیں آنے جانے کی گنجائش نہیں

ہے۔"

حسنہ خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ خرم جواب امی کو دے رہا تھا اور در پردہ سنا حسنہ کو رہا تھا۔ وہ سب سمجھ رہی تھی۔ خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور صبح پہننے کے لیے کپڑے منتخب کرنے لگی۔ کالج جانے کے لیے تیاری کر کے وہ میگزین دیکھنے لگی جب خرم کمرے میں آیا۔

"میری کافی چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے میں صبح سے اپنی جاب جوائن کرلوں۔" حسنہ نے بلا تمہید بات کا آغاز کیا۔

"تمہیں اب کسی قسم کی جاب کرنے کی ضرورت نہیں' میری جاب اس گھر کو چلانے کے لیے کافی ہے تم گھر میں بیٹھو۔"

"لیکن شادی سے پہلے میری خالہ جان سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں اپنی جاب جاری رکھ سکتی ہوں۔"

"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو جب سارا معاملہ خالہ کے ساتھ طے کیا ہوا ہے۔" وہ تپ اٹھا۔ حسنہ کو اس کی تنگ نظری پر حیرت ہوئی۔

"میں گھر کو مینیج کرلوں گی۔ آپ اس سلسلے میں فکر مند نہ ہوں۔"

وہ سمجھی شاید خرم اس وجہ سے جاب کے خلاف ہے' خرم نے ناگواری سے سر جھٹکا۔ شادی سے پہلے وہ جو بھی کرتی تھی خرم کو اب ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ لوگوں کے کپڑے سلائی کرے یا لڑکیوں کو گھر میں بلا کر سلائی کڑھائی سکھائے۔

"میں صبح امی سے بات کروں گا۔ پہلے کام کرنا اس کی مجبوری تھی' اب کیا مسئلہ ہے وہ مصمم ارادہ کرے بستر پر دراز ہو گیا۔

"خرم صاحب! سمجھوتے کی گاڑی اگر چلتی رہے تو ساری عمر بھی گزر سکتی ہے اگر رکنے پر آئے تو آغاز سفر پر بھی رک سکتی ہے کیونکہ سمجھوتے کی گاڑی محبت کے ایندھن کے بغیر محو سفر ہوتی ہے یہ جاب میری فنانشل سیکورٹی ہے میں جاب چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتی۔ کون جانے کس موڑ پر مجھے خالہ جان کی طرح تنہا چلنا پڑ جائے۔" خرم کا سرد اور اکھڑ رویہ اسے بہت سارے خدشات میں مبتلا کر رہا تھا۔

"میں صبح خالہ جان سے بات کروں گی وہ خرم کو سمجھائیں۔" اندیشوں کے سرسراتے سائے میں وہ چلتی ہوئی لان میں چلی گئی۔

"بلال! تم گھر پر ہو۔؟" کرسی پر بیٹھ کر اس نے بڑے محتاط انداز میں بلال سے بات کی۔

"بلال! تمہارے پاس اپنی گاڑی ہے' منیزہ یونیورسٹی کنوینس استعمال کرتی ہے اگر میں اپنی گاڑی یہاں لے آؤں۔"

"دراصل مجھے کالج آنے جانے میں دشواری ہوگی۔ خرم کی نئی نئی جاب ہے' ان کی ٹائمنگ وغیرہ کا مسئلہ۔ میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہ رہی۔"

"ہاں میں بھی یہی کہہ رہی تھی' ٹھیک ہے اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو گاڑی یہاں چھوڑ جاؤ۔ میں صبح سے کالج جوائن کر رہی ہوں۔"

بلال سے بات کر کے وہ پرسکون ہو گئی۔ بلال کے ڈیوٹی کے اوقات بدلتے رہتے تھے' اس کے آنے جانے کا وقت مقرر نہیں تھا' اس لیے کالج میں لیکچرر شپ ملنے کے بعد حسنہ نے بڑی اچھی حالت میں سیکنڈ ہینڈ سوزوکی خرید لی تھی۔ وہ بڑی سہولت سے خود بھی کالج جاتی اور بوقت ضرورت منیزہ کو بھی چھوڑ دیتی منیزہ عام طور پر یونیورسٹی پوائنٹ ہی استعمال کرتی تھی' وہ وہیں بیٹھ کر بلال کا انتظار کرنے لگی' خالہ اور خرم دونوں سو چکے تھے۔

بلال کے ساتھ منیزہ اور فاریہ بھی آئی تھیں۔ حسنہ کا موڈ ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوشگوار ہو گیا۔

"میں نے سوچا' واپسی پہ لوکل بسوں پر خوار ہوتا پھروں گا اس لیے ان لوگوں کو ساتھ لے آیا۔" منیزہ کو ڈرائیونگ نہیں آتی تھی فاریہ دوسری گاڑی ڈرائیو کرکے آئی تھی' وہ باتیں کرتے ہوئے وہیں لان میں بیٹھ گئے۔

"یہاں کافی سردی ہے' چلو اندر چلیں۔" حسنہ نے

ان کو ٹوکا۔

"نہیں اچھا لگ رہا ہے۔ دھیمی دھیمی روشنی' ہلکی ہلکی سردی اور خاموشی۔" کتنا رومانٹک سا ماحول ہے' منیزہ خوابناک لہجے میں بولی وہ تینوں ہنسنے لگے۔

"خالہ اور خرم کہاں ہیں؟" بلال نے پوچھا۔

"وہ سو گئے ہیں میں نے ان کو تم لوگوں کے آنے کا نہیں بتایا تھا اس لیے یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرنے لگی۔ آؤ تم سب لاؤنج میں بیٹھو' میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔"

"چائے نہیں آئس کریم' چلو آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔"

"نہیں منیزہ! خالہ اور خرم سو رہے ہیں۔ انہیں بتائے بغیر چلی گئی تو وہ پریشان ہو جائیں گے۔"

"بلال! آپ آئس کریم لے آئیں ہم یہاں بیٹھ کر انجوائے کریں گے۔" فاریہ نے تجویز دی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے تم باتیں کرو میں یوں گیا اور یوں آیا۔" بلال جیب سے چابیاں نکال کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے یا تو تم لوگ اندر چلو یا پھر میں شال لے آتی ہوں۔ پہلی بار فاریہ میرے گھر آئی ہے اور یونہی بیٹھی ہے۔ تم نے کچھ کھلانے پلانے بھی نہیں دیا۔" حسنہ بازو سینے پر لپیٹے منیزہ سے کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

"بلال آتے ہیں تو انہیں آئس کریم کے پیسے دے دینا۔ اندر سے شال لے آؤ اور ساتھ ہی کولڈ ڈرنکس بھی۔" فاریہ خوشگوار انداز میں بولی۔

"یعنی تم لوگوں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ یہیں لان میں بیٹھنا ہے۔"

"لان میں بیٹھ کر کھانے کے لیے آئس کریم منگوائی ہے' اب یہاں نہ بیٹھیں تو کیا کریں۔" منیزہ نے ہاتھ پھیلائے۔

"لان بہت اچھا لگ رہا ہے' لگتا ہے خرم بھائی کو گارڈننگ کا شوق ہے۔" فاریہ نے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے تعریف کی۔

"جی نہیں' یہ سب ہماری اپی کی فنکارانہ صلاحیتوں کا کمال ہے۔ انہیں شاید پتہ تھا کہ مستقبل قریب میں اس گھر میں شفٹ کرنے والی ہیں اس لیے انہوں نے بڑی جانفشانی سے گھر کو سجایا سنوارا تھا۔"

منیزہ کے لہجے میں بلا کی شرارت تھی۔ فاریہ بے ساختہ ہنسنے لگی جبکہ حسنہ مسکراہٹ دباتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔



ناشتہ بنا کر میز پر رکھا اور وہ خود اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کپڑے بدل کر وہ ناشتے کی میز پر پہنچی تو خالہ اور خرم ناشتہ کر رہے تھے خرم نے تیکھی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ گہرے سبز رنگ کا کھدر کا سوٹ' کندھے پر بیگ ڈالے وہ بڑی تیزی سے ناشتہ کر رہی تھی۔

"میں جا رہی ہوں اللہ حافظ۔" وہ کسی کو بالخصوص مخاطب کیے بغیر الوداعی کلمات کہتی ہوئی جانے لگی۔

"گڈی! اب تم شادی شدہ ہو۔ ذرا تیار شیار ہو کر جاؤ جیسے پہلے جاتی تھیں ویسے ہی چل پڑی ہو۔" خالہ جان نے تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ہلکی سبز شال اوڑھے صاف ستھرا چہرہ کسی قسم کی آرائش سے مبرا تھا۔ بائیں ہاتھ میں سفید پتھر جڑی انگوٹھی اور کلائی میں دو طلائی چوڑیاں تھیں۔

"خالہ جان! آج دیر ہو گئی ہے' کل سے تیار ہو کر جاؤں گی۔"

وہ بہ عجلت انہیں ٹالتی ہوئی باہر نکل گئی۔ خرم شدید غصے کی لپیٹ میں آ گیا حسنہ نے رسمی طور پر بھی اس سے یہ کہنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ اسے ڈراپ کر دے۔ اب رکشوں' بسوں میں دھکے کھاتی پھرے گی۔ وہ برہم سا غصے میں بل کھاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔

گیراج میں گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی۔ وہ حیران ہو کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ صبح جاگنگ کے لیے جاتے ہوئے اس نے گیراج میں کالی سوزوکی دیکھی تھی حسنہ وہی سوزوکی ڈرائیو کرتی ہوئی جا چکی

تھی۔ وہ ساکت کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

"امی! آپ حسنہ کو منع کردیں کہ وہ کام چھوڑ دے' مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ تن فن کرتا امی کے پاس آیا۔

"کیوں تمہیں کیا تکلیف ہے؟" وہ کڑے تیوروں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"مجھے پسند نہیں ہے۔" خرم کا لہجہ بے لچک اور دو ٹوک تھا۔

"اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے' اتنی اچھی نوکری ہے اس کی۔ تم کیوں منع کررہے ہو۔" وہ اچھنبے سے اسے دیکھنے لگیں۔

"ہاں بہت اچھی۔ گھر گھر جاکر کپڑے اکٹھے کرنا اور سینا۔ ایسی کون سی مجبوری ہے' کون سی ضرورتوں کے لالے پڑے ہیں جو وہ محنت مشقت کرے۔" خرم ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

"تم سے کس نے کہا کہ وہ لوگوں کے کپڑے سیتی ہے؟"

"کیا آپ نے نہیں بتایا تھا کہ لڑکیوں کو کڑھائی سلائی سکھاتی ہے جب بھی ہم ان کے گھر گئے وہ گھر پہ نہیں ہوتی تھی۔ ہر بار کسی نہ کسی کے گھر گئی ہوتی تھی۔" خرم نے انہیں یاد دلایا۔

"اوئے ہوئے تو یہ میں نے کب کہا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نوکری کرتی ہے اور لڑکیوں کو کھانا پکانا' کپڑے سینا اور ڈیزائن بنانا پھول پودے تصویریں اور پتا نہیں کیا کچھ سکھاتی ہے' وہ جو کتابیں پڑھ کر بنتی ہیں۔" وہ ذہن پر زور دے کر یاد کرنے لگیں۔ "گھر جاؤ تو دیکھنا پورا گھر گڈی کی بنائی ہوئی چیزوں سے سجا ہے صوفوں پر رکھی گدیاں' دیواروں پر تصویریں' نقلی پھول پودے اور بھی بڑا کچھ' وہ تفصیل سے بتانے لگیں۔

"یہ سارے کام سیکھ لیے تو دو چار کلاسیں کالج میں بھی پڑھ لیتی۔" خرم جل کر بولا۔

"ارے گڈی نے بڑی جماعتیں پاس کی ہیں۔ اسکول میں اتنی بڑی بڑی لڑکیوں کو پڑھاتی ہے یہ سارے کام اس نے پڑھائی کے ساتھ سیکھے تھے۔ گڈی بڑی لائق بچی ہے۔"

"کیا حسنہ اسکول میں ٹیچنگ کرتی ہے؟" اس انکشاف پر خرم کو جھٹکا لگا۔

"ہاں "وہی" کرتی ہے۔ شام کو بچیاں باقی چیزیں سیکھتی تھیں وہ کیا کہتے ہیں کورس سیکھتی تھیں۔"

"اف میں کتنا نادان ہوں۔ امی کی اصطلاحات سے خود ہی سارا کچھ اخذ کر بیٹھا۔" خرم نے افسوس سے سر ہلایا۔

"امی کا مٹھو بھی سچ مچ کا ڈاکٹر نکلا اور یہ گڈی عرف حسنہ اکرام اوہ۔ نہیں حسنہ خرم درزن کے بجائے ٹیچر اور ڈیزائنر ہے' اب منی رہ گئی ہے وہ بھی پتہ نہیں اسکول پڑھنے جاتی ہے یا پڑھانے۔" وہ سوچ کر رہ گیا۔

"امی بتا رہی تھیں تم اسکول میں پڑھاتی ہو گورنمنٹ جاب ہے یا پرائیویٹ۔" حسنہ کالج سے آکر دوپہر کا کھانا کھا رہی تھی۔ جب خرم نے بظاہر سرسری سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔ حسنہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی۔

"اسکول میں نہیں میں گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہوں۔" وہ دوبارہ کھانا کھانے لگی۔

"سبجیکٹ کون سا ہے؟"

"اکنامکس۔" وہ مختصراً" بولی۔

"منیزہ اسکول میں پڑھاتی ہے؟" خرم نے ساری الجھنیں دور کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"وہ یونیورسٹی میں اپلائیڈ فزکس میں ماسٹرز کررہی ہے؟" حسنہ کو اندازہ ہوگیا کہ خالہ نے خرم کو الٹا سیدھا بتایا ہوگا۔

"بلال کا فون آیا تھا۔ اس کی سسرال میں کسی نے ڈنر پر انوائیٹ کیا ہے۔ شام کو تیار ہوجانا۔" اسے بتا کر وہ لاؤنج میں چلا گیا۔

شام کو حسنہ گلابی سوٹ میں میچنگ بالیاں کانوں میں ڈالے ہلکی سی لپ اسٹک لگائے تیار تھی۔ خرم سیاہ ڈنر سوٹ میں بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ خالہ جان نے ان دونوں کی نظر اتاری' ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے۔" وہ دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑا دیکھ کر نہال

ہو رہی تھیں۔ خرم کی پُرشوق نگاہیں چاند چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ لیکن حسنہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

"آپی۔ شادی سے پہلے آپ اچھی بھلی نارمل انسان تھیں۔ اب کس بڑھیا کی روح سما گئی ہے؟" منیزہ نے اسے دیکھتے ہی تنقید کی بوچھاڑ کر دی۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" حسنہ نے از سر نو اپنا جائزہ لیا۔

"آپ کی شادی کو صرف ڈیڑھ ہفتہ ہوا ہے' آپ ڈیڑھ ڈھائی سال نہیں گزار چکیں جو اتنی سادہ اور ڈل لگ رہی ہیں۔" خرم اور حسنہ ڈنر پر جانے کے لیے ادھر آئے تھے تاکہ بلال اور فاریہ کے ساتھ فاریہ کی پھپھو کے گھر جاسکیں منیزہ' حسنہ کو دیکھتے ہی شروع ہو گئی منیزہ کی باتیں سن کر خرم نے تنقیدی نگاہ اس پر ڈالی وہ اسے اچھی لگ رہی تھی یا پھر اس کا زاویہ نظر بدل گیا تھا وہ کولڈ ڈرنک پی رہے تھے جب فاریہ اور بلال تیار ہو کر نیچے آئے۔

بلال نے سیاہ ڈریس پینٹ کے ساتھ انگوری رنگ کی دھاریوں والی شرٹ پہنی تھی فاریہ نے اورنج کلر کا سوٹ جس پر سرخ اور اورنج کلر کا کام تھا پہن رکھا تھا۔ سرخ لپ اسٹک اسی شیڈ میں میک اپ کیے خوشبوؤں میں بسی فاریہ کے سامنے حسنہ بالکل ماند پڑ گئی۔

"آپی! آپ تیار ہو کر نہیں آئیں۔ جلدی تیار ہو جائیں پھپھو کا دو بار فون آچکا ہے ہمیں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔" خرم سے سلام دعا کے بعد فاریہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

حسنہ کشمکش کا شکار ہو گئی۔ شادی کے سارے کپڑے خوبصورت اور دلکش رنگوں پر مشتمل تھے لیکن خرم کی طرف سے واضح ناپسندیدگی کے اظہار کے بعد حسنہ بہت محتاط ہو گئی تھی۔ بلال کی شادی میں اس نے اپنے دل کی مانی ہر فنکشن میں وہی چمکتے دمکتے کپڑے پہنے تھے۔ لیکن اب وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"بھابھی! آپی تیار ہو کر آئی ہیں' یہ اسی طرح آپ کے ساتھ ڈنر پر جائیں گی۔"

"آپی! آپ کی ڈریسنگ اچھی ہے لیکن پارٹی کے لحاظ سے نہیں۔ میری پھپھو کی بیٹیاں کچھ زیادہ ہی ماڈ ہیں' وہ خوامخواہ باتیں بنائیں گی آپ اوپر چلیں میرا کوئی سوٹ پہن لیں۔ آپ کا اور میرا ناپ ایک ہی ہے۔" فاریہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر اپنے کمرے میں لے جانے لگی حسنہ ہچکچا رہی تھی۔

"حسنہ! جلدی چینج کر کے آؤ۔ میری آج نائیٹ شفٹ ہے ہمیں ذرا جلدی ہی آنا ہے۔" بلال نے تاکید کرتے ہوئے گھڑی کی جانب دیکھا۔ خرم بالکل لاتعلق تھا۔ چاروناچار حسنہ فاریہ کے ساتھ چل پڑی فاریہ۔ اتنی چاہت سے اصرار کر رہی تھی۔

"کتنے پیارے بال ہیں آپ کے۔ چٹیا کے علاوہ بھی کوئی اسٹائل بنا لیا کریں۔" کاسنی اور سیاہ امتزاج کا سوٹ پہن کر وہ باہر آئی تو فاریہ نے تیزی سے اس کا میک اپ کرتے ہوئے بالوں پر تبصرہ کیا۔

"فاریہ! میک اپ رہنے دو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" حسنہ' فاریہ کے تیز تیز چلتے ہاتھوں اور زبان دونوں سے خائف ہوئی۔

"کوئی نہیں پنک لپ اسٹک پرپل کے ساتھ میچ نہیں کر رہی وہ اس کی آنکھوں پر مسکارا لگا کر لائنر کا ٹچ دے رہی تھی۔

"آپ اور خرم بھائی کی ڈریسنگ میچ ہو رہی ہے۔ بلال مجھے کہہ رہے تھے میں بلیک یا گرین ڈریس پہنوں لیکن مجھے یہی اچھا لگا۔" فاریہ نے ستائشی انداز میں اسے سراہا وہ دونوں نیچے آئیں تو بلال اور خرم حالیہ دہشت گردی کی وجہ سے اسپتالوں میں پیدا ہونے والی صورت حال پر بحث کر رہے تھے۔ حسنہ کو دیکھ کر خرم کی نگاہیں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ وہ سر تاپا بدلی ہوئی بہت ترو تازہ لگ رہی تھی۔



یہ میں ہوں خرم احسان' ماں کے دودھ کی تاثیر اپنی جگہ لیکن اپنے احسان ناشناس باپ کی فطرت کا رنگ میری شخصیت پر خوب گہرا چڑھا ہوا ہے' میری سوچ

میں سطحی پن اور مزاج میں خود پسندی کا گھمنڈ ضرورت سے زیادہ ہے۔

امی کے پیارے بھانجے اور بھانجیوں کو ان کے نام سے ین کرر۔ بجیکٹ کر دیا لیکن صورتحال اس کے برعکس نکلی' ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ کے مصداق وہ کواکب بھی کچھ اور ہی نکلے۔ نام پر نہ جائیے سادگی پر نہ جائیے۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ کوالٹیز ہوتی ہیں۔ اپنی نگاہ کو وسعت دیں اور اسے بالغ ہونے دیں تاکہ انسان کے جوہر کو پہچان سکے۔ شکر ہے بلال' حسنہ اور منیزہ میرے زریں خیالات سے واقف نہیں ہیں۔

امی نے بڑے لاڈ سے ان کے نام رکھے تھے اور وہ تینوں بھی اس قدر فرماں بردار کہ ڈاکٹر بلال اکرام خود کو بڑے شوق سے مٹھو کہلواتے ہیں۔

حسنہ اکرام' میرا مطلب ہے حسنہ خرم اکنامکس کی لیکچرار' ذہین و فطین ڈیزائنر جس نے اپنے شوق کے لیے انٹیریئر' کوکنگ فلاور ارینج منٹ ڈریس ڈیزائننگ اور پتہ نہیں کون کون سے کورسز کر رکھے ہیں۔ وہ بھی اپنی خالہ کے لیے گڈی تھی ابھی تک گڈی ہے۔

میں نے ایک دن امی کو ٹوکا کہ وہ حسنہ کا صحیح نام بلایا کریں تو حسنہ نے تڑپ کر میری بات کاٹی۔

"نہیں خالہ جان! مجھے اچھا لگتا ہے جب آپ مجھے گڈی کہتی ہیں۔ میں سارے زمانے کے لیے حسنہ ہوں لیکن آپ کی صرف گڈی۔" میں نے اس کے بعد گڈی کے نک نیم پر سمجھوتہ کر لیا۔

اپلائیڈ فزکس میں ایم ایس سی کرنے والی منیزہ اکرام اگرچہ اب منی نہیں ہے لیکن کیا کیجئے' اپنی پیاری خالہ کے لیے وہ اب بھی منی ہے اور یقیناً "تب بھی منی ہی رہے گی جب اس کے اپنے چھوٹے چھوٹے منے منیاں ہو جائیں گے۔

سوری میں کچھ زیادہ ہی آگے چلا گیا۔

میری امی جان ایک ناخواندہ سیدھی سادی خاتون ہیں لیکن زندگی کے بارے میں ان کا فلسفہ بہت گہرا ہے جو ان کے ذاتی تجربے پر مبنی ہے ویسے بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے "ہر شخص کا نظریہ اس کے ذاتی تجربے کے مطابق ہوتا ہے۔"

امی کہتی ہیں جن بچوں سے ماں باپ جیسی بیش بہا نعمتیں چھن جائیں اللہ تعالیٰ ان بچوں کو غیر معمولی فہم و شعور اور ادراک سے نوازتا ہے۔ اب یہ ان بچوں کی قسمت یا حالات پر منحصر ہے کہ وہ اس فہم و شعور اور ادراک کو مثبت رخ پر استعمال کریں یا پھر منفی ہو جائیں۔

اس لحاظ سے میرے تینوں خالہ زاد خوش نصیب ہیں انہوں نے اپنے فہم و شعور کو بہت اچھے طریقے سے استعمال کیا تھا' وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے سیلف میڈ اور خوشحال لوگ ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے' ظاہری شکل و صورت' مادی تعلیم اور ظاہری شان و شوکت انسان کی باطنی خوبیوں اور اس کے کردار پر کیسے ترجیح پاتے ہیں اگر حسنہ ایک درزن ہوتی۔ بلال ایک وارڈ بوائے ہوتا۔ منیزہ اسکول گوئنگ لڑکی۔ تو کیا میرے لیے مناسب تھا کہ میں ان کے بارے میں حقارت سے سوچتا۔ ان کو خود سے کمتر خیال کرتا۔؟

کیا اس طرح کی صورتحال میں ایسا ہی کرنا چاہیے جیسا میرے باپ نے کیا۔؟

یا ویسا جیسا میں نے کیا۔

امی نے اپنے تجربے کی روشنی میں مرے لیے بہترین ہم سفر کا انتخاب کیا تھا۔ حسنہ میرے لیے عطیۂ خداوندی ہے۔ وہ دنیا کی بہترین عورتوں میں سے ایک ہے۔ میرے جیسے بروکن فیملی کے الجھی ہوئی نفسیات کے حامل انسان کے ساتھ صبر و تحمل سے گزارا کرنے کا فن صرف حسنہ کے پاس ہے۔

میں نے بتایا ناں کہ وہ غیر معمولی شعور اور حساسیت کی مالک ہے اس لیے وہ میرے مزاج کو بہت جلد سمجھ گئی۔

میری امی کہتی ہیں زمین پر تناور درخت کی صورت میں کھڑا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے بیج بن کر مٹی میں مل جائیں۔ پھل ہمیشہ جھکی ہوئی شاخ پر لگتا

میں نے مجبوراً ہی سہی امی کی خوشی کے لیے خود کو جھکا لیا اور شاید اسی فرماں برداری کا صلہ حسنہ کی صورت میں ملا ہے اس لیے راوی اب چین ہی چین لکھتا ہے۔



میں حسنہ خرم ہوں' میری اور میرے دو بہن بھائیوں کی پرورش اور تربیت میری خالہ جان نے کی ہے۔ ہم تینوں آج جو کچھ ہیں اللہ کی ذات کے بعد خالہ کی وجہ سے ہیں لیکن خالہ جان اس بات کا کریڈٹ لینا پسند نہیں کرتیں۔

ہم تینوں بہن بھائیوں کی صلاحیتیں ہیں جن کی وجہ سے ہم کامیاب انسان بنے۔

زندگی اسی ڈھب پر گزر رہی تھی جب خرم کی اچانک آمد اور پھر اس سے زیادہ اچانک شادی ایک نئی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

میرا تقدیر پر پختہ یقین ہے زندگی موت' شادی بیاہ' حسب نسب' اولاد یہ سب خدائی معاملات ہیں۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ تقدیر اٹل ہے تدبیر صرف وسیلہ ہے۔

اصل مسئلہ شادی کے بعد پیدا ہوا۔ خالہ جان نے خرم کی شادی زبردستی کردی تھی ان کے رویے سے میں نے سو فیصد یہ نتیجہ اخذ کیا۔ ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو۔

خرم کے تاثرات چیخ چیخ کر کہتے تھے کہ انہیں یہ سب اچھا نہیں لگا۔ میرے ساتھ ان کا رویہ بہت عجیب و غریب اکھڑا ہوا' ناگوار اور بہت مجبور قسم کا تھا۔ میں اس صورت حال پر بہت پریشان تھی۔ خالہ جان کی ناکام ازدواجی زندگی میرے سامنے تھی۔

کیا تاریخ پھر اپنے آپ کو دوہرانے جا رہی ہے۔ یہ خیال' یہ بات میرے اعصاب پر ہر وقت سوار رہتی۔ خرم سے میری شادی کا فیصلہ خالصتاً" خالہ جان کا فیصلہ تھا اور میں چاہ کر بھی ان کے فیصلے سے اختلاف نہیں کرپائی۔ کیونکہ خالہ جان کہتی ہیں۔

باادب بامراد۔ درخت دوسروں کو سایہ فراہم کرنے کے لیے خود دھوپ میں جلتا ہے۔ دوسروں کو پھل مہیا کرنے کے لیے خود جھکتا ہے۔ بہت بلندی اور بہت پستی میں صرف تنہائی ہوتی ہے۔

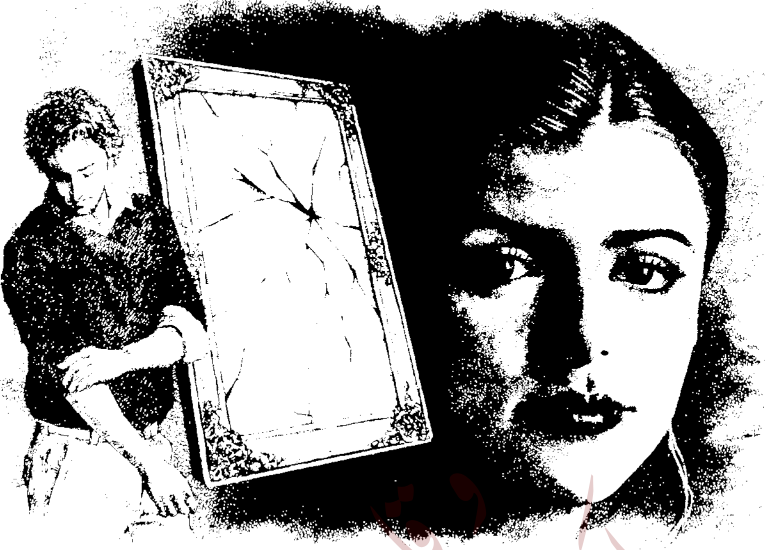
میں باادب بن کر واقعی بامراد ٹھہری۔ خرم کا اجنبی رویہ ابتدائی کچھ عرصے کے لیے تھا۔ بعد میں وہ بالکل ٹھیک ہوگئے۔ ٹھیک تو وہ ویسے ہی تھے۔ میرا مطلب ہے۔ میرے ساتھ ٹھیک ہوگئے وہ ایک طویل مدت کے بعد ہم لوگوں سے ملے تھے' ایڈجسٹ کرنے کے لیے کچھ وقت تو چاہیے تھا اور خرم نے ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ اب میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مطمئن بھی ہوں۔

خالہ کے کہنے پر خرم نے ہنی مون پر جانے سے صاف انکار کردیا تھا انہیں آفیشل کام سے ایک ہفتے کے لیے کوئٹہ جانا پڑا تو وہ مجھے ساتھ لے آئے۔

انہوں نے خود اعتراف نہیں کیا لیکن مجھے پتہ ہے وہ ہنی مون جو اس وقت ملتوی ہو گیا تھا۔ خرم اس کی تلافی کرنا چاہ رہے ہیں اس لیے مجھے کہا کہ میں کالج سے پندرہ دن کی چھٹی لے لوں۔ ہم کراچی خرم کے پاپا سے بھی ملنے جائیں گے۔ جنہیں خرم نے خالہ جان اور ننھیال کی وجہ سے شادی پر نہیں بلایا تھا۔ ویسے بھی تب خرم اپنے پاپا سے کافی ناراض تھے۔

ایک بات تو ثابت ہوگئی کہ "صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ" ہو سکتا ہے آپ میری بات سے اتفاق نہ کریں کیوں کہ ہر انسان کا نظریہ اس کے ذاتی تجربے کی بنا پر ہوتا ہے۔





مُقدّس مشعل

اُجالا ہے جسم دل و جاں میں

مکمل ناول

چھما چھم ' زوردار برستی بارش کی آواز اس مکمل طور پر خاموشی میں ڈوبے ماحول میں بہت بھلی اور اثر انگیز لگ رہی تھی۔ کمرے میں پھیلا اندھیرا اور چھاجوں چھاج برستی بارش کی آواز کیسا دلکش امتزاج تھا۔ بارش چاہے رم جھم پھوار کی مانند ہو رہی ہو یا پھر بدلیوں اور ہواؤں کی گرج کے ساتھ ہمیشہ سے اس کی پسندیدہ رہی تھی ــــ اسے یاد نہیں تھا کہ شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد وہ کبھی ارادتاً "اور شوقیہ بارش

میں نہائی ہو۔ برسات کے موسم کو انجوائے کر۔ لیے اسپیشلی پکوڑے یا پوریاں تلوائی ہوں۔ سے لطف اندوز ہونے کا اس کا اپنا انداز تھا۔ مصروفیات ایک طرف رکھتی اور کسی پرسکون طور پر خاموشی میں ڈوبے گوشے کو منتخب کر لیتی اس کی سماعت ہوتی اور بارش کی آواز اسے بار مہربان لگتی تھی ' جو خشک و کھردری و سخت زمین اور دل میں اسے تر کر جاتی ــــ یہ آسمان سے



سے' ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے موتی' جنہیں کوئی مٹھی میں قید نہیں کر سکتا تھا' کیسے آزادانہ زمین پر گرتے جاتے۔ جب برسنے پہ آتی برس پڑتی۔ کہیں پیاسی زمین سیراب ہو جاتی تو کہیں اس کی وجہ سے دریا چھلک پڑتے۔

وہ کھڑکی کی جانب بڑھی۔ پردہ ہٹا کر کھڑکی کھولی' یخ بستہ ٹھنڈی ہوا نے پُرزور استقبال کیا۔ بارش شاید کچھ دیر کے لیے تھم گئی تھی۔ مگر سرد ہوا پوری شدت سے چل رہی تھی۔ درختوں اور پودوں کی شاخیں ادھر ادھر جھوم رہی تھیں۔ پتوں پر گرے بارش کے قطرے تسلسل سے زمین پر گر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کھڑکی میں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی' پھر سردی محسوس ہوئی تو گھنٹی بجائی۔ اگلے ہی لمحے شاہدہ کمرے میں موجود تھی۔

"شاہدہ! دودھ میں لائٹ سی پتی ڈال کر دو آؤٹ شوگر لے آؤ۔" اس نے ملازمہ سے کہا اور بیڈ پر بیٹھ کر ڈائری کے صفحات الٹنے پلٹنے لگی۔ شاہدہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

"کبھی فرصت میں اپنی آنکھوں کو آئینے میں دیکھنا اور غور کرنا کیسی قندیلیں روشن ہیں تمہاری آنکھوں میں' دیکھنے والے کی نظروں کو چکاچوند کر دیتی ہیں۔"

سیاہ رنگ کے بال پوائنٹ سے لکھے گئے یہ الفاظ وہ ہر رات سونے سے پہلے ایک دفعہ اراداتاً اور بے خیالی میں کئی بار پڑھتی تھی۔ اس ڈائری میں کئی صفحات پر لکھا گیا تھا۔ دس سال پرانی اس ڈائری میں جو کچھ لکھ دیا گیا تھا' ابھی تک اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ مگر اسے یہ ڈائری بہت عزیز تھی۔ اس پر لکھے گئے الفاظ ہر بار پڑھنے پر نئے لگتے۔ محبت کا وہ تناور درخت جس کی جڑیں اس کے دل کی سرزمین پر ایک جال کی مانند پھیل چکی تھیں۔ اس درخت پہ نئی کونپلیں پھوٹنے لگتیں۔

مختلف صفحات پلٹتے وہ آخری صفحے پر رک کر ہمیشہ کی طرح گم صم ہو گئی۔

نہ وعدہ ہے کوئی تم سے کوئی رشتہ نبھانے کا
نہ کوئی اور ہی دل میں' تہیہ یا ارادہ ہے
کئی دن سے مگر دل میں
عجب الجھن سی رہتی ہے!
تا تم اس داستاں کے سرسری کردار ہو کوئی
نا قصہ اتنا سادہ ہے!
تعلق میں جو سمجھا تھا کہیں اس سے زیادہ ہے

آخری صفحے پہ لکھی نظم ہمیشہ اسے الجھا دیتی۔ ناقابل فہم' ناواضح اظہار۔۔۔ وہ ہمیشہ الجھ جاتی۔ اس نظم کو پڑھ کر احساسات سسکنے لگتے۔ اسی وقت شاہدہ ٹرے میں چائے کا مگ رکھے کمرے میں داخل ہوئی۔

اس نے مرے مرے ہاتھوں سے ڈائری بند کرکے دراز میں رکھی۔ شاہدہ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر کمرے سے چلی گئی۔

"تو وہ سب کچھ کیا تھا؟ کیا تم نہیں جان پائے تھے یا پھر جان کر ماننے سے انکاری تھے۔ نہیں اگر انکاری ہوتے تو آج میں یہاں تک نہ پہنچ پائی ہوتی۔ تم نہ سہی۔۔۔ مگر میں تو سب جان گئی۔ تمہارے بارے میں بھی اور۔۔۔ اپنے بارے میں بھی۔" بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم ہو چکی تھی۔ بیتا وقت کسی فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر دوڑنے لگا۔



"یار! صبح ہم دونوں کو یہاں سے جانا ہے۔ میں نے اپنی ساری پیکنگ کر لی ہے۔ مگر تم یوں ہی ڈل سی لیٹی ہو۔" ثناء اس کے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"مسئلہ کیا ہے؟ گھر جانے کے ذکر سے تم ہمیشہ پریشان ہو جاتی ہو' مگر اب تو صورت حال زیادہ ہی گمبھیر لگ رہی ہے۔ کیا پرابلم ہے' مجھ سے بھی شیئر نہیں کرو گی؟" وہ بہت نرمی سے کہہ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی' کچھ پل ثناء کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اداس لہجے میں بولی۔

"کیا تم گھر جانے پر بہت خوش ہو؟"
"ظاہری بات ہے یار۔! ہم اپنے گھر والوں سے' اس لیے دور رہ رہے ہیں کہ ہمیں تعلیم حاصل کرنا ہے۔ کوئی شوقیہ تو ہم گھروں سے نہیں نکلے۔ لیکن پتا نہیں کیوں تم ہمیشہ گھر جانے سے گریزاں نظر آتی ہو اسی شہر میں تمہارا گھر ہے' اس کے باوجود تم ہاسٹل میں رہتی ــــ ہو اور اب گھر جانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ آخر وجہ کیا ہے؟" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔
"وجہ کچھ بھی نہیں۔ بس تم جانتی ہو کہ میں شروع سے ہی گھر سے باہر رہ رہی ہوں۔ ہاسٹلز میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ گھر جانے کے خیال سے ہی دحشت سی ہوتی ہے۔ ویسے بھی میری خالہ کا خیال ہے گھر کا ماحول میرے لیے سوٹ ایبل نہیں۔ وہ مجھے پڑھانا چاہتی تھیں۔ لہٰذا شروع سے ہی گھر سے باہر رکھا' تاکہ میں مکمل وقت پڑھائی کو دوں۔ بس اب گھر میں دل نہیں لگتا۔" وہ آہستگی سے بتارہی تھی۔
"ہوں۔ آئی نو ان ماڈرن ہائی کلاس گھروں میں وقتاً" فوقتاً" پارٹیز ہوتی رہتی ہیں۔ پھر گھر میں کیبل' کمپیوٹر' ویڈیو گیمز.... یہ سب چیزیں بچوں کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ ایک طرح سے تمہارے گھر والوں نے اچھا ہی کیا۔ تمہیں پڑھنے کے لیے اچھا ماحول دیا۔ اسی لیے تم پڑھائی میں اے ون ہو۔ تمہارا مطالعہ اتنا وسیع ہے' مگر اب یہ بھی تو صحیح نہیں نا کہ تم ہمیشہ اب ایسی ہی زندگی گزارو۔ تمہیں عملی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ جیسی پارٹیز سے تم اکتاتی ہو کل کو یہ سب تمہیں ہینڈل کرنا ہے۔ تو پھر خود کو ذہنی طور پر تیار کرو۔ اس کلچر کا حصہ بننے کی کوشش کرو۔ ساری زندگی یوں الگ تھلگ کتابوں میں گم رہ کر تو نہیں گزاری جاسکتی۔ جس کلاس سے تمہارا تعلق ہے وہاں تمہاری ایج کی لڑکیاں تو جان محفل ہوتی ہیں۔" ثناء ناصحانہ انداز میں اسے سمجھا رہی تھی۔ جو ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے ٹھوڑی گھٹنے پر ٹکائے نہ جانے کس خیال میں گم تھی۔
"ثناء تمہارے گھر کا ماحول بہت اچھا ہے نا.... وہاں پیارے پیارے سادہ دل لوگ ہیں۔ ان کی چاہت اور محبت ہے جو تمہیں کھینچتی ہے۔ ان سے دور رہ کر تمہارا دل نہیں لگتا' ہے نا یہی بات۔" کچھ دیر بعد وہ مدھم سے لہجے میں بولی۔
"ہاں گھر کا ماحول جیسا بھی ہو' گھر' گھر ہی ہوتا ہے' جس کی ہر انسان کو ضرورت ہے۔ گھر کے بغیر اور رشتوں کے بغیر زندگی کچھ بھی نہیں۔ ہم جہاں بھی جائیں' جس مقصد کے لیے جائیں لوٹ کے گھر ہی آنا ہوتا ہے اور پھر ہمارے گھر کا ماحول تو مثالی ہے۔ ایک ہی محلے میں ہمارا پورا خاندان رہتا ہے۔ میرے چاچو' تایا' پھوپھو کی فیملیز جب جی چاہے' جس کے گھر جاؤ' گپیں مارو' ہنسی مذاق' کھیل کود' ہر وقت گہما گہمی کا سا عالم ہوتا ہے۔ تمہیں اتنی دفعہ کہا ہے کسی دن چلو' مگر تم آتی ہی نہیں ہو۔ میں وہاں تمہارا اتنا ذکر کرتی ہوں کہ میری تمام کزنز تم سے ملنے کو بے تاب ہیں۔ میری منگنی پہ آجانا۔" اس نے بے ساختہ کہا تو صباحہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
"واٹ! تمہاری انگیجمنٹ ہو رہی ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔
"ہاں۔ تایا کے بیٹے ارسلان سے۔ وہ دراصل

ارسلان کی بہن کبریٰ کی منگنی میرے بھائی شاہد سے ہو رہی ہے تو گھر والوں کا خیال ہے مجھے بھی ساتھ ہی نپٹا دیا جائے۔" ثناء دھیمی سی مسکان کے ساتھ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے۔ سفید گالوں سے گلابیاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔ صباحہ مبہوت سی آنکھوں میں شوق بھرے اسے دیکھتی رہی۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے، گھنی میسنی"۔ اسے چٹکی کاٹتے ہوئے اس نے پیار بھرا شکوہ کیا۔

"بس سوچا تمہیں انوائٹ کروں گی تب بتاؤں گی۔"

"آؤ گی نا میری منگنی پہ پلیز.... "اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"دیکھو وعدہ نہیں، البتہ کوشش ضرور کروں گی۔"

صباحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوشش، کیا مطلب اپنی واحد دوست کی اتنی بڑی خوشی میں شامل ہونے کی صرف تم کوشش ہی کرو گی۔" ثناء نے منہ بسورا۔

"کیا تم بہت خوش ہو؟" اس نے اتنی حیرانی سے کہا کہ ثناء چپ سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی یہ خاموش طبع، خوب صورت عادات کی مالک دوست ہمیشہ ان باتوں پر حیران ہوتی تھی جن پر حیران نہیں ہوا جاتا تھا۔

"کسی بھی لڑکی کی زندگی میں آنے والا یہ موڑ خوب صورت اور انوکھا ہوتا ہے۔ خوش ہونا فطری بات ہے۔" ثناء نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا یہ تم دونوں کی پسند سے ہوا ہے؟"

"ہمارے خاندان میں شادیاں عموماً خاندان کے اندر ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے اکثر جوڑے پہلے ہی سے ایک دوسرے میں انوالو ہوتے ہیں۔ تم سناؤ تم کب تک اس خوب صورت بندھن میں بندھ رہی ہو؟" ثناء نے شوخی سے پوچھا تو صباحہ کے چہرے پر اک سایہ سا لہرا گیا۔ بے ساختہ اس نے چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔

"میں پہلے تعلیم مکمل کروں گی۔ ابھی میں اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی۔"

انداز ایسا تھا کہ ثناء پھر اس سے اس موضوع پر بات نہ کر سکی۔

"اچھا یہ تو بتاؤ، تم اپنے گھر والوں سے اتنی بے زار کیوں ہو؟ مانا کہ شروع سے ان سے دور رہی ہو۔ مگر یوں گھر جانے کے نام سے بدکنا تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا تم میرے ساتھ اپنا مسئلہ شیئر نہیں کر سکتیں۔" وہ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔

"مسئلہ تو کچھ بھی نہیں۔ بس بات یہ ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول.... وجہ کچھ خاص نہیں.... خیر جانا تو ہے نا مجھے۔ کیا تم ایسا نہیں کر سکتیں کہ میری بھی پیکنگ کر دو۔ یو نو پیکنگ کرنا مجھے بہت فضول سا کام لگتا ہے۔" وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ لہٰذا جھٹ سے کام کہہ دیا۔

ثناء اسے گھورتے ہوئے۔ الماری کی جانب بڑھی.... صباحہ کچھ دیر چپ چاپ اسے پیکنگ کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر سنگل بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

ثناء نے اس کے افسردہ سے چہرے پر نظر ڈالی، یہ لڑکی کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ پچھلے دو سال سے وہ ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ صباحہ اس کی روم میٹ تھی۔ بچپن ہی سے ہاسٹلز میں رہ رہی تھی۔ اس ماحول کی عادی تھی۔ کلاس کی ذہین ترین، ہر ایکٹی ویٹی میں سرگرم صباحہ سب سے الگ تھلگ رہی۔ فارغ اوقات میں وہ کتابوں کی ہمراہی میں نظر آتی۔ تقریریں، بحث و مباحثہ کرتے ہوئے پرجوش آواز میں بولتی، لہجے کے دلکش اتار چڑھاؤ کو دلوں میں اتارتی، پرزور، پراثر دلائل دیتی صباحہ خان عام حالات میں بہت چپ چاپ اپنے آپ میں گم سم رہتی۔

ثناء وہ پہلی لڑکی تھی، جس سے اس نے دوستی کی تھی اور پھر دن آ دن ان کی دوستی گہری ہوتی گئی۔

ثناء اس کا مزاج جان گئی تھی۔ مگر پھر بھی اکثر اس کی غیر معمولی حرکات پر چونک جاتی۔ آج تک اپنی فیملی

کے بارے میں اس سے بات نہ کی تھی۔ بلکہ جب بھی چھٹیوں میں گھر جانا پڑتا وہ شدید کوفت کا شکار ہو جاتی۔ یہ بات ہمیشہ سے ثناء کے لیے ایک معمہ بنی رہی تھی۔ وہ اس کی فیملی سے واقف نہیں تھی' سوائے اس کے کہ اس کی فیملی بہت آزاد خیال اور امیر کبیر ہے۔ بقول صباحہ کے اس کی مدر کی ڈیتھ ہو چکی تھی' جبکہ فادر بیرون ملک رہتے تھے۔ صباحہ کو وقتاً "فوقتاً" بھاری رقوم ملتی رہی تھیں۔ اس کے ڈریسز' جوتے' بیگ' استعمال کی دیگر اشیاء بہت بیش قیمت اور اسٹائلش ہوتیں۔ صباحہ کی باتوں سے وہ ابھی تک اس کی خالہ چندا سے غائبانہ متعارف ہوئی تھی۔ جن کے ٹیلیفون بھی آتے رہتے۔ ثناء بھی ایک' دو بار ان سے بات کر چکی تھی۔ ان کی باتوں میں صباحہ کے لیے پیار جھلکتا تھا۔ ثناء اس کے اب تک کے رویے سے یہ ہی اندازہ لگا پائی تھی کہ اپنے گھر کے فیشن ایبل ماحول میں وہ ایڈجسٹ نہیں ہو پاتی۔ اسی وجہ سے گھر جانے سے الرجک ہے۔

اس کی تقریباً" تمام پیکنگ وہ کر چکی تھی۔ اٹیچی کیس بند کر کے اس نے ٹائم دیکھا۔ ایک بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ پھر صباحہ کی طرف دیکھا۔ دائیں کروٹ لیٹی آنکھوں پہ بازو رکھے وہ شاید سو چکی تھی۔ ثناء نے لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلایا اور اپنے بیڈ پر آگئی۔ کچھ دیر بعد وہ گہری نیند میں اتر چکی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ ساتھ والے بیڈ پہ لیٹی دوست جسے وہ سویا ہوا سمجھ رہی تھی چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔



آفس سے وہ خلاف معمول لیٹ ہو چکی تھی۔ اس نے تیزی سے چائے حلق میں انڈیلی اور ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹا! آج لنچ میں کیا تیار کروں؟" ٹیبل پر سے برتن اٹھاتی کرتی خالہ نے جلدی سے پوچھا۔

"خالہ! وہ کڑاہی (کڑھی) وہ جو آپ بناتی ہیں نا۔ بیسن اور لسی والی' جس میں پکوڑے بھی ڈالتے ہیں۔"

خالہ ہنس پڑیں' اور اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

"ساتھ میں بوائل چاول..... اچھا بائے میں جا رہی ہوں۔"

تیزی سے کہتے وہ باہر کی جانب بڑھی۔

"ہائی سوسائٹی میں اتنا اعلا مقام پالیا ہے۔ مگر اس لڑکی کی فطری سادگی وہی ہے۔" ٹیبل پر سے برتن اٹھاتے ہوئے خالہ بڑبڑا رہی تھیں۔ یہ حقیقت تھی اس نے آج تک شوقیہ ہوٹلنگ نہیں کی تھی سوائے پروفیشنل ڈنر اور لنچ وغیرہ کے وہ تینوں ٹائم کھانا گھر سے کھاتی۔ لنچ کے لیے آفس سے گھر آتی۔ روایتی پاکستانی کھانے اس کے فیورٹ تھے۔

ڈرائیور نے معمول سے ہٹ کر اسپیڈ تیز کی اور بیس منٹ کا فاصلہ تیرہ منٹ میں طے کیا۔ پُر تمکنت انداز میں چلتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے سینٹرل ٹیبل پر پڑے گلاب کے تازہ مہکتے پھولوں کا چھوٹا سا بوکے ایک خوشگوار احساس دلا گیا۔ پچھلے تین دن سے لگاتار اس کے ٹیبل پر اس کے آنے سے پہلے پھولوں کا بوکے موجود ہوتا تھا۔ جو ہمیشہ تازہ گلابوں پہ مشتمل ہوتا اس کا آفس بہت اسٹائلش اور خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ روزانہ صبح اس کے آنے سے پہلے کمرے کی ہر چیز قرینے سے رکھی ہوتی مگر پچھلے تین دنوں سے ٹیبل پر موجود گلاب اسے خوب صورت احساس سے روشناس کراتے اور دل' دل میں وہ گلاب رکھنے والے کی ممنون ہوتی۔ مگر آج اس نے اسے روبرو شکریہ کہنے کا سوچا۔ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر چیئر کو ہولے ہولے گھماتے ہوئے وہ پھولوں کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب عون کمرے میں داخل ہوا۔

"یس میڈم! آپ نے مجھے بلایا؟" اس نے مؤدب انداز میں کہا۔

"ہاں بیٹھو!" اس نے سر تاپا اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ لمبے قد' سفید رنگت' گھنگریالے بالوں والا وہ ایک چھبیس' ستائیس سال کا خوبرو لڑکا تھا۔

"یہ پھول روزانہ تم رکھتے ہو؟" کچھ توقف سے وہ

بولی۔
"جی...!" اس نے بلا تامل اقرار کیا۔
"کیوں؟" اس نے بے ساختہ کہا۔
"اچھا لگتا ہے صبح صبح آپ کی ٹیبل پر پھول رکھنا۔"
وہ کچھ پل چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔
"کیا آپ کو اچھا نہیں لگتا۔" وہ کچھ گڑبڑا کر بولا۔ "پھول کسے اچھے نہیں لگتے اور گلاب کے پھول تو میرے فیورٹ ہیں۔ لیکن تم ہمیشہ گلاب کے پھول کیوں رکھتے ہو؟"
"کیونکہ گلاب کے پھول "محبت" کی علامت ہوتے ہیں۔"
"واٹ ڈو یو مین؟" اس نے الجھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
وہ بے ساختہ نظریں چرا گیا۔
"میڈم یو نو! کچھ لوگ بہت اٹریکٹو اور دلکش شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ آپ بھی ایسی ہی ہستی ہیں۔ میں نے سوچا ایک اچھی اور پسندیدہ شخصیت سے لگاؤ ظاہر کرنے کا یہ بہتر طریقہ ہے۔ آئی رئیلی لائیک یو۔" وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔
"تھینک یو ینگ مین! اب تم جا سکتے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص شیریں اور پُراعتماد انداز میں بولی۔
وہ ایک گہری نظر اس پر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے ہوئے اس کی گہری نظر کی تمازت نے اس کے شعور کو چھوا تھا۔ پھر بھی وہ نظرانداز کر گئی۔ پھولوں کو سائیڈ پہ رکھتے ہوئے اس فائل اپنے سامنے کھسکالی۔

☼ ☼ ☼

"نیلم جان آج تم سے ایک بہت خاص بات کرنی ہے۔ اپنے ایک خاص آدمی کے لیے۔" خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے شہروز نے کہا۔
"جی فرمایئے صاحب! ہم یہاں آپ کی باتیں سننے کے لیے ہی بیٹھے ہیں۔" نیلم جان نے لگاوٹ سے کہا۔
"نیلم جان! میرا ایک دوست ہے آویز خان۔ بہت بڑا جاگیردار ہے۔ اس کے والدین اور زیادہ تر رشتے دار امریکہ میں ہیں۔ پاکستان میں صرف اس کے وہ رشتے دار ہیں جو زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے ہیں۔ اس کا باپ بہت بڑا بزنس ٹائیکون ہے۔ ماں بھی بزنس وومن ہے۔ بچپن سے وہ امریکہ میں رہا ہے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان میں انجوائے منٹ اور وزٹ کے لیے آیا ہے۔ وہ پاکستان میں تین ماہ رکے گا۔ اس شہر میں اس کا ذاتی بنگلہ ہے۔ اس کے علاوہ اور شہروں میں بھی ان کی کوٹھیاں ہیں۔ مگر نیلم جان جو بات میں اب کرنے جارہا ہوں اسے ذرا غور سے سنو۔" کچھ توقف سے وہ پھر شروع ہوا۔ نیلم جان کا رواں رواں متوجہ تھا۔
"میرا دوست امریکہ کی آزاد فضاؤں میں پلا بڑھا ہے۔ مغربی معاشرے کے مادر پدر آزاد ماحول میں بھی اس کی طبیعت بہت نفاست پسند رہی ہے۔ ہر چیز کے بارے میں سلیکٹو ہے۔ مگر اس نے آج تک کوئی ایسی گرل فرینڈ نہیں بنائی جو اس سے پہلے کسی اور کی گرل فرینڈ رہ چکی ہو۔ اب وہ ایک ایسی لڑکی چاہتا ہے جو ان تین ماہ میں اس کے ساتھ رہے۔ ہر لمحہ' ہر پل اور جو ان چھوئی کلی کی مانند ہو جو سر تاپا صاف' شفاف ہو۔ جو خوب صورت رقص کر سکتی ہو' مترنم' دلکش آواز کا جادو جگا سکتی ہو! یعنی سارے رنگوں سے بھرپور ہو' مگر خود ہر رنگ سے بے خبر ہو 30 لاکھ ایڈوانس میں ملے گا۔ باقی گاڑی' بنگلہ' بینک بیلنس وہ سب آپ کی لڑکی پر ڈپینڈ کرتا ہے کہ وہ جاگیردار سے کیا کچھ نکلوا سکتی ہے۔ شرط بس یہ ہے کہ جو باتیں میں بیان کر چکا ہوں ان پر پورا اترتی ہو اور.... وہ تین ماہ کے لیے آویز خان کی ملکیت ہوگی۔ آپ سمجھ گئی ہیں میری بات؟"
وہ نیلم جان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ مگر میں ابھی کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتی۔ کل شام تک کا وقت چاہیے

مجھے۔" نیلم جان کے لہجے میں بے تابی کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی تھی۔
"اب میں چلتا ہوں۔ کل آؤں گا لڑکی کو لینے۔"
"تو کیا آپ کا دوست نہیں آئے گا۔" نیلم جان نے بے ساختہ پوچھا۔
"ارے نہیں نیلم جان۔ وہ ایسی ویسی جگہوں پہ جانا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ کل کی تیاری رکھیے گا۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔
"آں.... ہاں.... ضرور۔" نیلم جان اٹکتے ہوئے بولی۔
"اوکے۔ میں چلتا ہوں۔"
شہوز کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ نیلم جان وہیں بیٹھ کر گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ حسین و جمیل، دلکش اداؤں کی مالک لڑکیوں کی اس کے پاس کمی نہ تھی۔ اس ماحول میں پاک و صاف خیالات کی مالک، معصوم اور ہر فن مولا لڑکی۔ جو بہترین ڈانسر بھی ہو، گلوکارہ بھی ہو۔ وہ پریشانی کے عالم میں بیٹھی تھیں۔
"صباحہ!" نیلم جان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا انہوں نے فوراً" چندا کو طلب کیا۔
وہ بے قراری سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھیں۔ جب چندا نیچے آئی، نیلم جان اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ساری بات بتائی تو چندا بھی پریشان ہو گئی۔
"اب ایسی لڑکی کا انتظام کیسے کریں اماں!" وہ پریشانی سے بولی۔
"کیسے کیا مطلب ہے تمہارا؟ یہ اپنی صباحہ ہے نا۔ بس کام شروع کراؤ اب اس سے۔ بہت دن عیش کر لیے۔"
منہ میں پان رکھتے ہوئے وہ اطمینان سے بولیں تو چندا اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔
"ک.... ک.... کیا کہہ رہی ہو اماں! وہ ابھی بچی ہے، پڑھ رہی ہے۔ اس کا ذہن ابھی اس طرف نہیں ہے اور پھر آپ جانتی ہیں کہ...." تھوک نگلتے ہوئے وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ جب نیلم جان نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔
"ہاں ہاں.... جانتی ہوں کہ تو نے اسے بہت پڑھا لکھا کر شوبز میں ہی متعارف کروانا ہے۔ تھوڑا عقل سے کام لو۔ کتنا پیسہ لگاؤ گی اس کی اتنی مہنگی تعلیم پر۔ چودہ جماعتیں پڑھ لیں، کافی نہیں؟ پڑھائی نے اس کا دماغ بدل دیا ہے۔ کل کو خود مختار ہو جائے گی تو ہاتھ سے نکل جائے گی، پھر تم ہاتھ ملتی رہ جانا۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے، ہوش کر لو۔"
نیلم جان کی باتوں نے چندا کو گہری سوچ میں ڈال دیا۔ اس میں واقعی کوئی شک نہ تھا کہ صباحہ یہاں موجود تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ وہ یہاں آتی تو اس ماحول کا حصہ ہی نہ لگتی۔ ہر وقت اداس، کھوئی کھوئی سی۔ ناز و انداز تو اسے چھو کر بھی نا گزرے تھے۔ اس نے اس کی پڑھائی اور تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی تھی تو صرف اسی لیے کہ وہ آج کے تعلیم یافتہ معاشرے میں پورے اعتماد کے ساتھ جی سکے۔
صباحہ، نیلم جان کی بڑی بیٹی راگنی کی بیٹی تھی۔ راگنی، شبنم، چندا تینوں نیلم جان کی بیٹیاں تھیں۔ حسن و جمال میں بے مثال، اداؤں و انداز سے بھرپور۔ تینوں نے بلا جھجک ماں کے پیشے کو اپنایا تھا۔ راگنی نے ایک انکم ٹیکس افسر سے نکاح کیا تھا۔ شوخ و چنچل سی راگنی اپنی شوخ اداؤں کے ساتھ ساجد خان کے دل میں اتر گئی تھی۔ گھر والوں سے چھپ کر اس نے راگنی سے نکاح کیا اور اسے ایک علیحدہ فلیٹ لے کر دیا۔
دو سال کے عرصے میں ہی ساجد خان کا دل بھر گیا۔ اس کے انداز سے بے زاری ظاہر ہونے لگی، جبکہ راگنی نے پوری سنجیدگی سے گھر بسایا تھا۔
ساجد خان پہلے سے ہی شادی شدہ تھا اور تین بچوں کا باپ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ راگنی سے شادی کرنا اسے اپنی احمقانہ غلطی لگنے لگی۔ وہ برملا اس کا اظہار بھی کرنے لگا۔ راگنی نے اپنی ماں اور بہنوں سے ملنا بہت کم کر دیا تھا۔ ساجد خان کا ترش رویہ اسے اندر ہی اندر گھائل کرنے لگا، مگر وہ ثابت قدمی سے اپنے وعدہ پر ڈٹی رہی کہ جو شادی کے وقت ساجد خان

کے ساتھ تاعمر ساتھ نبھانے کا کیا تھا۔ ساجد خان سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔

راگنی کے بہت اصرار پر وہ مہینے میں ایک' دوبار اس کے پاس آتا اور پہلے سے بھی زیادہ تند و ترش روّیہ اپناتا۔ اس سے پہلے کہ وہ بے زاری کی آخری حد پار کرتا اور راگنی کو طلاق دیتا۔ صباحہ کی پیدائش کے وقت کچھ پیچیدگی کے باعث وہ جان سے گزر گئی۔

ساجد خان نے یہ کہہ کر بچی کو اپنانے سے انکار کردیا کہ وہ پہلے ہی تین بچوں کا باپ ہے' اس نے یہ شادی خفیہ کر رکھی تھی۔ لہٰذا اب وہ کس طرح بچی کو اپنے خاندان میں متعارف کروائے گا۔

راگنی کی جواں سال اور اچانک موت نے نیلم جان کو گہرا دکھ دیا تھا۔ اس نے بیٹی کی نشانی کو سینے سے لگالیا۔ چندا کے توسط سے ایک رئیس نے بہتر علاقے میں ایک کوٹھی لے دی۔ جو چندا کے نام تھی۔ اپنا مخصوص بازار چھوڑ کر نیلم جان اپنی بیٹیوں اور نواسی کے ساتھ اس کوٹھی میں منتقل ہوگئی۔ کوٹھی گنجان آباد علاقے سے کافی ہٹ کر تھی۔ یہاں آکر بھی انہوں نے اپنا پیشہ برقرار رکھا۔ مگر ذرا مختلف طریقے سے۔

چندا اسے بڑی شبنم اداکارہ کے طور پر کچھ عرصے کے لیے ٹی وی اسکرین پر آئی' پھر ایک ڈائریکٹر سے بیاہ کرکے بیرون ملک چلی گئی۔

کچھ عرصے بعد واپس آئی تو وہ ایک نامور پروڈیوسر' ڈائریکٹر کی بیوی تھی اور اس کے دو بچوں کی ماں بھی۔ نیلم جان کو اس کی طرف سے تسلی تھی۔ چندا نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی تھی۔ وہ اپنے حال میں مست تھی۔ اور شادی کو فضول سمجھتی تھی۔ صباحہ حقیقی معنوں میں چندا کے ہاتھوں پلی تھی۔ چھ سال کی صباحہ کو اس نے ہاسٹل میں بھیج دیا تھا۔ تاکہ وہ یکسوئی سے پڑھ سکے۔ اس کے تمام اخراجات اور ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری چندا کے اوپر تھی۔ جسے وہ بخوبی نبھا رہی تھی۔ مگر اس کے مستقبل کے متعلق اس کی سوچ بھی پیشہ ورانہ تھی۔ وہ اسے بہترین آئٹم کے طور پر شوبز میں متعارف کروانا چاہتی تھی۔ مگر یہ نہ جانتی تھی کہ تعلیم اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات کو بھی متاثر کرے گی۔ اب نیلم جان نے جو بات کی تھی۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔

''دیکھو چندا! تیس لاکھ کی ڈیل ہے۔ مزید بڑا کچھ مل سکتا ہے اگر تھوڑی ہمت کرلو۔ ان کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ایک چھوڑ دس ملیں گی مگر تیس لاکھ ہمیں نہیں ملیں گے' سوچ لو۔''

لوہا گرم دیکھ کر نیلم جان نے چوٹ لگائی۔

''بس اب یہ معاملہ آپ مجھ پہ چھوڑ دیں اور بے فکر ہو جائیں۔'' چندا نے بہت جلد فیصلہ کرتے ہوئے حتمی انداز میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیلم جان کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی۔



''خالہ! کیا کہہ رہی ہیں آپ..... میں یہ سب ہرگز نہیں کر سکتی۔ آپ جانتی ہیں میں یہ مر کر بھی نہیں کر سکتی۔''

چندا کی ساری بات سننے کے بعد وہ جیسے کرنٹ کھا کر صوفے پر سے اٹھی تھی۔ سفید رنگ کے سوٹ میں وہ انگارہ بنی کھڑی تھی۔ گال پل میں دہک کر سرخ ہوگئے تھے۔

''تمہیں یہی سب کرنا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو یہ ہمارا پیشہ ہے۔ ہماری روزی روٹی کا یہی ایک وسیلہ ہے۔ یہاں سے بے زار ہو کر بھاگو گی تو دنیا میں کہیں اور پناہ نہیں ملے گی۔ معاشرے کی ایک حقارت کی نظر الٹے پاؤں واپس آنے پر مجبور کردے گی' سمجھیں۔''

چندا جیسے اس کے ردِّعمل سے واقف تھی اسی لیے بے لچک انداز میں سختی سے بولی۔ صباحہ کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔ وہ بے یقینی سے چندا کو دیکھنے لگی۔

''خالہ! اگر آپ نے مجھ سے یہی کچھ کروانا تھا تو پھر مجھے تعلیم کیوں دلوائی۔ مجھے اتنا شعور کیوں دیا۔ مجھ میں حیا و بے حیائی' نیکی و بدی' پاکیزگی اور گندگی کا احساس کیوں جگایا۔ اب جبکہ میرا ذہن بالکل اس طرف مائل نہیں ہے۔ میرا دل نہیں مانتا میری روح اپنی پاکیزگی کا

بہت نازاں رہی تو پھر آپ کیوں کر رہی ہیں ایسا؟"
اس کے لہجے کے درد نے چندا کے دل کو پل بھر کے لیے دہلا دیا۔ وہ کچھ دیر تک کھوجتی نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ کتنی معصومیت اور گہرائی تھی اس کی آنکھوں میں۔ حسن و سادگی کا اعلا شاہکار۔ نظریں چرا گئی۔
"دیکھو صباحہ جان! ہمارا جنم جہاں ہوا ہے وہاں حیا، سادگی، پاکیزگی جیسے لفظوں کو کوئی جانتا تک نہیں۔ تم ابھی بچی ہو کچھ شروع سے اس ماحول سے دور رہی ہو، اس لیے یہ سب تمہیں عجیب لگ رہا ہے ہمارے یہاں کی جو لڑکی بغاوت کی راہ اپناتی ہے دنیا میں رہنے والے باعزت لوگ طنز و تحقیر کے نشتروں سے اسے لہولہان کر دیتے ہیں۔ تمہاری ماں نے بھی اس ماحول سے بے زار ہو کر ایک امیر زادے نام نہاد باعزت اور شریف زادے سے بیاہ رچایا تھا۔ مگر کیا ہوا وہ میری بہن سے ایسے ملنے جاتا جیسے جرم کرنے جا رہا ہو۔ وہ میری بہن کو اس کا حق نہ دے سکا اسے عزت و مان نہ دے سکا اسے ایسے چھپا کے رکھا لوگوں کی نظروں سے جیسے وہ سیاہی کا ایک دھبہ ہو جسے ظاہر کرنے سے وہ خود بھی بدنما ہو جائے گا اسی تحقیر اور ذلت کے احساس نے میری جوان خوب صورت بہن کی جان ہی لے لی۔ اور تمہیں تو اس نے دیکھنا تک گوارا نا کیا تھا۔ تمہارے عزت دار باپ نے ہمیں منہ مانگی قیمت ادا کی کہ ہم کبھی تمہیں اس کی بیٹی ظاہر نہ کریں۔
اور تمہیں پڑھانے کا مقصد یہ ہے کہ تم اپر کلاس سوسائٹی میں پورے اعتماد کے ساتھ موو کر سکو۔ فیوچر میں میں تمہیں شوبز میں انٹروڈیوس کرواؤں گی۔ تم بڑے پیمانے پر نام کماؤ گی۔ شہرت حاصل کرو گی..... عزت پاؤ گی دنیاوی عزت..... کم از کم عزت تو پا ہی لو گی۔ یہی ناچ گانے کا کام جو ہم چھوٹے پیمانے پر کرتے ہیں اسے ذلیل اور گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ شریف لوگ حقارت و نفرت سے دیکھتے ہیں اور ساری دنیا کے سامنے اسٹیج اور ٹی وی پر گانے والی میں یہی تو فرق ہے۔ اسٹیج پر گانے والی آرٹسٹ ہوتی ہے۔ دنیا بہت منافق ہے صباحہ جان۔ اس کے ساتھ تم قدم ملا کر چلنے کے لیے اس کے رنگوں میں ڈھلنا پڑتا ہے۔"
چندا کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی اور صوفے پر بیٹھی سسکیاں بھرتی صباحہ کی جانب دیکھا۔
"نہیں خالہ نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکوں گی۔ مجھے واقعی عزت پانی ہے معاشرے میں باوقار مقام پانا ہے مگر ایسے نہیں۔ غلط راستوں کے ذریعے مجھے منزل نہیں پانی۔ میری منزل کے راستے آسان، کشادہ سیدھے ہیں۔ پھر کیوں پیچیدہ، پُرخار رستوں کا انتخاب کروں۔ خالہ! آپ نے یہاں تک میری مدد کی پلیز کچھ عرصہ اور میری مدد کریں۔ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو لینے دیں۔ میں یہ سب نہیں کر پاؤں گی۔ پلیز خالہ جان! پلیز رحم کریں مجھ پر....."
وہ ہاتھ جوڑے سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز سے جھلکتے درد نے پل بھر کو چندا کے دل کے تاروں کو چھوا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ سخت لہجے میں گویا ہوئی۔
"صباحہ! غور سے سنو میری بات۔ اتنی دیر سے تم سے سر کھپا رہی ہوں اس لیے نہیں کہ تم اپنی ہی بات پر اڑی رہو۔ بات دراصل یہ ہے میڈم کہ تم پر بہت پیسہ لگایا ہے۔ تمہیں مہنگے ترین اسکول کالجز میں تعلیم دلوائی ہے۔ مہنگے سے مہنگا کپڑا پہنایا ہے۔ جو بھی چیز تمہیں میسر آئی بیش قیمت تھی۔ تمہارے باپ نے تو پلٹ کر تمہاری خبر بھی نہ لی۔ اگر اتنا ہی شوق ہے باعزت زندگی گزارنے کا تو چلی جاؤ اپنے باپ کے پاس، اس سے کہو کہ تمہیں ساری دنیا کے سامنے اپنائے، دوسری صورت تمہارے سامنے ہے، اور یہاں میں مزید تمہاری تعلیم پر ایک پیسہ خرچ نہیں کروں گی۔"
چندا بہت سنگ دلی سے زہریلے الفاظ کے نشتر

رہی تھی۔ صباحہ منہ کھولے حیرت سے اسے ٹک دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کی وہی خالہ تھی جن کے کردار کو سخت ناپسند کرنے کے باوجود وہ دل میں اس کے لیے محبت رکھتی تھی۔

"خا... خالہ میں سب لوٹادوں گی 'جو آپ نے مجھ پر خرچ کیا' میں لوٹا دوں گی۔ مگر فار گاڈ سیک کچھ سال انتظار کرلیں۔ میں آپ کو اس عذاب ناک 'گندی زندگی سے نجات دلاؤں گی۔ آئی پرامس خالہ!"

"بس کرو یہ پرامس 'ورامس..... ہم اپنے حال اور اپنی زندگی پر مطمئن ہیں۔ کسی طرح کی پشیمانی نہیں ہے۔ البتہ اب تم مسئلہ پیدا کررہی ہو۔ ہمارے لیے باعزت زندگی کا خواب سوائے ایک سراب کے کچھ نہیں ہے۔ بچکانہ 'احمقانہ خیالوں سے باہر نکلو۔ کل شام تمہیں جانا ہے۔ اگر انکار کرنا ہے تو کل شام سے پہلے پہلے اپنے باعزت باپ کے پاس چلی جاؤ۔ اگر وہ تمہیں رکھنے کو تیار ہو۔ تمہارا رابطہ میں کروادوں گی تمہارے باپ سے.... سوچو اور فیصلہ کرلو' تمہیں کیا کرنا ہے' اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے واپس مڑی۔

"کوئی جذباتی اور احمقانہ حرکت مت کرنا۔ میرا مطلب ہے یہاں سے بھاگنے کے طریقے یا خودکشی کے بارے میں مت سوچنا۔ اس طرح بھی تمہارا صرف نقصان ہی نقصان ہوگا۔ خودکشی حرام ہے اور بھاگ تم سکتیں نہیں' سمجھیں! گڈ نائٹ۔"

چندا نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ ناجانے کیسے پل پل کانٹوں پہ گزارتی آئی تھی اس امید میں کہ زندگی میں وہ گھڑی آئے جب وہ اس کوٹھے اور حرام کمائی کی سہولیات سے جان چھڑا سکے' شاید.... زندگی میں کوئی ایسا موڑ آئے جب وہ اس زندگی کو ٹھوکر مار سکے اور اپنے ساتھ نانی اور خالہ کو بھی اس زندگی سے نجات دلا سکے۔ مگر وہ تو اسے بھی اسی طرف دھکیل رہی تھیں۔

"نہیں.... نہیں 'کبھی نہیں' میں دلدل میں پاؤں نہیں ڈالوں گی.... جیسے بھی سہی مجھے اس زندگی سے بچنا ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنے اس قابل نفرت' بزدل باپ کی منتیں ہی کیوں نہ کرنی پڑیں۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔



"اچھا تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" اگلے دن جب اس نے نانی اور خالہ کے سامنے باپ کے پاس جانے کی بات کی تو چندا نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں یہ زندگی نہیں اپنا سکتی اور اس سے بچنے کی مجھے یہ ہی راہ دکھائی دیتی ہے۔" وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی۔

"واہ لڑکی! یہ صلہ ہے ہماری عنایتوں کا۔" نیلم جان ایک دم غصے میں آگئیں.... سجے سجائے تخت پر بیٹھی وہ پان چبانے میں مصروف تھیں۔

"اماں چپ کرجائیں۔ اگر یہ اپنے لیے یہ ہی بہتر سمجھتی ہے تو ٹھیک ہے۔ اس کی ماں نے ایک طوائف کی گود سے جنم لیا تھا۔ ایک بازار میں پرورش پائی تھی۔ اگر وہ باغی ہو کر باعزت زندگی کے لیے رشتوں کو چھوڑ سکتی تھی تو' اس کی رگوں میں تو پھر بھی ایک "باعزت" باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہ کیوں نا اس ماحول سے نفرت کرے۔ میں ابھی بات کرتی ہوں۔"

چندا نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے جھک کر ٹیبل پر سے موبائل اٹھایا۔ نمبر پش کرکے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گئی۔ فون ریسیو ہوتے ہی اس نے اسپیکر بھی آن کردیا۔

"ہاں بولو۔ کتنی رقم درکار ہے؟" دوسری طرف سے فون اٹھانے والے نے بغیر کسی سلام دعا اور تعارفی کلمات کے تند لہجے میں کہا۔

"اوہو اتنی فالتو دولت جمع ہوگئی ہے کہ کوئی فون کرے اور آپ چھوٹتے ہی بولیں۔ مجھ سے جتنی مرضی رقم لے لو۔" ٹانگ جھلاتے ہوئے چندا طنزیہ انداز میں بولی۔

"دیکھو چندا بیگم! ایک بار ہی لے لو جو کچھ لینا ہے۔ مگر اس بلیک میلنگ کا سلسلہ بڑھاؤ مت۔"

”یہ ہی تو میں کہنا چاہ رہی تھی ساجد خان!“ چندا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
”کیا مطلب؟“ دوسری طرف سے چونک کر پوچھا گیا۔
”مطلب یہ کہ میں خود چاہ رہی ہوں اس سلسلے کو ترک کردوں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم اپنی بیٹی کو قبول کرلو۔ اسے اپنا نام دو یا پھر اپنی بیٹی سے کہو کہ وہ ہمارا لائف اسٹائل اپنالے۔ رہتی ہے وہ ہمارے درمیان، مگر انداز و اطوار سارے خاندانی شریفوں جیسے ہیں۔ آخر تمہاری اولاد ہے نا۔“
”چندا بیگم! میں پہلے بھی....“
”دیکھو دیکھو۔ بات پوری سن لو، پھر فیصلہ سنانا۔“ چندا تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔
”تمہاری بیٹی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ بازار سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی شکل و صورت، ادائیں بہت معصوم ہیں۔ ماشاء اللہ سے بی اے کرچکی ہے، آگے بھی پڑھنے کا ارادہ رکھتی ہے، انداز و اطوار رکھ رکھاؤ ہنڈرڈ پرسنٹ، شریف باحیا لڑکیوں جیسا ہے۔ خوب صورت ہے۔ صاف ستھری سوچ کی مالک ہے، اور خدا گواہ ہے کہ اسے ابھی تک کسی غیر مرد تو کیا کسی بھی مرد نے چھوا تک نہیں۔ ہم نے ابھی تک اس کی رونمائی کروائی ہی نہیں۔ بس ہاسٹل میں رہی ہے اور اپنی پڑھائی میں مگن بہت لاڈوں اور نازوں سے پالا ہے میں نے اسے، ہر خواہش، ہر آرزو پوری کی ہے۔ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ اب اسے تمنا ہوئی ہے کہ اسے باپ کی شفقت اور سایہ ملے، ایک گھر ملے، باعزت زندگی ملے، لہٰذا بہتر ہے کہ اسے اپنے پاس بلالو، ضروری نہیں کہ تم اپنی فیملی میں اسے ایک طوائف کی بیٹی کی حیثیت سے متعارف کرواؤ، بلکہ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو تم نے ایک مجبور عورت سے شادی کی تھی۔ جو اب اس دنیا میں نہیں اور یہ تمہاری بیٹی ہے۔ خود بھی ہلکے پھلکے ہوجاؤ گے اور میری بلیک میلنگ سے بھی جان چھوٹے گی۔ بولو کیا کہتے ہو؟“
چندا نے پوری سنجیدگی سے کہتے ہوئے بات ختم کی تھی۔ نیلم جان اور صباحہ خاموش اسے سن رہی تھیں۔
صباحہ کے دل کی حالت عجیب سے عجیب ہورہی تھی۔ اس کا باپ اس کے حق میں کیا کرنے والا ہے، اس کا رواں رواں متوجہ تھا۔
”چندا بیگم! میں نے اسے اپنانا ہوتا تو بہت پہلے اپنا لیتا اور تمہاری بلیک میلنگ میں جو روپے برباد کیے ہیں، نہ کرتا۔ میرے تین بچے ہیں، بیوی ہے، میرا خاندان مکمل ہے۔ اس کے لیے کوئی جگہ نہیں، اس کی رگوں میں چاہے میرا خون ہے، مگر جنم تو اس نے ایک طوائف کے بطن سے لیا ہے۔ بظاہر جتنی بھی شریف ہے پرورش تو طوائفوں نے کی ہے۔ سوری میں اسے کسی صورت قبول نہیں کرسکتا۔ تم نے جو کچھ لینا ہے ایک دفعہ لو اور جان چھوڑو۔“
اس کے سنگ دلانہ الفاظ نے صباحہ کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھی اور اس طرح بازو چندا کی طرف بڑھایا جیسے باپ سے بات کرنا چاہ رہی ہو! التجا کرنا چاہ رہی ہو
”سنو، اپنی بیٹی سے بات کروگے؟“ چندا شاید خود بھی اتنے سنگ دلانہ جواب کی منتظر نہ تھی بے تابی سے بولی۔
”نہیں۔ میں یہاں کسی کو اپنی بیٹی نہیں مانتا۔ اب اگر کچھ کہنا ہے تو کہو۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے اوکے۔“ وہ حقارت آمیز تیزی سے بولا۔
”نہیں، آج تو اسی سلسلے میں بات کرنی تھی کہ اس قصے کو کوئی حتمی انجام دو، مگر تم خود ہی لٹکائے رکھنا چاہتے ہو ویسے تمہارے اس فیصلے نے ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی دے دی، اوکے بائے۔“
چندا نے فون بند کرکے صباحہ کی جانب دیکھا۔ جو بے جان سی صوفے پر گرگئی تھی۔
”ہوں صباحہ ڈیر! اب تمہارے لیے بھی فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔ لمبی چوڑی بحثوں میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، شام کو تیار رہنا۔“ چندا قطعی لہجے میں بولی۔
”خالہ.... نانی پلیز چند سال مجھے اور دے دیں، میں

اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاؤں تو کوئی کمی نہ رہنے دوں گی۔" وہ کپکپاتے انداز میں بولی۔

"کیا کمی نہ رہنے دوگی۔ کس چیز کی کمی ہے ہمارے پاس۔۔۔ پگلی! ہم تمہارے لیے ہی تمہاری منتیں کررہے ہیں۔ دنیا کی اصلیت تم نہیں جانتیں۔ اپنے سگے باپ کا رویہ تو ملاحظہ کیا ہی ہے۔ دنیا اس سے بھی زیادہ کٹھور اور بے حس ہے۔ وقت سکھائے گا تمہیں۔ اے تتلی! ادھر آؤ اور اسے اس کے کمرے میں لے جاؤ۔"

چندا نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے تتلی کو آواز دی جو دائیں کونے سے اٹھلاتی ہوئی نمودار ہوئی۔

"خالہ! جہاں اتنی مہربانیاں کی ہیں کچھ اور کردیں۔۔۔ پلیز۔" وہ سسک اٹھی۔

"صباحہ! مجھے سختی پر آمادہ نہ کرو، کیونکہ میں تم سے سختی کرنا ہی نہیں چاہتی، جاؤ اب، تمہارا باپ سچ کہتا ہے، حرام کی کمائی سے تمہاری پرورش ہوئی ہے۔ شریفوں کی دنیا تمہیں قبول نہیں کرے گی، جاؤ۔۔۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔"

چندا چیخ کر بولی۔ صباحہ نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر مرے مرے قدموں سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔ نیلم جان اور چندا اسے دیکھتی رہیں، پھر ایک سرد آہ بھرتے ہوئے چندا صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اماں! صورت حال تو بڑی گمبھیر ہے۔ یہ تو ہمارے کام میں بالکل اناڑی ہے۔ ڈانس اور گائیکی تو اسے برائے نام بھی نہیں آتی، کہیں وہ لوگ ہی اسے قبول کرنے سے انکار نہ کردیں۔ آخر انہوں نے اتنا پیسہ لگانا ہے تو کسی شے کے لیے ہی لگانا ہے۔ اماں! میں تو کہتی ہوں کسی اور لڑکی کا انتظام کریں۔ یہ روتی دھوتی شکل اسے کیا امپریس کرے گی، جو آیا ہی انجوائے منٹ کے لیے ہے۔"

چندا نے فکرمندی سے کہا۔

"ہاں۔ میں خود یہ ہی سوچ رہی ہوں، اسی لیے میرا خیال ہے نیلوفر کو بھیج دیا جائے۔ بلکہ دونوں لڑکیاں سامنے کردیں گے جو لے جانا چاہے، لے جائے گا، نیلوفر ابھی صرف اٹھارہ کی ہے۔ ابھی صرف ناچ گانا ہی سیکھا ہے۔ شاید پسند آ ہی جائے اسے۔"

"بالکل ٹھیک سوچا آپ نے۔۔۔ ایسے ہی کریں گے۔"

شام کو حسب توقع ناصر جاوید اپنے صحیح وقت پر ہی آیا۔ کچھ دیر کے بعد نیلوفر اور صباحہ کو اس کے سامنے لایا گیا۔ نیلوفر نیلی فراک اور سفید پائجامے میں ملبوس قیامت ڈھا رہی تھی۔ ہونٹوں پر دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ سفید رنگت دمک رہی تھی۔ جبکہ صباحہ آف وائٹ قمیص شلوار میں ملبوس سلک کا دوپٹہ شانوں پر پھیلائے بہت اداس اور ملول سی کھڑی تھی۔

"نیلم جان! میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا میں ان دونوں کو ساتھ لے جاتا ہوں، اب جو میرے دوست کو پسند آجائے۔" ناصر جاوید نے پرخیال انداز میں ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آپ لے جاسکتے ہو۔" نیلم جان تیزی سے بولیں۔

صباحہ کو اپنے پاؤں تلے سے زمین کھنچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے زخم خوردہ سی نظر نانی اور خالہ پر ڈالی جو بے ساختہ نظریں چرا گئیں۔

"او کے۔ یہ آپ تین لاکھ کا چیک رکھ لیں، اور مزید کی امید رکھیں۔" ناصر جاوید نے چیک نیلم جان کی طرف بڑھایا۔ جسے پکڑتے ہوئے نیلم جان کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

ایک گھنٹے بعد نیلوفر واپس آگئی، نیلوفر کو سامنے دیکھ کر چندا کی آنکھیں دھندلا سی گئیں۔ شاید اس کے دل میں بھی کہیں خواہش تھی کہ اس معصوم، پاکیزہ لڑکی کی پاکیزگی قائم رہے، مگر۔۔۔ یہ تلخ حقیقتوں کے گھونٹ نہ چاہتے ہوئے بھی پینا پڑتے تھے۔ چندا سر درد کا بہانہ کرکے نیلم جان کے پاس سے اٹھ گئی۔



کھڑکی کے سامنے کھڑی وہ باہر سڑک پر رواں دواں

ٹریفک کو دیکھنے میں مگن تھی۔ جبکہ سوچ کی لہریں کہیں اور محو پرواز تھیں۔

"مے آئی کم ان میڈم!" بھاری خوب صورت مردانہ آواز پر اس نے رخ موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ جو متجسس نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ!" اسے کہتے ہوئے وہ خود بھی اپنی چیئر پر بیٹھ گئی۔ عون سامنے رکھی چیئر پر بیٹھ گیا۔

"عون! تم کل میرے ساتھ دبئی جا رہے ہو۔ کل دس بجے کی فلائٹ ہے۔" اس نے کہا تو وہ حیران سا ہو گیا۔

"بس میڈم میں تیار ہوں، مگر یوں اچانک۔"

"بزنس کے سلسلے میں فوری فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ تمہیں ساتھ اس لیے لے جا رہی ہوں کیونکہ تمہیں بزنس کے اسرار و رموز پر کافی دسترس ہو گئی ہے۔"

"تھینک یو میڈم! آپ نے مجھے اس قابل جانا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ ہماری یہ بزنس ڈیل ناکام نہ ہونے پائے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"گڈ! اب یہ فائل لے جاؤ اور اسے اچھی طرح اسٹڈی کرو۔" اس نے گرے کلر کی فائل اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے میڈم!" اس نے فائل اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔



تین دنوں کی لگاتار میٹنگز کے بعد بزنس ڈیل کامیاب رہی تھی۔ چوتھے دن انہیں بمشکل فرصت میسر آئی۔ لنچ کرنے کے بعد وہ لانگ ڈرائیو پر نکل گئے، اور مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ وہ بہت خوش گوار موڈ میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ صباحہ نے سنبھال رکھی تھی۔ وہ کسی بات پر بے ساختہ کھلکھلائی تو اس کے بائیں گال پر پڑنے والا گہرا ڈمپل اتنا دلکش لگا کہ بے اختیار وہ اس کے چہرے کو دیکھے گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو، میرے چہرے پہ کوئی نئی چیز دریافت ہو گئی ہے۔" وہ محظوظ ہونے کے سے انداز میں بولی۔

"ن... نہیں تو... بس ایسے ہی۔"

وہ خجل سا ہوتا نظریں چرا گیا۔ کچھ پل کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی سی چھا گئی۔

"عون ہمت کرو اور آج اپنا مدعا بیان کر ہی دو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" عون نے دل میں سوچا اور ہولے سے لب کھولے۔

"میڈم! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایسی بات جو آپ کو ناگوار بھی لگ سکتی ہے۔ لیکن میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"اگر ایسا ہے تو مجبوری ہے، کہو۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"میری خواہش ہے کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔"

"اچھا! مگر ہر سفر کا اختتام تو یقینی ہے۔"

"میری خواہش ہے کہ زندگی کے سفر میں آپ اسی طرح میری ساتھی ہوں۔" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

صباحہ کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے اس نے کوئی معمول کی بات کی ہو۔ وہ جو توقع کر رہا تھا اس کی بات سن کر میڈم چونک جائیں گی، اس کے نارمل تاثرات نے اسے حیران کر دیا۔

"تم جانتے ہو، تم کیا کہہ رہے ہو، اس کا مطلب کیا ہے؟" چند سیکنڈ بعد وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ کہا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اپنے اور میرے درمیان ایج ڈیفرینس سے آگاہ ہو، میں بتیس سالہ ایک میچور عورت اور تم چھبیس سالہ نوجوان، جسے کوئی بھی کم عمر، حسین و جمیل، ایجوکیٹڈ لڑکی مل سکتی ہے۔ پھر مجھے پرپوز کرنے کی وجہ؟"

وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے کوئی روزمرہ کی بات ہو۔ عون دل ہی دل میں اس کے رویے پر حیران تھا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ حسین لغاری کے آفس میں آپ کو فرسٹ ٹائم دیکھا تھا۔ میں آپ سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہاں سے جاب چھوڑ کر آپ کے پاس آگیا۔ میں آپ کی قابلیت اور شخصیت پرسنالٹی سے متاثر ہوا تھا۔ پھر یہ پسندیدگی کب محبت میں بدل گئی پتا ہی نہیں چلا۔ اگر ہمارے درمیان کچھ ڈیفرنسز ہیں تو اس بنیاد پر کیا محبت کا جذبہ ختم ہو سکتا ہے' مجھے صرف آپ کا ساتھ چاہیے' آپ کے علاوہ کوئی نہیں۔"

صباحہ چپ سی ہو گئی۔ گاڑی کو سائیڈ پہ کرتے ہوئے اس نے روک دیا۔ تاحد نظر درختوں کی قطار تھی۔ درختوں کی شاخیں آپس میں گھل مل رہی تھیں۔ ان کے گھنے سائے زمین پر پڑتے ہوئے ہیبت ناک سا منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اورنج کلر کی شارٹ شرٹ' بلیک ٹراؤزر پہ اورنج اور بلیک پھولوں والا اسکارف اوڑھے اپنے پانچ فٹ' چھ انچ قد کے ساتھ وہ بہت باوقار لگ رہی تھی۔ عون بھی باہر نکل آیا اور دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

صباحہ گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ عون کی طرف دیکھا' دونوں کی نظریں پل بھر کو چار ہوئیں۔ وہ بے ساختہ نظریں چرا گئی۔

"عون! اگر میں یہ کہوں کہ میں یہ سب بہت پہلے سے جانتی ہوں۔" عون ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں عون! محبت کرنے والے محبت کی پہچان رکھتے ہیں اور میں نے تو زندگی گزاری ہی محبت کے سہارے ہے۔ آویز خان وہ شخص ہے جس نے مجھے زندگی کا مفہوم بتایا ہے۔ اس کی محبت میں میرا وجود گم ہو چکا ہے۔ وہ میرا عشق ہے' میری زندگی کا حاصل ہے۔ میرا وجود فنا ہو جائے تب بھی میری روح اس کی اسیر رہے گی۔" وہ ایک جذبے سے بول رہی تھی۔

"وہ میرا نہ ہو سکا' لیکن میں آج بھی صرف اس کی ہوں۔"

اس کے چہرے پر کتنا سکون اور بے نیازی تھی' عون تو گنگ ہو کر رہ گیا۔ ایک بزنس وومین جس کا اوڑھنا بچھونا بزنس تھا' بے پناہ مصروفیت میں گھری ہر وقت متحرک رہنے والی کھلی کتاب کی مانند نظر آتی اندر سے کتنی گہری تھی۔ کتنی حسین دنیا آباد تھی اس کے اندر.... وہ بے دھیانی میں اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"کیا تم ایسی عورت کو قبول کر سکتے ہو' جس کا اندر باہر کسی اور کی محبت سے آباد ہو جس کی سوچوں' خیالوں میں کسی اور کا قبضہ ہو۔ میں زندگی میں کبھی بھی کسی دوسرے مرد سے محبت نہیں کر سکتی۔ چاہے مجھے کوئی کیسا ہی چاہنے والا مل جائے۔ یقیناً" تم ایسی عورت کو اپنانا نہیں چاہو گے' جو کسی اور کی محبت میں سر تاپا ڈوبی ہوئی ہے۔ اے ایس کمپنیز کی چیئرپرسن بتیس سالہ کامیاب بزنس وومین' جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے ابھی تک شادی اس لیے نہیں کی کہ اپنی پروفیشنل لائف میں وہ کسی کی دخل اندازی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اپنا سارا وقت' ساری انرجی اپنے بزنس کے لیے وقف کر چکی ہے۔ یہ دنیا کی نظر ہے' جیسے مرضی دیکھے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ میرا دل محبت سے سیراب ہے۔ میں نے جسے چاہا وہ نہیں ملا' میں اس کی یادوں کے سہارے زندگی بہت ہنسی خوشی گزار لوں گی۔ میری زندگی میں کسی اور گنجائش نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اب بیٹھو گاڑی میں' مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔"

بات ختم کر کے اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ عون بھی پہلو میں آ کر بیٹھ گیا۔ شاپنگ سینٹر پہنچنے تک وہ بالکل خاموش اور گہری سوچ میں گم رہا۔



وسیع و عریض' بیش قیمت فرنیچر اور ڈیکوریشن پیسز سے سجے سجائے لاؤنج میں ان دونوں کو بھی شوپیس کی طرح کھڑا کر دیا گیا۔ نیلوفر اپنے سجے سجائے

روپ کے ساتھ بہت ناز سے کھڑی تھی۔ ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ اور آنکھوں میں نشیلی سی چمک تھی۔ اس کے برعکس صباحہ بہت کنفیوز اور گھبرائی سی کھڑی تھی۔ جیسے کسی جرم کے ارتکاب میں پکڑی گئی ہو۔

اسی وقت سیڑھیوں سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ نیلوفر بڑے اعتماد سے اس بھرپور مردانہ وجاہت سے بھرپور شخصیت کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ صباحہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر تیزی سے جھکا لیں۔ بھاری قدموں کی چاپ ان کے بالکل سامنے آکر رک گئی۔ دیکھنے والے کی گہری پرتپش نگاہیں جیسے ان کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔ نیلوفر کی چمک دمک خود اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔ جبکہ دوسری لڑکی.... وہ چونک سا گیا۔

"کیا یہ دونوں لڑکیاں ایک ہی جگہ سے آئی ہیں؟" اس نے بے ساختہ ناصر سے پوچھا۔

"جی جناب۔ دونوں ایک ہی جگہ سے لایا ہوں۔" ناصر نے دونوں کو تولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا آف وائٹ سوٹ میں ملبوس بڑے سے دوپٹے سے خود کو ڈھانپے' نظریں جھکائے' ہلکے ہلکے لرزتی لڑکی کہیں سے بھی "اس جگہ" کی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ سادہ لباس' میک اپ سے پاک چہرہ' چہرے پہ چھائی معصومیت' اور خوف' لرزتی پلکیں۔ ماتھے پر نمودار ہوتے پسینے کے ننھے ننھے قطرے....

"تمہارا نام؟" وہ نیلوفر سے مخاطب ہوا۔

"نیلوفر۔" اس نے بہت مترنم لہجے میں بتایا۔

"ناصر! مس نیلوفر کو واپس بھیج دو۔" اس کا فیصلہ سن کر نیلوفر کا چہرہ اتر گیا۔ جبکہ صباحہ کو ایسے لگا جیسے کوئی بم اس کے اعصاب پر گرا ہو اس نے جھٹکا سا کھا کر آویز خان کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھیلتی حیرانی' وحشت اور ایک واضح التجا نے آویز خان کی دھڑکنوں میں اضطراب سا پھیلایا۔ صباحہ کو پورا یقین تھا کہ اسے واپس بھیج دیا جائے گا۔ نیلوفر کے آب و تاب سے چمکتے حسن کے سامنے وہ ایک بجھے ہوئے دیے کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے حواس سلب ہونے لگے ہیں۔ نیلوفر کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کب ناصر جاوید کے ساتھ وہاں سے نکلی۔ آویز خان نے کب ملازم کو آواز لگائی اور اسے آرڈر جاری کیا۔ اسے کچھ خبر نہ ہو سکی۔

"بی بی کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔" خالی خالی ذہن و نظر کے ساتھ اس نے یہ الفاظ سنے اور لرزتے قدموں سے ملازم کی پیروی میں چل پڑی۔ اس کے قدموں کی لرزش آویز خان کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔



رات تقریباً" دس بجے وہ اس کے کمرے میں آیا۔ وہ بیڈ پر دائیں پہلو کے بل آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ ایک ہاتھ تکیے پر' جبکہ دوسرا سر کے نیچے تھا۔ چہرہ مرجھایا ہوا اور آنکھیں نم تھیں۔ اس نے بے اختیار اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور چونک گیا۔ صباحہ جو اس کی آمد سے بے خبر تھی' اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔

"تمہیں تو اتنا تیز بخار ہو رہا ہے۔ ڈرو مت۔ تمہاری مرضی کے بغیر میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" اس کے لہجے کے ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی نرمی تھی۔ صباحہ کے لرزتے دل کو ڈھارس سی ملی' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں' ڈونٹ وری' ملازم نے بتایا کہ تم نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا ہے' تم اپنی مرضی سے یہاں آئی ہو اور میں نے اس کی قیمت ادا کی ہے۔ بہرحال جو بھی مسئلہ ہے تمہارے ساتھ آج ہی مجھ سے شیئر کر لو۔ تاکہ میں حتمی فیصلہ کر سکوں۔ کیا ان لوگوں نے تمہیں کڈنیپ کر رکھا ہے۔ یعنی مجبور کیا ہے اس کام کے لیے یا پھر.... آئی مین تمہارا تعلق کس خاندان سے ہے۔ ان کے ہتھے کیسے چڑھیں؟"

وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کر پوچھنے لگا۔ صباحہ کو اس کے مدھم لب ولہجے' اپنائیت بھرے انداز پر حیرانی ہوئی۔

"مجھے انہوں نے کہیں سے کڈنیپ نہیں کیا۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں وہاں پیدا ہونے کے باوجود اس ماحول کو اپنا نہیں سکی۔ نیلم جان میری نانی ہیں۔" اس نے پژمردہ لہجے میں بتایا۔

"تو پھر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ کیا فرسٹ ٹائم؟" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔

"ہاں' پہلی بار میرا سودا ہوا ہے۔" وہ نفرت آمیز انداز میں بولی۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔ اسی لیے تم گھبرا رہی ہو۔ پریشان نہ ہو۔ ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ تمہیں دوائیاں کھانا پڑیں گی۔ اس لیے پہلے کچھ کھالو۔ تمہیں جلد از جلد ٹھیک ہو جانا چاہیے۔ پلیز اپنی روتی شکل درست کرلو۔ اوکے۔ گڈ نائٹ۔"

وہ مسکراتے لہجے میں کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ صباحہ اپنے ہاتھ کی لکیروں میں نجانے کیا کھوجنے لگی۔



پچھلے ہفتے ہی اس نے سارے گھر کی سیٹنگ نئے سرے سے کروائی تھی۔ پچھلا فرنیچر نکلوا کر نیا رکھوایا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے وغیرہ رہ گئے تھے جو آج اس کے آنے سے پہلے لگا دیے گئے تھے۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس نے ایک طائرانہ نگاہ اطراف میں ڈالی اور خوش گوار احساس کے تحت مسکرا دی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہ صوفے کی جانب آئی اور پھیل کر بیٹھ گئی۔ ملازمہ نہ جانے کس کونے سے مستعدی سے حاضر ہوئی۔

صباحہ نے اسے دیکھتے ہی اپنا پاؤں پھیلا دیا۔ وہ تیزی سے آگے آئی اور مؤدبانہ انداز میں جھک کر اس کی اسٹائلش سینڈل اتارنے لگی۔ دوسری ملازمہ ٹرے میں چائے سجائے لے آئی۔ چائے رکھ کر وہ جانے لگی تو وہ پکاری۔

"سبو! تیل لے کر آؤ اور میرے سر میں مالش کرو۔"

"جی بیگم جی!" سبو نے محبت سے کہا۔ گھر کے تمام ملازم ہنسی خوشی اس کی خدمت کرتے تھے اور سب ہی اس سے خوش تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فارغ ٹائم میں وہ اکثر ان کے مسئلے' ان کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔ ان کی تمام ضروریات کا پورا خیال رکھتی' ان کی تنخواہیں' ان کی توقعات سے زیادہ تھیں۔ گھر میں ان کی حیثیت گھر کے افراد کی سی تھی۔ وہ گھر کی مالکن کو دل سے عزت دیتے تھے۔ اپنی مالکن کی ضروریات وعادات کا کسی حد تک انہیں علم تھا۔ اس لیے اکثر اس کے کہے بغیر صرف اشارے سے وہ اس کی طلب کو سمجھ جایا کرتے تھے۔ وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے سوچ میں گم تھی جب چندا خالہ وہاں آئیں۔

"آج میری بٹیا جلدی آگئی ہے' خیر ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"جی خالہ! آج کام بھی زیادہ نہ تھا' پھر مجھے خیال آیا گھر جا کر کچھ ریلیکس کیا جائے۔ تھوڑی سی خدمت وغیرہ کرالی جائے۔ آج گھر بہت چینج لگ رہا ہے اور بہت خوب صورت بھی۔" وہ اطراف میں نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔

"چلو اچھا ہے۔ میری بیٹی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتی ہے۔" چندا خالہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ اور واپسی کے لیے مڑیں۔

"کہاں جا رہی ہیں خالہ جانی! بیٹھیں نا۔۔۔ کچھ باتیں کرتے ہیں۔ ویسے آپ روز گلہ کرتی ہیں کہ میں آپ کو ٹائم نہیں دیتی اور آج میں فرصت سے ہوں تو آپ بھاگے جا رہی ہیں۔" وہ لاڈ سے بولی تو وہ مسکرا دیں۔

"میں نے کہاں بھاگنا ہے بیٹا! عصر کی نماز کا وقت جا رہا ہے' سوچا نماز پڑھ لوں۔ پھر آکر تمہارے پاس ہی بیٹھتی ہوں۔"

"اوکے اوکے" آپ پڑھ آئیں نماز۔ تب تک میں سر میں تیل کی مالش کراتی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے میگزین اٹھایا۔

رات ڈنر تک کا سارا وقت اس نے خالہ کے ساتھ گزارا اور پھر ڈنر کے بعد لانگ ڈرائیونگ پر نکل گئی۔ اسے تقریباً دو گھنٹے ہو گئے تھے' سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے۔ اس وقت وہ جہاں تھی سڑک تقریباً بالکل خالی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کی گاڑی کے پیچھے ایک گاڑی مسلسل چلی آرہی ہے' اس کی گاڑی کی اسپیڈ اتنی آہستہ تھی کہ پیچھے آنے والی گاڑی با آسانی اس سے آگے جا سکتی تھی۔ لیکن گاڑی تو اسی کے تعاقب میں تھی' کب سے' یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ مصروف شاہراہ سے نکلتے ہوئے اسے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ "سانوں اک پل چین نہ آوے سجناں تیری بنا۔" نصرت فتح علی خان کی دل کے تاروں کو چھیڑتی آواز میں وہ اس قدر گم تھی اسے خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔

"کون ہو سکتا ہے اور کیوں میرا تعاقب کر رہا ہے؟" اس نے ٹیپ ریکارڈ آف کیا اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے کشمکش و پنج میں پڑ گئی۔

پھر جان بوجھ کر اس نے گاڑی سائیڈ پہ کرتے ہوئے روک دی اور مڑ کر پیچھے آتی گاڑی کو دیکھنے لگی۔ گاڑی بھی کچھ آگے آ کر سائیڈ میں رک گئی۔ صباحہ کی ساری توجہ اسی جانب تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کی جانب کا دروازہ کھلا۔ پورے چاند کی کھلتی مدھم روشنی میں اسے جو شخصیت نظر آئی وہ چونک کر رہ گئی۔

"عون!" زیر لب کہتے ہوئے اس نے تیزی سے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔

"عون تم.... تم اتنی دیر سے میرا تعاقب کر رہے تھے' کیوں؟" وہ حیران سی اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں۔ یہ تو میں بھی نہیں جانتا' بس دل کے کہنے پر چلتا جا رہا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیسی تپش تھی کہ صباحہ نظریں چرانے پر مجبور ہو گئی۔

"دل اکثر بھٹکا دیتا ہے۔ دل کے کہنے پر چلنے والے نقصان اٹھاتے ہیں۔"

"نفع نقصان کی کسے پروا ہے۔ محبت میں سود و زیاں کا حساب نہیں رکھا جاتا۔" وہ اتنی بے ساختگی سے بولا کہ صباحہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"میں بے بس ہو گیا ہوں۔" یقین جانیے مجھے اپنے دل پر ذرا اختیار نہیں رہا۔ مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ آپ کسی کو چاہتی رہی ہیں یا اب بھی چاہتی ہیں۔ میری محبت میں اتنا دم ہے کہ وہ آپ کے دل میں مقام بنا لے گی۔" اس کے لب و لہجے سے اس کے اندرونی جذبات و احساسات عیاں تھے۔ آنکھوں میں محبت کسی دیے کی مانند لو دے رہی تھی۔ صباحہ ساکت سی کھڑی تھی۔

"مان لیتی ہوں تمہاری محبت میں بہت دم ہے۔ مگر میری زندگی آویز خان کی محبت سے شروع ہو کر اسی کی محبت میں ختم ہوتی ہے۔ دیکھو میرا خیال دل سے نکال دو۔ اسی میں بہتر ہے۔ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے' میں کبھی بھی کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ اب گھر جاؤ۔ میری طرف سے صاف انکار ہے' اوکے گڈ نائٹ۔"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے حد سنجیدگی سے کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف پلٹی۔ عون کی آنکھوں میں پانی اترنے لگا۔ وہ کافی دیر وہیں گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا آسمان پر پورے چاند میں کسی کے عکس کو تراشتا رہا۔



آفس ورکرز کے ساتھ صباحہ کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اس کے بزنس کی شان دار کامیابی کا یہ بھی ایک خاص جواز تھا۔ اس کا سارا عملہ اس کے ساتھ وفادار اور ایمان دار تھا۔ مگر عون نے اپنی ذہانت اور محنت سے ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔ وہ اس پر سب سے زیادہ

اعتماد کرتی تھی۔ اب جب سے عون کا رویّہ بدلا تھا صباحہ کا انداز بہت لیے دیے والا ہو گیا۔ وہ بزنس کے حوالے سے بھی اس سے بات کر رہی ہوتی تو بہت سنجیدہ اور تحکمانہ انداز میں۔ غیر ضروری بے تکلفی ڈیڑھ' دو ماہ میں ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس دن کے بعد عون نے کبھی اس حوالے سے کوئی بات نہ کی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں جلتے امید کے دیے صباحہ کو اکثر نظر چرانے پر مجبور کر دیتے۔ وہ اس کی آنکھوں کی لو دیتی شمعوں سے گھبرانے لگی تھی۔ وہ آج کل سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ عون کو یہاں سے فارغ کر دیا۔

اتنے قابل ورکر کو اپنی کمپنی سے علیٰحدہ کرنا اس کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ کچھ پروجیکٹ تھے جو عون کے مرہون منّت تھے۔ لہٰذا انہیں مکمل کرنے تک اسے یہاں رکھنا لازم تھا۔ اور یہ بات وہ عون سے کر چکی تھی۔ جس پر چاہنے کے باوجود وہ احتجاج نہ کر سکا۔



اس دن چھٹی تھی۔ اسے کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ وہ سبو کو ساتھ لے کر نکل آئی۔ شاپنگ سے فارغ ہو کر پارکنگ میں آئی۔

صباحہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ اچانک اس کی نظر سامنے اٹھی اور وہ جامد سی ہو کر رہ گئی۔ بلیک کلر کی مرسیڈیز کی ڈرائیونگ سیٹ کی جانب سے عون نکل رہا تھا۔ اس کے ساتھ نکلنے والے ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکن سی ہو گئیں۔ بہت سال پہلے اس شخص کی تصویر اس نے چندا خالہ کے پاس دیکھی تھی۔ گو کہ نفرت کے باعث اس نے کبھی اس تصویر کو دوبارہ دیکھنا نہیں چاہا تھا۔ مگر کہیں لاشعور میں اس تصویر کا ایک ایک نقش ٹھہرا تھا۔ گو کہ گزرتی عمر نے اس پر اثرات چھوڑے تھے' مگر چہرہ تو وہی تھا نا۔ اس شخص کو وہ کیسے نہ پہچانتی' جس کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جو اس کی تخلیق کا باعث تھا۔ بلاشبہ یہ چہرہ اس کے باپ ساجد خان کا تھا۔

وہ دونوں کسی بات پہ ہنستے ہوئے شاپنگ سینٹر کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اور وہ کسی روبوٹ کی مانند ساکت کھڑی چپ چاپ ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اطراف کے سارے منظر پر صرف وہی منظر حاوی ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کہیں خلا میں کھڑی ہے جہاں صرف اس کے باپ کا چہرہ ہے۔

سبو حیران سی اس کے ساکت وجود کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بیگم جی!" وہ فکر مندی سے گویا ہوئی۔

صباحہ نے اس کی پکار پر ایک ٹرانس کی کیفیت میں اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی ریورس کرنے لگی۔ سارے رستے وہ لب بھینچے سیدھی نظر جمائے نہ جانے کن خیالوں میں گم رہی۔ گھر آ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

اگلے روز آفس آنے کے ایک گھنٹہ بعد اس نے عون کو بلایا۔

"بیٹھو' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔

نچلے لب کو کچلتے ہوئے صباحہ اسے کچھ پل دیکھتی رہی۔ اندرونی اضطراب کی حالت میں وہ ایسے ہی کیا کرتی تھی۔ عون اس کی اس عادت سے واقف تھا۔

"کل تم شاپنگ سینٹر کس کے ساتھ گئے تھے؟ تقریباً" چار بجے کا ٹائم تھا۔" اس کا انداز تفتیشی تھا۔ صباحہ کا یہ انداز اس کے لیے حیران کن تھا۔ وہ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتی تھی۔

"میرے تایا جان تھے میرے ساتھ۔" اس نے بتایا۔

"کیا نام ہے ان کا؟" اگلا سوال بھی اسی لہجے میں پوچھا گیا۔"

"ساجد خان۔" اس نے فوراً" بتایا۔

"وہ سگے تایا ہیں تمہارے؟"

"ہاں بالکل سگے۔ میرے فادر اور تایا دو ہی بھائی ہیں۔" وہ حیران ہو رہا تھا۔

صباحہ کے اندر جیسے کوئی کلی سی کھلی۔ اس کے

سامنے بیٹھا شخص جو اب تک انجانا' بیگانہ تھا۔ کتنے گہرے رشتے میں ڈھل گیا تھا۔ اس کا چچا زاد بھائی۔"

"مجھے نہیں پتا تھا تم اتنے اچھے خاندان سے ریلیٹڈ ہو! مجھے خوشی ہوئی۔ یو نو میں تمہارے تایا کو جانتی ہوں۔ مگر وہ مجھے نہیں جانتے۔ بہت بڑے بزنس مین ہیں تمہارے تایا۔"

"عون! میرے دل میں آویز خان کی محبت کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ تم اچھی طرح غور کرلو' اگر تم اس حقیقت کو قبول کرسکتے ہو تو مجھے انکار نہیں ہے۔"

اس کے لہجے میں جھلکتی کڑوی سچائی نے عون کے دل پر گھونسا سا مارا۔

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"مجھے آپ کا ساتھ چاہیے' میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ آپ نے شادی کے لیے ہاں تو کی۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

صباحہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"چلو' پھر بھیجو اپنی فیملی کو ہمارے ہاں....."

وہ اپنے لہجے میں شگفتگی لاتے ہوئے بولی۔

عون کی آنکھوں میں روشنی سی پھیل گئی۔

"میں کل ہی اپنے گھر والوں کو بھیجتا ہوں۔" وہ صباحہ کے مسکراتے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

(صباحہ ایک بار میری ہو جاؤ' پھر دیکھنا۔ میری محبت کی کرشمہ سازیاں آویز خان کون ہے' نام تک بھول جاؤ گی۔) وہ اپنی سوچ میں گم تھا۔



تین دن ہوگئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے اور وہ ابھی تک اسی سوٹ میں تھی جو پہن کر آئی تھی۔ دوائیوں کے اثر اور مکمل ریسٹ کی وجہ سے اس کا بخار ختم ہوچکا تھا۔ آتے ہوئے جو بیگ اسے ساتھ دیا گیا تھا۔ اس نے وہ کھولا' پہننے کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔ مگر تمام کے تمام بے حد بھڑکیلے' شوخ رنگوں کے کام دار کپڑے تھے۔ اس نے سارے کپڑے اٹھا کر پرے پھینکے اور بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ کر رونے لگی۔

اسی وقت آویز خان کمرے میں داخل ہوا اور اسے یوں لیٹے دیکھ کر حیران سا ہوا۔ پھر اس کی نظر کپڑوں پر پڑی تو وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کی جانب آیا۔ وہ اس کے قدموں کی چاپ محسوس کرکے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اب کیا مسئلہ ہوگیا؟" وہ اس کے گالوں پہ پھیلے آنسو دیکھ کر بولا۔

"میرے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں۔" یہ اتنے بھڑکیلے لباس میں نہیں پہن سکتی۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"اوہ!" تو یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تم ابھی ملازمہ کے ساتھ جاؤ اور جو تمہیں پسند ہے وہ لے آؤ۔ مگر پلیز اب یہ رونا دھونا بند کردو۔ جب سے تم آئی ہو میری بوریت میں مزید اضافہ ہی کیا ہے۔" وہ کچھ اکتا کر بولا۔

"تو واپس بھیج دیں' کسی اور کو لے آئیں۔" وہ تنک کر بولی آویز خان نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"کوئی اور لانی ہوتی تو تمہیں اسی دن واپس بھیج دیتا۔ کوئی تو ایسی چیز ہے تم میں جس نے مجھے اٹریکٹ کیا میں نے ابھی تک کوئی زبردستی نہیں کی۔ کچھ نہیں کہا۔ مگر پھر بھی' تم جانتی ہو' تم یہاں کس لیے آئی ہو' اپنا مائنڈ بناؤ' اٹھو' ملازمہ کے ساتھ جاؤ۔ اپنی ضرورت کی جو چیزیں چاہئیں لے آؤ۔" اس کا لہجہ یکدم تحکمانہ ہوگیا۔

"آپ چلیں نا میرے ساتھ۔ میں کیوں جاؤں کسی ملازمہ کے ساتھ۔" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

"م.....میں۔" وہ کچھ بوکھلا کر بولا۔

"ہاں' اتنی دیدہ دلیری سے تین ماہ کے لیے مجھے اپنا بنایا ہے۔ اپنے گھر میں رکھا ہے۔ تو پھر دنیا سے کیا گھبرانا۔ وہاں امریکہ میں بھی تو آپ اپنی گرل فرینڈز کو لے کر گھومتے ہوں گے۔ مگر یہاں پاکستان میں آتے ہی آپ کے اندر عزت کا احساس بھی جاگ گیا۔ اس دوغلی پالیسی کا مطلب؟" وہ بہت سکون سے مگر تلخ لہجے

میں بولی۔
"میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ تم پوری آزادی سے اپنی مرضی کی شاپنگ کرتیں۔ اگر تم کہتی ہو تو میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" وہ اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ یہ لڑکی اس کی توقع کے کافی برعکس تھی۔
شاپنگ مکمل کرکے وہ شام کو گھر لوٹے۔ آویز اس کی شاپنگ پر حیران ہوتا آیا تھا۔ اس نے ڈریسز خریدے تھے، مگر بہت سادہ اور ہلکے رنگوں میں۔ جیولری کے نام پر اس نے ایک رنگ تک نہ خریدی تھی۔ میک اپ کا کوئی سامان نہ تھا۔ نہ ہی آرائش و زیبائش کے لیے کوئی اور شے، البتہ بک شاپ سے اس نے انگریزی اور اردو ادب کی کافی کتابیں خریدی تھیں۔
آویز خان کا کسی لڑکی کو شاپنگ کرانے کا یہ تجربہ بہت خشک رہا۔ تاہم صباحہ کی ذات میں اس کی دلچسپی مزید بڑھی تھی۔
رات کو کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں ادھر ادھر چکر لگاتے ہوئے سوچوں میں گم تھی۔ جب ملازمہ نے آکر اطلاع دی۔
"بی بی صاحبہ! آپ کو صاحب جی اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔" اطلاع پاکر اس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوئی۔
"اچھا آتی ہوں۔" کہہ کر وہ بیڈ کے کنارے ٹک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ پھر شانوں پر دوپٹہ ٹھیک کیا اور قدموں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔ دروازے پر جاکر اس نے دستک دی۔
"آجاؤ۔" اندر سے گمبھیر آواز آئی۔ اس نے دھیرے سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوئی۔ آویز خان شب خوابی کے لباس میں ملبوس جہازی سائز بیڈ پر کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا۔ سادہ سے آسمانی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس دوپٹہ اچھی طرح سینے پر پھیلائے، بال سمیٹے، میک اپ سے مبرا چہرے کے ساتھ وہ نیک پروین بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جبکہ وہ کمرے کے اطراف میں نظریں دوڑاتی اس سے یکسر بے نیاز تھی۔ کمرہ بہت نفاست اور خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ آویز خان کے شاہانہ مزاج کے عین مطابق۔۔۔
"دیکھو۔ تم مجھے مسلسل غصہ دلا رہی ہو۔ آخر میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، پھر یہ بے نیازی برتنے کا مطلب۔۔۔ حلیہ دیکھا ہے اپنا؟ ایسے جیسے چلّہ کاٹنے جا رہی ہو۔" وہ جھنجلا کر بولا۔
"جی کیا مطلب، میں سمجھی نہیں؟" وہ حیرانی سے گویا ہوئی۔
"مطلب یہ مس معصوم صاحبہ کہ آج میں تمہارا ڈانس دیکھنا چاہ رہا ہوں۔ آج تمہیں میرے بیڈ روم میں سونا ہے۔ آئی کچھ سمجھ میں یا نہیں، اور کچھ بھی بتاؤں، اور تمہارا یہ حلیہ کم از کم۔۔۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔ آج تک میں نے کسی لڑکی کے اتنے نخرے برداشت نہیں کیے، جاؤ۔ حلیہ چینج کرکے آؤ۔"
"سوری مسٹر! مجھے ڈانس نہیں آتا۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
"تو۔۔۔ تمہیں ڈانس نہیں آتا۔" اس کی حیرت سوا ہوگئی۔
"ہاں نہیں آتا۔ میں نے آج تک ڈانس نہیں کیا۔" وہ اطمینان سے بتاتے ہوئے اس کے سامنے صوفے پر ٹک گئی۔
"تم کہاں سے آئی ہو؟" اب اس نے ذرا غصے سے کہا۔
"میں وہاں سے آئی ہوں جہاں سے مجھے منگوایا گیا ہے۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔
"جہاں سے تمہیں منگوایا گیا ہے۔ وہاں لڑکیوں کو چلنا آتا ہے تو انہیں ڈانس اور گائیکی کی پریکٹس کروائی جاتی ہے، تو پھر تم ہی کیوں اناڑی ہو!"
"کیوں مجھے بچپن سے ڈانس کی تعلیم نہیں دی گئی۔ میں ہاسٹل میں رہی ہوں۔ میرا دھیان شروع سے پڑھائی کی جانب ہے۔ اس لیے نہ میں ڈانس جانتی

ہوں نہ ہی کچھ اور' آپ نے جس قسم کی لڑکی کی ڈیمانڈ کی تھی۔ اس کی ایک ہی خوبی ہے مجھ میں کہ..... کہ مجھے کبھی کسی نے نہیں چھوا۔ میں ذہنی طور پر بلکہ کسی بھی طرح اس زندگی کو اپنانے کو تیار نہیں جو میری خالہ اور نانی گزارتی آئی ہیں۔ میں یہاں آنے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے مجبور کیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں میں آپ کے کسی کام کی نہیں۔ لہٰذا آپ مجھے واپس بھجوا کے کوئی اور لڑکی منگوالیں۔"

وہ نظریں جھکائے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔ آویز تو حیران ہی رہ گیا۔ پھر طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"واہ! مائی انوسینٹ ڈارلنگ! بڑے پیارے طریقے سے مجھے الّو بنا رہی ہو۔ مجھے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن میں توجہ اسی کو دیتا ہوں جو مجھے اٹریکٹ کرے۔ لیکن تم ذرا سنجیدگی سے سوچو۔ تمہاری نانی نے آج زبردستی میرے پاس بھیج دیا ہے' کل کسی اور کے ساتھ بھیج دیں گی اور ہو سکتا ہے وہ اتنا شریف نہ ہو۔ تو پھر کیا کرو گی؟ اس لیے بہتر یہ ہے کہ میرے ساتھ ہی سمجھوتا کرلو۔ میں خوبرو ہوں' ہینڈسم ہوں' رفتہ رفتہ تم بھی سب کچھ سمجھ جاؤ گی۔ ادھر لاؤ ہاتھ۔" وہ بیڈ پر سے اٹھا ہی تھا کہ وہ چھلانگ مار کر دروازے کی جانب بڑھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتی آویز بجلی کی سی تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کا بازو پکڑ لیا.....

"زیادہ نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں یہ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔ مزید روپے' بینک بیلنس' کوئی بنگلہ' کوئی جائداد کچھ چاہیے تو منہ سے پھوٹو نا....."

اس کی کلائی سختی سے پکڑے وہ بھاری لہجے میں کہہ رہا تھا۔ صباحہ کا چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا۔ وہ کلائی چھڑانے کی تگ و دو میں روہنکھی ہو گئی۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ..... میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نے میرے ساتھ زبردستی کی تو اپنی جان لے لوں گی مگر..... عزت' عزت مجھے جان سے عزیز ہے۔"

وہ بولتے بولتے رو پڑی..... چمکتے موتیوں جیسے آنسو آنکھوں سے لڑی کی مانند بہنے لگے۔ بچوں کی مانند روتی..... سسکیاں لیتی۔

آویز خان تو پلک جھپکائے بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔ کلائی پر گرفت کب ڈھیلی پڑی..... اسے احساس نہ ہوا..... گرفت ڈھیلی پڑتے ہی آویز سے کلائی چھڑائی اور تیزی سے باہر نکل گئی..... وہ وہیں دروازے کے ساتھ کندھے ٹکا کر..... سینے پر ہاتھ باندھے..... کسی کی سوچ میں کھو گیا اپنی پوری زندگی میں اس کا آج تک ایسی لڑکی سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ صباحہ نیچے اپنے کمرے میں آ کر کافی دیر تک صوفے پر بیٹھی روتی رہی پھر اٹھ کر وضو کیا اور جائے نماز ڈھونڈنے لگی۔ کمرے میں کوئی جائے نماز نہیں تھی وہ باہر آئی۔ وہ اپنا دوپٹہ بچھا کر اسی پر نماز پڑھنے لگی نماز پڑھ کر اس نے اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا دیے۔ آویز نے دروازہ کھولا اور وہیں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ لڑکی ہر رخ سے اسے حیران کر رہی تھی۔ ماتھے تک دوپٹہ اوڑھے' بڑی عاجزی سے کھڑی وہ خشوع و خضوع سے دعا مانگنے میں مصروف تھی۔ وہ کتنی دیر وہیں دروازے پہ کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر چپ چاپ واپس چلا گیا..... اس نے آخری بار کب نماز پڑھی تھی پڑھی بھی تھی کبھی کہ نہیں۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا.....



صبح دونوں نے ناشتہ ایک ہی ٹیبل پر کیا.....

"صباحہ تم واپس جانا چاہتی ہو؟" اس نے اچانک پوچھا تھا۔

گرم گرم قیمے والے پراٹھے کا لقمہ منہ میں ڈالتی وہ تھم سی گئی۔ "کہاں واپس.....؟"

"جہاں سارا دن دھنیں چھڑی رہتی تھیں..... آتے جاتے پائلوں' گھنگھروؤں کی جھنکار سننے کو ملتی' مترنم قہقہے' مردوں کی آمد جاری و ساری رہتی..... رات بھر رقص و سرود کی محفلیں جمتیں۔ وہاں تو اس کا لمحہ لمحہ اذیت و گھٹن میں گزرتا تھا۔ یہاں سوائے آویز خان کے اس کے لیے اور کوئی مسئلہ نہ تھا۔"

"اگر..... اگر آپ چاہتے..... میرا مطلب ہے میں

واپس چلی جاتی ہوں۔"

وہ بوکھلا کر بولی۔ آویز دل ہی دل میں محظوظ ہوتا زیر لب مسکرا دیا۔

"چلو مری چلیں ..... میں تو پاکستان گھومنے پھرنے آیا ہوں ..... پاکستان کے نار درن ایریاز کے متعلق بہت کچھ سنا ہے کہ بڑی خوب صورتی ہے وہاں' چلو دونوں چلتے ہیں ایک ساتھ کچھ وقت گزاریں تو شاید ایک دوسرے کو کچھ سمجھ بھی لیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بغیر کسی پس و پیش کے مان گئی۔

نانی اور خالہ کا کیا بھروسہ تھا وہ اسے کسی اور کے سپرد کر دیتیں۔

وہ چاہتا تو اس سے زبردستی کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس کی مرضی کو اہمیت دے رہا تھا۔ یہی اس کے لیے کافی تھا۔



رشتے کی بات پکی ہونے سے لے کر شادی کے دن تک وہ ساجد خان کو نہیں دیکھ پائی تھی۔ کیونکہ وہ ملک سے باہر تھے۔ اپنے لاڈلے بھتیجے کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے وہ بارات والے دن واپس آئے تھے اور سب سے آخر میں بارات میں پہنچے تھے۔ جب دلہن اپنے عزیزوں سے ملتے ہوئے رخصت ہونے لگی تھی۔

"چندا!" دلہن کا ماتھا چومتی' دعائیں دیتی چندا پر ساجد خان کی نظر پڑی تو وہ چونک گئے ..... اور بلا ارادہ اس کی نظروں سے اوجھل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ گھر آکر وہ سیدھے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ تقریباً بیس منٹ بعد ان کی اہلیہ ارشاد بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور خشمگیں انداز میں بولیں۔

"آپ ایک تو آئے لیٹ ہیں۔ دوسرے ادھر کمرے میں آکر گھس گئے ہیں اور کچھ نہیں تو بھتیجے کو گلے لگا کر مبارک باد ہی دے آئیں ..... ادھر ان کے پورشن میں کتنی رونق ہے اور آپ یہاں اکیلے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اچانک خیال آنے پر وہ آگے بڑھیں اور ان کا ماتھا چھوا .....

"ٹھیک ہوں میں۔" انہوں نے بیگم کا ہاتھ جھٹک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "یہ جہاں عون کی شادی ہوئی ہے ان لوگوں کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟" وہ تفتیشی انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"فیملی بیک گراؤنڈ کافی شاندار ہوگا لگتا تو ایسا ہی ہے۔ لڑکی خود اتنی بڑی بزنس وومن ہے۔ پاکستان بھر میں اس کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ عون کی باس ہے یہ لڑکی ..... اور جہاں تک فیملی کا تعلق ہے والدین حیات نہیں ہیں ..... رشتے دار بھی کوئی خاص نہیں گھر میں ایک صباحہ کی خالہ ہے ..... شاید اسی نے اسے پالا پوسا ہے۔"

"کیا نام ہے لڑکی کا؟ وہ چونک گئے۔

"صباحہ۔" انہوں نے دہرایا ..... ساجد خان جیسے کرنٹ کھا کر بیڈ سے اٹھے۔ ان کی اپنی بیٹی بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی ..... ان کے چہیتے بھتیجے کی دلہن ان کی اپنی بیٹی تھی ..... مگر وہ بزنس وومن کیسے بن گئی؟ ان کے دل میں کھد بد ہونے لگی۔ دماغ میں ہزاروں سوال چکرانے لگے۔

"آپ پریشان کیوں ہیں کیا مسئلہ ہے!" ارشاد بیگم کی آواز میں واضح فکرمندی تھی۔

"کچھ نہیں ..... بس ایسے ہی ..... صباحہ کے والدین سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے ..... کوئی خاص بات نہیں۔" اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے بمشکل کہا۔

"اے لو' آپ بھی کس بات میں الجھ گئے ..... مجھے تو رشک آرہا ہے عون کی قسمت پر اتنی جائداد کی اکلوتی وارث نا آگا نا پیچھا ..... آجا کے ایک خالہ ہی خالہ ..... عون کے تو عیش ہو گئے ..... خوب صورت بھی ہے بس ذرا عمر میں زیادہ ہے۔ مگر اتنی خوبیوں میں یہ خامی تو لگتی ہی نہیں۔ افوہ میں کن باتوں میں پڑ گئی ..... آپ کو بلانے آئی تھی' چلیں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

"ہاں' چلتا ہوں ....." آہستگی سے کہتے وہ ارشاد بیگم کے پیچھے کمرے سے نکلے۔ ہال کمرے میں دلہن ابھی سب کے درمیان ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ عون انہیں دروازے کے قریب ہی کھڑا مل گیا۔ انہوں نے اسے

بیٹی سے لگا کر پیار کیا۔ پھر دلہن کی جانب بڑھے تو انہیں محسوس ہوا کہ ان کا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا ہے..... اس بیٹی کو شاید کیا یقیناً" زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ جو دلہناپے کے روپ میں بھی چہرے پر ان کے عکس کی جھلک دکھا رہی تھی۔ بمشکل قدم اٹھاتے وہ اس تک آئے۔

صباحہ نے دھیرے سے سر اٹھایا اور ایسی نظروں سے ان کی جانب دیکھا کہ ان کا دل پل بھر کو رک سا گیا۔ پہچان، فتح مندی، طنز، دکھ، محرومی سب کچھ تو تھا ان آنکھوں میں اور ایک خوشی کی چمک بھی.....

" صباحہ! یہ عون کے چاچو ہیں۔ آج ہی پاکستان آئے ہیں۔" پاس ہی کسی ادھیڑ عمر عورت نے تعارف کروایا تو وہ مسکرا کر بولی۔

" آداب چاچو جان.....!"

" اوہ ماشاء اللہ، ہماری بہو تو بہت خوب صورت ہے۔ بہت پیاری..... ہمارے بھتیجے کی پسند لاجواب ہے۔" صباحہ کے چاچو کہنے پر وہ کچھ ہلکے پھلکے ہو کر بولے۔

" بیٹھیے نا ساتھ کچھ تصویریں بنوالیں۔" ان کی بیگم جلدی سے بولیں..... تو صباحہ کے ساتھ بیٹھی نند اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

" صباحہ کا دل ایک دم اداسی کی دھند میں کھو گیا.....

" بہو..... بہو کیا تھا جو یہ بیٹی کہہ دیتے۔"

رات ایک بجے اسے حجلۂ عروسی میں لایا گیا۔ بیڈ پر تکیے کے سہارے وہ ایزی ہو کر بیٹھ گئی۔ کمرہ بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ مگر کوئی بھی چیز اسے خوشی نہیں دے رہی تھی۔ اپنے سجے سجائے روپ سے اسے کوفت سی ہونے لگی۔ وہ بیڈ پر سے اٹھنے ہی لگی تھی جب عون کمرے میں داخل ہوا.....

عون اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ کل تک جو لڑکی اس کی باس تھی۔ اس پر حاکم..... مشینی انداز میں زندگی گزارنے والی آج..... آج مکمل مشرقی روپ میں اس کی دلہن بنی بیٹھی تھی..... میرون کلر کے لہنگے میں ملبوس اور زندگی میں شاید پہلی بار اس نے جیولری پہن رکھی تھی۔ وہ مجسمۂ حسن لگ رہی تھی۔ وہ بہت مسرور سا اس کی جانب بڑھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی..... عون اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سرخ رنگ کی مخملیں ڈبیہ نکالی۔

" بہت بہت، بے تحاشا حسین لگ رہی ہو۔ رونمائی کے قابل کوئی چیز لگی نہیں۔ مگر مجھے بہت شوق ہے کہ آپ کے پاؤں میں ہمیشہ پائل بجی رہے میں نے رونمائی کے طور پر یہ پازیب خریدی ہے۔" اس نے ڈبیہ کھولی۔ پائل نکال کر نیچے جھکا ابھی اس نے اس کا پاؤں پکڑا ہی تھا کہ صباحہ نے زور سے پاؤں..... جھٹکا .....

" پلیز عون! مجھے چینج کر کے ریسٹ کرنا ہے..... میں بہت تھک چکی ہوں۔" وہ بے دلی سے کہتے ہوئے اٹھی.....

عون کا ہاتھ جہاں کا تہاں ساکن ہو گیا۔ عون کے دل میں مچلتے ارمانوں پر اوس سی پڑ گئی۔ دل میں دھواں سا بھر گیا.....

صباحہ ڈریسنگ روم میں جا چکی تھی..... جبکہ وہ کتنی دیر بے حس و حرکت وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور ڈریسنگ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ آف وائٹ کلر کی شیروانی میں اس کا دراز قد بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے ہی اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ پوری طرح کسی اور کی محبت میں گم ہے..... مگر جب اس نے شادی کے لیے اقرار کیا تو خوش گماں دل نت نئے سپنے دکھانے لگا۔

اس کے دل تک پہنچنے کے لیے اس کو طویل ریاضت درکار تھی۔ اس نے ایک گہری، یاسیت میں لپٹی سانس خارج کی اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

صباحہ جب باتھ روم سے نکلی تو گلابی رنگ کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس تھی۔ چہرہ دھلا دھلایا تھا۔ عون نے ایک پیاسی سی نظر اس پر ڈالی..... ابھی کچھ دیر پہلے

دلہناپے کے روپ میں وہ کیا غضب ڈھا رہی تھی.....
اور وہ اس کی تعریف بھی نہ کر پایا تھا۔
"صباحہ بہت ظلم کیا ہے تم نے مجھ پر..... کتنے دنوں سے میں نے الفاظ بُن رکھے تھے ..... صرف تمہیں سوچتے ہوئے..... سب ریت کی طرح پھسل گئے۔" وہ سوچتا ہوا اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا..... باہر آیا تو صباحہ کو بستر کے بائیں طرف دائیں پہلو کے بل سویا ہوا پایا..... کچھ دیر اس کے بے خبر وجود کو تکتا رہا پھر دوسری طرف آکر لیٹ گیا۔



شادی کے بعد چوتھے روز سے صباحہ نے آفس جانا شروع کر دیا..... گھر میں سب کے ساتھ اس کا رویہ بہت اپنائیت بھرا تھا۔ وہ جلد ہی سب سے مانوس ہو گئی۔
شام کو روزانہ وہ چند اخالہ کو بھی مل آتی۔ چوتھے ہی روز اس کا آفس جانا سب کو بہت کھٹکا مگر کسی نے اظہار نہ کیا۔ اگلے روز سے عون نے بھی آفس جانا شروع کر دیا۔
"بھئی شادی کے شروع کے دن ہی تو انجوائے کرنے کے ہوتے ہیں کچھ دن گھومو پھرو..... ہنی مون پہ جاؤ..... زندگی پڑی ہے کام کے لیے۔"
اس دن وہ دونوں اکٹھے ہی آفس کے لیے نکلنے لگے تو سدرہ بھابھی نے پیار بھرے لہجے میں دونوں کو ٹوکا۔
"ارے بھابھی جان! ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنا بھی ہنی مون سے کم نہیں۔" عون نے جلدی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ تو سدرہ مسکرادی۔
صباحہ! کیا خیال ہے ہنی مون کا پروگرام نہ بنایا جائے۔ میرا بہت دل چاہتا ہے میں تمہارے سنگ ساری دنیا گھوم ڈالوں..... بس تم اور میں 'میں اور تم۔"

"اسٹاپ اٹ عون ....." وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اپنی دھن میں مست' آنکھوں میں چمک لیے امید بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔ جب صباحہ نے بے حد ناگواری سے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔ عون نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ تیوریاں چڑھائے آنکھوں میں واضح بے زاری لیے وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ عون کے دل پر گھونسا سا پڑا۔
"صباحہ! مجھے' میرے وجود کو تو نظر انداز نا کرو کم از کم ..... تمہارا دل تمہارے بس میں نہیں۔ میں شکایت نہیں کرتا..... مگر کیا ہم اچھے دوست بھی نہیں بن سکتے۔ 'میں تو سمجھا تھا اس مشینی لائف سے تم اکتا چکی ہوگی تمہاری زندگی میں کوئی نیا پن لاؤں..... لیکن تم تو..... نئے دروازے کھولنے کو تیار ہی نہیں۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"میں نے کب کہا تھا تمہیں کہ میں اپنی روٹین لائف سے بیزار ہوں تم شاید سمجھ نہیں سکے کہ میں کام کو عبادت کی طرح کرتی ہوں اور اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش تھی مجھے افسوس ہے کہ شادی کر کے اپنے ساتھ تمہیں بھی کوفت میں مبتلا کر دیا۔ تم جن امنگوں کے ساتھ یہ رشتہ نبھانا چاہ رہے ہو شاید میں اتنا رسپانس نا دے سکوں مگر کوشش کروں گی کہ تمہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔ اگلے مہینے بزنس کے سلسلے میں کینیڈا جانا ہے وہیں سے تفریح کے لیے سوئٹزرلینڈ چلیں گے..... ورلڈ ٹور کے لیے نہ تو میرے پاس وقت ہے اور نا ہی کوئی خواہش۔" وہ کہہ کر چپ ہو گئی۔
عون اسے دیکھ کر رہ گیا۔



اگلے دن سنڈے تھا۔ "دی پرنس" کی اسٹڈی کے بعد وہ اسے واپس لائبریری میں رکھنے آئی تھی۔ لائبریری کا دروازہ کھول کر اس نے اندر قدم رکھا..... سامنے ہی چیئر پر ساجد خان کوئی کتاب کھولے بیٹھے تھے۔ آنکھوں پر عینک جمائے وہ پوری طرح کتاب میں گم تھے۔ صباحہ دروازے میں کھڑی کچھ پل انہیں تکتی رہی پھر..... ساجد خان نے ذرا سی ذرا نظر اٹھائی۔
"آجاؤ بیٹی' وہ مسکرا کر بولے۔
صباحہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے حسرت

سے انہیں دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں کیسا بے چین کر دینے والا سوال تھا۔ ساجد خان مضطرب سے ہو گئے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی شیلف کی طرف بڑھی۔ کتابوں کے درمیان کتاب رکھی اور پھر مڑ کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ بھی اسی کی طرف متوجہ تھے۔

"آپ اتنے انجان کیوں بن رہے ہیں۔ یا واقعی ہی کچھ نہیں جانتے؟" سوال بے ساختہ اس کے لبوں سے پھسلا۔

ساجد خان چونک کر رہ گئے۔۔۔۔ "ک۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔ کیا نہیں جانتا؟" وہ کچھ بوکھلا سے گئے۔

"یہی کہ میں۔۔۔۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔۔۔۔ آپ کا خون۔۔۔۔ آپ کے وجود کا ایک حصہ کیا۔۔۔۔ کیا نہیں جانتے آپ؟"

ساجد خان کے اوپر چڑھا خول ٹوٹ کر بکھر گیا۔۔۔۔ کتنے پل وہ ساکت سے اسے تکتے رہے۔

"ہاں ہوں میں تمہارا باپ۔۔۔۔ تمہاری ماں سے نکاح کیا تھا میں نے۔۔۔۔ مگر وہ میری ایک غلطی تھی۔۔۔۔ اور تم میری ایک غلطی کا حاصل۔۔۔۔ انسان لاشعوری طور پر اپنی غلطیاں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔۔۔۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے معاشرے میں باعزت نام بنایا۔ اس گھر کا کوئی فرد نہیں جانتا تمہاری پرورش کیسی عورتوں نے کی ہے۔۔ صرف میں ہم اور چندا جانتے ہیں اس تعلق کو۔۔۔۔ تمہیں جب میری ضرورت تھی۔ تب میں تمہارا باپ نہیں بنا تو اب اسی میں تمہاری عزت اور میری عزت ہے کہ یہ بات چھپی رہے معاشرے میں تم میری حیثیت کا اندازہ کر چکی ہو گی۔ بہت عزت اور وقار ہے میرا' یہ بات سامنے آئی تو ہم دونوں ہی اپنی حیثیت سے بہت نیچے آجائیں گے۔ تم میری بیٹی ہو۔ میری جائز اولاد۔۔۔۔ میرا خون۔۔۔۔ میں مانتا ہوں اور اس بات پر بھی خوشی ہے کہ قدرت نے تمہیں اسی گھر میں جگہ دی۔ چاہے میں نے تمہارے وجود سے انکار کیا۔ میرے دل کے اندر کہیں کسک تھی کہ کاش اپنی باقی اولاد کی طرح تمہیں بھی اپنے ساتھ رکھتا۔۔۔۔ تم بھی معاشرے میں ان کی طرح باعزت مقام پاتیں مگر تم تو آج ان سے بھی کہیں آگے ہو! میرے دل کو اطمینان ہے۔۔۔۔ اس کے لیے میں چندا کا بھی مشکور ہوں کہ بلیک میلنگ کے نام پر اس نے جو رقم مجھ سے لی وہ تمہاری تعلیم و تربیت پر خرچ کی۔"

صباحہ کی آنکھوں میں دھند سی بھر گئی۔ اس کا باپ اسے چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا وجود اس کے لیے ذلت و شرمندگی تھا۔ یہ بات اس کے دل کو چیر رہی تھی۔

"اوکے۔۔۔۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں یہ بات ظاہر نہیں کروں گی۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی لائبریری سے نکل گئی۔

نیچے آکر اس نے پورچ سے گاڑی نکالی اور لانگ ڈرائیو پر نکل گئی۔

شام کو وہ لوٹی تو لان میں ہی سب مل گئے۔ وہ ان سے ہیلو ہائے کرتی اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ عون بیڈ پر کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے سنجیدہ چہرہ لیے نیم دراز تھا۔ انگلیوں سے ماتھے کو ہلکے ہلکے سہلا رہا تھا۔ صباحہ کمرے میں داخل ہوئی تھی تو اس نے ایک ناراض سی نظر اس پر ڈالی۔

"کہاں تھیں تم؟" اس کے لہجے میں شوہروں والا رعب اور غصہ تھا۔ صباحہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ "لانگ ڈرائیونگ پر نکل گئی تھی۔" سرسری سے لہجے میں جواب دے کر وہ باتھ روم کی جانب چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد باہر نکلی۔۔۔۔ ہاتھ لے کر وہ بالکل مختلف حلیے میں تھی۔ پرپل اور بلو کنٹراس کے سوٹ میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ بالوں کو ڈرائر سے خشک کر کے وہ بیڈ کی جانب بڑھی۔

"صباحہ! میرے سر میں درد ہے پلیز ایک کپ چائے تو بنا دو۔" عون کا لہجہ بھاری سا تھا۔ صباحہ نے حیران ہو کر اس کی جانب دیکھا۔ اس نے تو کبھی گلاس بھی ادھر سے ادھر نہ رکھا تھا۔

"میں ملازمہ کو کہتی ہوں بنا لاتی ہے۔" وہ کہہ کر دروازے کی جانب بڑھی۔

"نہیں تم بنا کر لاؤ اپنے ہاتھوں سے۔ میرا بہت دل چاہ رہا ہے تمہارے ہاتھ کی چائے پینے کو" اب کے اس کے لہجے میں تحکم بھی تھا۔

"عون! میں نے کبھی چائے نہیں بنائی مجھے صحیح طرح پریکٹس نہیں ہے اگر ٹھیک نہ بنی تو۔" وہ پریشان سی ہو کر بولی۔

"نو ٹینشن یار! وہاں کک سے پوچھ لینا۔ جیسی بنتی ہے بنالاؤ۔" وہ الجھ کر بولا۔

صباحہ حیران سی اسے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی۔ دس منٹ بعد وہ چائے کے ساتھ اندر آئی۔ چائے کا کپ عون کو پکڑا کر وہ بیڈ کے دوسری طرف آگئی۔

"اچھی بنی ہے چائے۔" ایک گھونٹ لے کر وہ بولا ..... صباحہ بے نیازی سے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

اب وہ کیا بتاتی کہ چائے تو کک نے بنائی ہے وہ تو اس کے پاس کھڑی رہی تھی۔

"صباحہ! میرا سر دبا دو۔" چائے پینے کے عون نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی فرمائش پر صباحہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ ایک تو آج سارا دن انتہائی ڈپریشن میں گزرا تھا..... اب ریسٹ کا موڈ ہو رہا تھا تو عون صاحب کو آج ہی سارے نخرے دکھانے یاد آ رہے تھے۔

"عون! میں خود آج بہت ٹینشن میں رہی ہوں اب ریسٹ کرنا چاہ رہی ہوں تم کوئی پین کلر وغیرہ لے لو....." وہ سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔

"ٹینشن تو تم اپنے ساتھ جہیز میں لائی ہو صباحہ! جو ساری زندگی تمہارے ساتھ رہنی ہے۔ اپنی اس خوب صورت ٹینشن میں تم مجھے "اپنے مجازی خدا کو بھی فراموش کر دیتی ہو! آج سارا دن تم اپنی ٹینشن کے ساتھ گھر سے باہر رہی ہو مجھے بھی بتائے بغیر تو اب تھوڑا سا وقت مجھے دے دو گی تو کوئی حرج نہیں ہو گا تمہارا۔" وہ بہت طنزیہ لب و لہجے میں کہہ رہا تھا۔

صباحہ ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئی۔



مری کی حسین وادیوں میں اترتے ہی اس کے وجود میں زندگی دوڑ گئی۔ اسے بھول گیا کہ وہ ایک غیر محرم، ایک اجنبی کے ساتھ کس مقصد کے لیے یہاں آئی ہے۔ سفید پوش پہاڑوں، سرسبز بلند و بالا درختوں، برف کے بڑے بڑے تودوں کے درمیان وہ خود کو بہت خوش، مطمئن اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

آویز تو پاکستان آیا ہی سیر و تفریح کے لیے تھا۔ مگر اس وقت اس سے زیادہ صباحہ خوش تھی۔ اور وہ اس کی خوشی پر حیران ہو رہا تھا۔ روتی، بلکتی، منہ بسورتی لڑکی کی جگہ ایک دم ہنستی کھلکھلاتی، زندگی سے بھرپور لڑکی نے لے لی تھی۔ انہیں دو دن ہو گئے تھے یہاں آئے ہوئے ایک کاٹیج وہ کرائے پر لے چکے تھے۔ دونوں کے روم علیٰحدہ علیٰحدہ تھے۔ آویز نے خواہش کے باوجود اسے تنگ نا کیا نہ ہی اس کی خلاف مرضی کوئی بات کی اسے اس کے مسکراتے لب، چمکتی آنکھیں بہت بھا گئی تھیں وہ چاہتا تھا کہ ایک دفعہ اس میں زندگی بھرپور طریقے سے دوڑے..... اس کی بے خبری، معصومیت پہ اسے بے ساختہ پیار آتا۔ ابھی بھی وہ دونوں ناشتے کے بعد سرسبز درختوں کے سائے میں گھومتے پھر رہے تھے.....

"آویز! دوڑ لگائیں؟" اچانک صباحہ نے پرشوق لہجے میں کہا آویز کے ہی کہنے پر اس نے اسے آویز کہنا شروع کیا تھا۔

"وائے ناٹ" "اٹ از امیزنگ..... اس نے بخوشی ہامی بھری۔

"چلو ادھر سے کھڑے ہو کر....." وہ چند قدم آگے جا کر کھڑی ہوئی..... اور ایک قدم آگے ایک پیچھے کر کے کھڑی ہو گئی۔ آویز بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"تھری..... ٹو..... ون..... اینڈ گو۔" صباحہ نے با آواز بلند کہا اور ساتھ ہی دوڑ لگا دی۔ ٹیڑھی میڑھی جگہوں پر بھاگنا آسان نا تھا۔ مگر وہ دونوں بہت مہارت سے بھاگ رہے تھے۔ پہلے کافی دور تک وہ دونوں برابر ہی دوڑتے رہے۔ آگے جا کر جس رخ پر آویز بھاگ رہا تھا۔ وہاں جگہ زیادہ ہی اونچی نیچی تھی۔ سو وہ پیچھے رہ گیا اور صباحہ آگے نکل گئی۔ تقریباً" بارہ سے چودہ قدم

آگے جا کر اس نے وکٹری کا نشانہ بنا کر آویز کو دکھایا۔ پہلے تو وہ اس کی بچکانہ حرکت پر مسکرا دیا پھر نجانے کیا خیال آیا اس نے اپنی رفتار ایک دم سے ہی بڑھا دی ..... اگلے ہی لمحوں میں وہ اس کے قریب آگیا۔ صباحہ کو بازو کے حلقے میں لے کر اس نے پوری قوت سے گھما ڈالا۔

اس کی اس جسارت پر صباحہ پہلے تو بھونچکا رہ گئی پھر وہ زور دار انداز میں ٹانگیں چلانے لگی اور اپنا ناخن آویز کے بازو میں کھبو ڈالا ..... آویز نے اس کی اس حرکت کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور دو تین چکر دلانے کے بعد اسے ایک دم چھوڑ دیا۔ وہ گرتے گرتے سنبھلی..... آویز بہت زیادہ ہنس رہا تھا۔ اندرونی خوشی لالی بن کر اس کے چہرے پر چمکنے لگی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" وہ طیش میں بولی۔ اس کا پورا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں غصے کے باعث سرخی تیر رہی تھی۔ اس کے اتنے خطرناک تیور دیکھ کر آویز کی ہنسی ایک دم رک گئی۔ وہ حیران سا دیکھنے لگا۔ غصے میں لال سرخ ہوتی، ہولے ہولے لرزتی وہ بہت دلکش اور منفرد سی لگی۔ آویز کی آنکھوں میں شوخی سی ابھری ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ۔

"کتنے رنگ ہیں تمہارے ڈارلنگ، تمہارا ہر رنگ پہلے سے زیادہ انوکھا اور خوب صورت ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ایک ہی کاٹیج میں رہتی ہو! باتیں کرتی ہو! سارا دن گھومتی پھرتی میرے ساتھ ہو ..... کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا ہم دونوں کا ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ ہر لمحے کا ہم دونوں کا ساتھ ہے۔ پھر یہ اجتناب یہ دوری گریز یہ سب تو تڑپانے والی بات ہوئی ..... "پل دو پل کی ہے کہانی، چار دن کی ہے یہ جوانی۔"

وہ شرارتی انداز میں گنگناتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ تو وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

"اگر تم نے کوئی بھی گری ہوئی حرکت کی تو یقین مانو یا میں خود کو نقصان پہنچا لوں گی یا تمہیں ....."

"کیا کرو گی تم!" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"جو بن پایا ..... اور کچھ نہیں تو جان پر کھیل جاؤں گی۔ جان مجھے عزت سے بڑھ کر نہیں۔" وہ بہت اٹل لہجے میں بولی۔

"جب تم اتنی باکردار، عزت دار، صاف شفاف خیالات کی مالک ہو تو پھر میرے ساتھ ٹھہرنے کا مطلب ..... ان وادیوں میں، ان رومینٹک حسین مناظر میں مجھے ساتھ بھی رکھو اور تڑپاؤ بھی ..... کیا وجہ ہے؟ جب ہم آئے تھے میں نے تمہارے ساتھ دو چوائسز رکھی تھیں۔ یا میرے ساتھ مری چلو یا پھر واپس چلی جاؤ اور تم نے اپنی مکمل رضا مندی سے میرے ساتھ آنے کو ترجیح دی اور اب خود ہی ..... جبکہ تم جانتی تھیں میں تمہیں کس لیے ساتھ رکھ رہا ہوں ..... پھر اس سب کا مطلب ..... یہ چونچلے، یہ نخرے مجھے کوفت میں مبتلا کر رہے ہیں۔ تم چاہتی کیا ہو! کیوں آئی ہو میرے ساتھ؟" وہ جھنجلا کر بولا۔

"اس لیے کہ اگر میں واپس چلی جاتی تو میری نانی مجھے کسی اور کے حوالے کر دیتیں ..... جب میں یہاں سے ناکام لوٹتی تو وہ مجھ پر ضرور توجہ دیتیں۔ مجھے رقص، گانا سیکھنے پر مجبور کرتیں۔ کسی ایسے شخص کے حوالے کر دیتیں جو ..... جو شاید آپ جتنا اچھا نہ ہوتا۔" آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے اس کی نظریں جھک گئیں۔

"تو کیا میں اچھا ہوں؟" وہ لطف لینے والے لہجے میں بولا۔

"ہاں، کچھ کچھ۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"کیوں اچھا ہوں؟" اگلا سوال داغا۔

"معلوم نہیں۔" وہ الجھ کر بولی۔

آویز کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ "تو کیا تم میرے ساتھ مکمل کمپرومائز نہیں کرو گی...؟"

"نہیں۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

"اچھا تو پھر کیا کرنا ہے؟ میں تمہاری خاطر یہاں آیا کہ شاید موسم، ماحول رومینٹک اثرات ہی تمہیں تھوڑا بہت بدل دیں۔ لیکن صد افسوس تم بدلی تو ہو مگر میرے کسی کام کی نہیں ہو! اب تمہارا کیا کروں.....

واپس تم جانا نہیں چاہ رہی ہو! میرے ساتھ تم ایڈجسٹ نہیں ہو رہیں..... تو کیا کرنا ہے؟ کچھ سوچا تم نے؟" میں ایک رنگین، شوخ، دل پھینک، جذبات، خواہشات سے بھرپور ایک مکمل رومینٹک بندہ ہوں۔ اور تم ایک بھولی بھالی، نوخیز کلی کی مانند کھلتی ترو تازہ شاداب لڑکی جسے دیکھ کر شریف سے شریف، پرہیزگار سے پرہیزگار انسان کا ایمان بھی ڈگمگانے لگے۔

اب تک تمہیں تنگ نہیں کیا اس بات پر میں خود بھی بہت حیران پریشان ہوں کہ مجھ میں اتنا ظرف، اتنی قوت برداشت کہاں سے آ گئی۔ اب تک اگر ایسا نہیں ہوا تو ضروری نہیں میں ہمیشہ ہی ایسا رہوں۔" درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے کوئی بہت اہم اور سیریس مسئلہ زیر بحث ہو۔ اس کے انداز پر صباحہ کی ہنسی چھوٹ گئی جس کو اس نے بمشکل دبایا۔ وہ اس کی بات کو سیریس نہیں لے رہی تھی اس بات پر آویز کو دل ہی دل میں حیرانی ہوئی۔

"واپس تو میں واقعی نہیں جانا چاہ رہی۔ لیکن جو آپ چاہتے ہیں۔ وہ بھی ممکن نہیں اگر آپ کو منظور نہیں تو چلی جاؤں گی۔ آگے وہاں کے حالات سے کیسے نبٹوں گی یہ میرا دردِ سر ہے۔"

اس نے لاپرواہی سے انداز میں جواب دیا۔ درخت کی شاخ کو پکڑ کر ادھر ادھر جھلاتی وہ ایک اسکول جاتی لاپروا سی بچی کی مانند لگ رہی تھی —— اس کی اس معصوم سی ادا پر اسے دل ہی دل میں پیار سا آ گیا۔

"چلو دیکھتا ہوں مزید کتنے دن میں اپنے اوپر قابو رکھ سکتا ہوں۔ تم ہو بھی تو اتنی پیاری سی واپس بھجوانے کو دل نہیں چاہتا..... جتنے دن تمہارے ساتھ گزر سکتے ہیں وہی سہی۔"

وہ دھیرے لہجے میں بولتا ہوا آگے بڑھا! صباحہ بھی اس کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگی۔ سرسبز پتوں سے اور گھاس سے بھری زمین پر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے دور نکل گئے..... دونوں کا موضوع بدل چکا تھا۔ پچھلے دنوں کی چمکیلی دھوپ کے برعکس آج موسم کافی خوشگوار تھا۔ گہرے سبزے، پھولوں، آبشاروں سے بھری زمین پر بادلوں سے پُر آسمان بہت خوب صورت منظر پیش کر رہا تھا۔ سفیدی سے ڈھکے پہاڑ اپنا الگ ہی حسن رکھتے تھے۔ ان دونوں نے آج بہت سی تصویریں بنوائیں..... مختلف جگہوں پر مختلف پوز کے ساتھ درختوں کے ساتھ کھڑے ہوئے، چیئر لفٹ پر، ہارس رائیڈنگ کرتے ہوئے۔ دوڑتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے۔

اس وقت وہ دونوں برف پر کھڑے تھے۔ آویز کو نجانے کیا خیال آیا اس نے برف پر اپنا اور صباحہ کا نام درج کر کے ایک سائیڈ پہ اسے کھڑا کیا دوسری پہ خود کھڑا ہوا درمیان میں ان دونوں کا نام تھا۔ اس جگہ پر اس نے پانچ چھ تصویریں بنوائیں۔

شام اترتے ہی آسمان پر سے برف کے گولے پگھلنے شروع ہو گئے۔ پانی رم جھم پھوار کی مانند زمین پر برس رہا تھا..... وہ دونوں اسی پھوار میں بھیگتے اپنے کاٹیج میں آئے۔ کاٹیج تک آتے آتے ہی دونوں کے کپڑے بھیگ گئے۔ آویز نے گرے شرٹ اور بلیک پینٹ پہن رکھی تھی..... جبکہ صباحہ لائٹ بلیو کلر کے شیفون کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ جو گیلا ہونے کے باعث اس کے جسم سے چپکا جا رہا تھا۔ کاٹیج میں داخل ہوتے ہی اس نے بے دھیانی میں چادر اتار کر سائیڈ پہ رکھی۔

اسی وقت آویز کی نظر اس پر پڑی وہ بھونچکا رہ گیا۔ صباحہ کا جسم خوب صورتی کے ہر معیار پر پورا اترتا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ اس کے ساتھ تھی اور وہ اندازہ نہ کر سکا تھا۔ اس کے کپڑے عموماً ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے۔ ہاف بازوؤں میں اس نے اسے ایک دن بھی نہ دیکھا تھا۔ دوپٹہ اچھی طرح سے وہ سینے پر ڈالے رکھتی تھی۔ مگر اب تو جیسے ایک قیامت اس کے سامنے کھڑی تھی۔

صباحہ کی نظریں سرسری سے انداز میں اس کی جانب اٹھیں اور مارے شرم کے فوراً ہی جھک گئیں۔ اپنی بے خبری اور لاپروائی کو کوستی وہ باتھ روم کی جانب بھاگی۔ آویز وہیں کارپٹ پر میز پر ایک کہنی ٹکائے بیٹھ گیا۔

"اتنا قیامت خیز حسن میرے ساتھ میرے اتنے قریب ہے اور میں کتنا بے خبر' کتنا انجان ہوں..... اور یہ مجھے ہو کیا گیا ہے جیسے جیسے وہ کہتی ہے ویسے ویسے میں کرتا جاتا ہوں' میری اپنی تو کوئی مرضی رہی نہیں جیسے' کیسی جادوگرنی ہے میرے اعصاب' میرے نفس کو اپنے ماتحت کر کے رکھا ہوا ہے اور کتنے مضبوط دل کی بھی' مجھ جیسا' ہینڈسم لڑکا جسے دیکھتے ہی لڑکیاں پاگل سی ہو جاتی ہیں اور یہ..... اس نے تو الٹا مجھے بے وقوف بنا کے رکھا ہوا ہے..... میرے ساتھ رہ رہی ہے اور اس کا ذرا دل نہیں چاہتا کہ مجھے چھوئے..... میرے سینے سے لگے..... کس مٹی کی بنی ہے یہ نازنین' ذرا باہر نکلے تو سہی..... مجھے کیا کاٹھ کا الو سمجھ رکھا ہے۔ اتنا حسن کس کے لیے سنبھال رکھا ہے..... ہے تو ایک طوائف زادی ہی' میں نہ سہی کوئی اور قبضہ جما لے گا۔ تو پھر مجھ میں کیا کمی ہے؟"

وہ دل ہی دل میں خطرناک ارادے باندھ رہا تھا۔

جب صباحہ باتھ روم سے نکلی..... اب وہ بالکل مختلف حالت میں تھی پیلے اورنج کلر کے کنٹراس سوٹ میں ملبوس دوپٹہ ماتھے تک سلیقے سے اوڑھے..... چہرے پر انوکھا ہی روپ لیے سامنے آئی تو آویز خوب جھنجلایا۔

"محترمہ نیک پروین صاحبہ! یہ ملانی روپ دھار کر میرے سامنے نا آیا کرو۔" وہ انتہائی بے زار لہجے میں بولا۔

"جی وہ میں نماز کی تیاری میں ہوں..... مغرب کی اذان ہو چکی ہے اس لیے۔"

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور غائب ہو گئی۔ آویز وہاں سے اٹھا وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں چلا گیا۔

جب وہ نہا کر نکلا تو صباحہ چائے بنانے میں مصروف تھی۔ گیلے بالوں کو تولیے سے اچھی طرح رگڑنے کے بعد اس نے بالوں کو برش کیا۔ صباحہ نے گرم گرم چائے کا کپ اس کے سامنے کیا۔

"واؤ زبردست! چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔" اس نے کپ پکڑتے ہوئے کہا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔ صباحہ بھی اس کے سامنے رکھے سنگل صوفے پر ٹک گئی..... غیر ارادی طور پر آویز کی نظریں اس کے چہرے' اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگیں۔

اس کی نظروں کی بے باکی نے صباحہ کو بری طرح کنفیوژ کر دیا..... اس نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور وہاں سے اٹھ گئی۔ آج حسب معمول نا دونوں نے گپ شپ لگائی نہ مختلف کتابوں اور لکھاریوں پر تبصرہ کیا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رات کے تقریباً" ساڑھے گیارہ بجے صباحہ کوئی تاریخی کتاب پڑھنے میں مگن تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دروازے کے قریب آویز خان نائٹ ڈریس میں ملبوس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیسی طلب کی شدت تھی کہ صباحہ کا دل ہولے سے لرزا..... کتاب بے ساختہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ پر جا گری۔

آویز دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے بیڈ کے قریب آگیا تھا..... صباحہ کھسکتے ہوئے بیڈ کے دوسرے کونے پر ہو گئی۔ آویز خاں کے انداز اسے دہلا رہے تھے۔

"کب تک دور رہو گی؟" اس نے ایک ہی جست میں اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ صباحہ کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔ اس نے نرمی سے آویز کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"پلیز آویز! مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

اس نے اس لہجے انداز میں کہا کہ آویز نے بے ساختہ اس کا ہاتھ چھوڑ دیا..... ہاتھ چھٹتے ہی وہ باتھ روم کی جانب بھاگی..... جب کافی دیر گزر گئی اور وہ باہر نہ آئی تو وہ باتھ روم کے دروازے تک گیا۔

"صباحہ تم ٹھیک تو ہو؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس وقت تک باتھ روم سے نہیں نکلوں گی جب تک تم اپنے کمرے میں نہیں جاؤ گے۔"

اس کی آواز بہت واضح تھی۔ آویز خاں بھونچکا رہ

گیا۔ اس کی چال بازی پر غصے سے اس کا دماغ کھول گیا۔ اس نے ایک زوردار ٹانگ دروازے کو ماری "

"بنتی کتنی سادہ ہے اور ہوشیاریاں کتنی آتی ہیں۔ مجھے منٹ میں الو بنا کے رکھ دیتی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے، بیٹھی رہو باتھ روم میں..... میں بھی نہیں جانے والا ایسے تو پھر ایسے ہی سہی۔" وہ وہیں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا اور پھر نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

رات کے تین بجے پہلو بدلتے ہوئے اس کی آنکھ کھلی تو بے ساختہ نظر باتھ روم کی طرف گئی۔

"ہیں تو یہ ابھی تک باتھ روم میں ہے۔" عجیب لڑکی ہے..... اف ساری رات باتھ روم میں گزار دی۔ وہ سوچتے ہوئے اٹھا۔

"اب آجاؤ باہر میں جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔"

وہ نیند میں ڈوبی خمار آلود آواز میں ___ کہتا کمرے سے نکل گیا۔ لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے تک آیا دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکیلا۔ اگلے ہی پل ہوش ٹھکانے آگئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ صباحہ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا کمرے میں.....

"اف اس لڑکی نے تو دماغ گھما ڈالا ہے۔" وہ واپس صباحہ کے کمرے کی طرف چلا گیا۔



شادی کو آٹھ ماہ ہو رہے تھے مگر دونوں کے درمیان موجود ایک تکلف سا ابھی بھی موجود تھا۔ صباحہ نے ازدواجی زندگی کے حقوق و فرائض کو تو نظرانداز نہ کیا۔ مگر وہ اس دیوار کو پاٹنے میں عون کا بھرپور ساتھ نہ دے سکی تھی۔ اس رات صباحہ صوفے میں دھنسی بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی۔ عون چینج کر کے باتھ روم سے نکل رہا تھا۔ وہ اس وقت نائٹ ڈریس میں ملبوس تھا۔

"صباحہ! تم نے کبھی اپنے پیرنٹس کا ذکر نہیں کیا..... میرا مطلب ہے تمہارے ریلیٹوز میں سے میں صرف تمہاری خالہ کو ہی جانتا ہوں..... تمہارے والدین کون تھے۔ کب فوت ہوئے۔ آج کچھ بتاؤ نا ان کے بارے میں؟" بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے عون نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

عون کی یہ بات صباحہ کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی.....

"میری والدہ میری پیدائش کے موقع پر ہی مجھے چھوڑ گئیں اور والد بہت پہلے میری والدہ کو چھوڑ چکے تھے۔ میں ان کے بارے میں تمہیں کیا بتاؤں۔" اس نے میگزین پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے والدین کا نام کیا تھا کیا کرتے تھے تمہارے والد..... کیا یہ سارا پھیلا ہوا بزنس انہیں کا ہے؟" اس نے متجسس لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" یہ بزنس میرے والد کا نہیں ہے..... عون پلیز..... مجھ سے ماضی کے بارے میں کچھ نہ پوچھو۔ اب جو ہے بس اسے ہی دیکھو!" وہ کچھ تنک کر بولی۔

"کیوں کیسا ہے تمہارا ماضی۔ جو تم بتانا نہیں چاہتیں حیرت کی بات ہے۔ ہم نے اتنا عرصہ ساتھ گزارا، شادی کی، آٹھ ماہ شادی کو ہو گئے اور مجھے تمہارے خاندان کا کچھ علم نہیں ہے۔ سوائے تمہاری ایک خالہ کے۔"

"جب تم مجھ سے شادی کے لیے بے قرار تھے تب تمہارے ذہن کو یہ سوال چھو کر بھی نہیں گزرا تھا تو اب کیا ضرورت آن پڑی ہے۔" وہ کچھ تلخی سے بولی۔

"ضرورت تو کچھ بھی نہیں..... مگر ایک تجسس تو ہے نا۔ تمہاری ماما سے علیحدگی کے بعد انہوں نے تم سے ملنا بھی گوارا نہ کیا؟"

"اچھا تو آج تمہیں لازمی میری فیملی کے متعلق جاننا ہے۔" اب کے صباحہ نے سکون سے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔"

"ٹھیک ہے تو سنو۔ میری نانی ایک طوائف تھیں۔ ریڈ لائٹ ایریا سے ان کا تعلق تھا۔"

پہلا ہی جملہ سن کر عون کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ وہ جھٹکا کھا کر سیدھا ہوا اور آنکھیں بے یقینی سے پھیلائے اسے دیکھنے لگا۔

"واٹ!" غیر یقینی میں ڈوبا لفظ اس کے ہونٹوں سے

ادا ہوا۔

"ہاں ہنڈرڈ پرسنٹ حقیقت ہے۔ میری خالہ چندا بھی ماضی میں طوائف رہ چکی ہیں اور میری..... ماں ..... وہ بھی ایک طوائف زادی تھی اور ایک شریف زادے سے نکاح کر بیٹھی اور جیسا کہ عموماً" ہوتا ہے اس طرح کے معاملات میں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میرا شریف زادہ باپ' میری ماں کو چھوڑ گیا۔ میں ان کے جائز تعلق کا غیر متوقع نتیجہ ہوں۔ میرے باپ نے مجھے قبول نہیں کیا۔ اس نے تو مجھے دیکھنا تک گوارا نا کیا۔ وہ کبھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ میری ذمہ داری میری خالہ چندا نے نبھائی..... مجھے اچھی تعلیم دلوائی۔ اس قابل بنایا کہ میں برے بھلے کے درمیان تمیز کر سکوں..... اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں سو میں نے ایسے ہی کیا! میں نے اس گناہ کی زندگی کو چھوڑ دیا۔ اپنے لیے علیحدہ راستے متعین کیے اور کامیاب رہی۔ اب تمہارے سامنے ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہتے ہوئے بات ختم کی۔

"تم ..... تم ایک طوائف زادی ہو؟" فق چہرے کے ساتھ عون نے پوچھا!

"ہاں!" صباحہ نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور یہ سارا بزنس..... کیا یہ سب تمہاری خالہ نے کمایا ہوا تھا؟" اس کا اگلا سوال صباحہ کے دل میں کانٹا سا چبھو گیا۔

"نہیں۔ طوائفوں کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ اتنے بڑے پیمانے پر بزنس شروع کر سکیں۔ طوائفوں کا صرف ایک ہی بزنس ہوتا ہے۔" اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

پھر تم نے یہ سب کیسے اسٹیبلش کیا؟" اس نے متجسس ہو کر پوچھا!

"یہ تمہارا ہیڈک نہیں' میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ جھنجلائے انداز میں کہہ کر کمرے سے نکل گئی..... عون وہیں بیٹھا اس کی اور اپنی پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کے واقعات کو ذہن میں دہرانے لگا۔



"بیگم جی! وہ آپ کو ساجد صاحب بلا رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔" وہ دوسرے دن آفس سے آئی تھی کہ ملازمہ آگئی۔

"تم جاؤ' میں آتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد اس نے قدم اندر رکھا تو وہ جو سنگل صوفے پر سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

"کیسی ہو؟" انہوں نے کھڑے ہو کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک ہوں۔" اس نے جواب دیا..... اور ان کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بیٹی! جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں کہتے ہوئے شرم تو آتی ہے۔ مگر مشکل وقت میں اپنے ہی یاد آتے ہیں اور اپنے ہی کام آتے ہیں! انہوں نے نپے تلے انداز میں بات شروع کی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بلا جھجک کہیں؟" وہ نرمی سے بولی۔

"بیٹی بات یہ ہے کہ بزنس میں کچھ عرصے سے مسلسل لاس ہو رہا ہے ہماری جو آبائی زمینیں تھیں ..... وہ دونوں بھائیوں میں تقسیم ہونے کے بعد ٹھکانے لگ گئیں..... بزنس کو سیٹ کرنے' بڑھانے میں بہت سا پیسہ زمینیں بیچ کر لگایا گیا۔ اب جو بھی جائداد ہے یہ کاروبار ہی ہے۔" جو کچھ عرصے سے ڈاؤن جا رہا ہے اور تمہارا بھائی کامران اتنا اہل ثابت نہیں ہوا جتنا کہ مجھے توقع تھی۔ جب سے بزنس اس کے سر پر پڑا ہے۔ ڈانوا ڈول جا رہا ہے۔ بینک سے پہلے بھی لون لے چکا ہوں..... اب بزنس کو سنبھالا دینے کے لیے پورے ایک کروڑ کی ضرورت ہے..... کیا تم یہ رقم دے سکتی ہو؟" ان کی نظروں میں شرمندگی سی تھی۔

"کیوں نہیں..... ضرور۔" اس نے بلا تامل کہا۔

ساجد خاں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"تم بہت اچھی ہو..... بہت گریٹ اور میں ایک ایسا بزدل باپ جو تمہیں اپنا نام بھی نہیں دے سکا۔ اب میں بڑے فخر سے سب کو بتا سکتا ہوں کہ تم میری بیٹی ہو! کسی کی ہمت نہ ہوگی انگلی اٹھانے کی..... بس تم ذرا یہ بات چھپالینا کہ تمہاری ماں طوائفوں کے قبیلے سے تھی....."
ساجد خاں شفقت آمیز لہجے میں اس کے دل و دماغ پر بم پھوڑ رہے تھے۔
(کیسا باپ ہے میرا مجھے قبول بھی کر رہا ہے تو سارے تحفظات کو سامنے رکھتے ہوئے..... جو اپنے خون کو بھی مفاد کے ترازو میں تول رہا ہے)۔ صباحہ کو لگا جیسے اس کا دل پھٹنے ہی لگا ہے۔ اس نے تو بلا غرض کے انہیں رقم دینے کی ہامی بھری تھی۔ پھر..... کیا۔
"آپ اس بات کو چھپا ہی رہنے دیں۔ میں عون کو بتا چکی ہوں کہ میں ایک طوائف کی اولاد ہوں..... مگر میرے باپ کے بارے میں وہ نہیں جانتا۔ جب آپ اس بات کا اقرار کریں گے تو آپ کا برسوں کا چھپا راز کھل جائے گا۔ لہٰذا ایسے ہی ٹھیک ہے..... رقم آپ کو کل ہی مل جائے گی۔" وہ جیسے بہت ضبط سے کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔



مری، کاغان، سوات، اسلام آباد سمیت پاکستان کے تمام نادرن ایریاز کی سیر کر کے تین ماہ بعد وہ لوٹ آئے تھے۔ دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی فطرت، خیالات کو سمجھنے لگے تھے اور ایک دوسرے کے احساسات کا خیال رکھتے تھے.....
صباحہ کی دوست ثناء نے فون پر اسے بتایا تھا کہ اس نے ہمیشہ کی طرح بی اے میں ٹاپ کیا ہے۔ اس نے فوراً ہی اخبار منگوایا۔
"ارے تم تو اچھی خاصی ذہین اور قابل لڑکی ہو۔ تم اتنی بری جگہ پر پیدا ہی کیوں ہوئیں؟" آویز نے توصیفی انداز میں کہا۔ وہ اس وقت اخبار میں چھپی اس کی تصویر دیکھ رہا تھا۔
"پیدا ہونا اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ انسان کہیں بھی پیدا ہو اس کو اچھائی برائی کی تمیز ہونا چاہیے اور اچھے راستوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔"
"صباحہ! تم آگے کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
"چندا خالہ کہتی ہیں کہ وہ مجھے آگے نہیں پڑھنے دیں گی۔ وہ مجھے شوبز میں انٹروڈیوس کروانے کا پلان بنا رہی ہیں۔ لیکن میں اس ماحول سے نفرت کرتی ہوں۔" وہ کچھ یاسیت سے بولی۔
"تو پھر چھوڑ دو نا یہ سب کچھ..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری چندا خالہ اور نانی کا منہ بھر دوں گا کہ وہ تم پر اعتراض نہیں کر سکیں گی۔ بس تم پڑھائی کی طرف توجہ دو۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔
"آپ میرا ساتھ دیں گے۔ مگر کیسے..... اور پھر آپ نے تو اب واپس امریکہ چلے جانا ہے۔" وہ کچھ فکر مندانہ انداز میں گویا ہوئی.....
"نہیں مجھے امریکہ نہیں جانا..... میں پاکستان میں بزنس شروع کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے پاپا سے بات کر لی ہے تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔
"تو کیا میں یہیں رہوں گی۔" صباحہ کے اندر خوشی کی کرن سی پھوٹی..... "ہاں بالکل میرے ساتھ تم یہیں رہو گی بالکل باعزت، باحفاظت طریقے سے اس گھر کی ایک فرد کی طرح..... اپنی مرضی سے مجھے تمہاری کمپنی میں رہنا اچھا لگا..... اور سب سے اہم بات کہ تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کسی اور لڑکی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ چلو چھوڑو اس بکواس موضوع کو داخلے وغیرہ کی اب تم کوئی فکر نہیں کرو یہ سب اب میری ذمہ داری ہے اور اپنی نانی خالہ کو بھی بھول جاؤ۔" اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
صباحہ اس پل پل پینترا بدلتے انسان پر حیرت زدہ سی بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر۔۔۔ ایم بی اے میں اس کا ایڈمیشن ہو گیا۔ اس نے مستقل رہائش آویز خاں کے بنگلے میں ہی رکھی۔۔۔ آویز خاں اپنے بزنس کو سیٹ کرنے میں لگ گیا۔ اس کی مصروفیات ایک دم بہت تیزی سے بڑھ گئیں۔ دونوں کی صبح ناشتے پر ہی ملاقات ہو پاتی۔ تقریباً ایک ماہ اسی روٹین میں گزر گیا۔

اس دن سنڈے تھا وہ دونوں بڑی فرصت سے لان میں بیٹھے چائے اور پکوڑوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔۔

"کتنے دنوں بعد آج فرصت ملی ہے۔" آویز نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بتائیں آپ کی فیورٹ ہابی کیا ہے؟" صباحہ دلچسپی سے بولی۔

"میری فیورٹ ہابی۔۔۔۔ نئی نئی گرل فرینڈز بنانا' ان کے ساتھ ٹائم انجوائے کرنا۔ فارغ وقت میں فرینڈز کے ساتھ گزارتا ہوں۔۔۔۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی ایسا مشغلہ جو صرف اپنی ذات کے لیے ہو۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہے تو۔۔۔۔ میرے پاس دنیا کی بہترین ادبی معلوماتی بکس کا ذخیرہ ہے۔ ریڈنگ میرا مشغلہ کہا جا سکتا ہے۔" اس نے سرسری سے لہجے میں بتایا۔

"اور اتفاق سے ریڈنگ میرا بھی مشغلہ ہے ہم ایسا کرتے ہیں کوئی بک منتخب کریں۔۔۔۔ اسے پڑھیں اور پھر اس پر بحث کریں۔ اسے سمجھیں اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزار لیں گے اور ہمارے مشغلے کی بھی تسکین ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟"

"خیال تو بہت اچھا ہے۔ یہ تو بہت دلچسپ ہو گا۔ بس کون سی کتاب اسٹڈی کرنی ہے اس کا فیصلہ تم کیا کرو گی۔۔۔۔"

☼ ☼ ☼

انھوں نے کتنی ہی شامیں ساتھ گزاریں ہر ہفتہ ایک نئی کتاب موضوع گفتگو ہوتی آویز خان بہت انجوائے کر رہا تھا۔ کتابیں صباحہ منتخب کرتی تھی۔ اس نے ایسی کئی کتابیں اس کو پڑھنے کے لیے دیں کہ وہ چونک گیا۔ شاہد مسعود کی اینڈ آف ٹائم پڑھ کر اس کے ذہن میں کئی سوالات اٹھے تھے۔ پہلی بار اس نے زندگی کے مقصد پر غور کیا۔

اگلی کتاب پروفیسر خورشید احمد کی اسلامی نظریہ حیات تھی جسے پڑھ کر اس کے ذہن کی کئی گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

پہلے پہل اس نے صرف صباحہ کے کہنے پر کتابیں پڑھیں پھر رفتہ رفتہ اس میں خود جستجو پیدا ہوئی تاریخ سے تو اسے دلچسپی تھی شبلی نعمانی کی سیرت النبی پڑھی تو صرف صباحہ کا ساتھ دینے کے لیے اس نے کتابیں پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مگر اب اس کے اپنے اندر جستجو پیدا ہو رہی تھی۔

"اس دن صباحہ سورۃ احزاب کا ترجمہ پڑھ رہی تھی جب وہ آیا۔ صباحہ اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ تفسیر وہیں میز پر رکھی تھی۔ جب وہ چائے بنا کر لائی تو وہ کتاب کھولے گم تھا ترجمے میں اس کے چہرے پر کیسی سنجیدگی تھی کہ ایک پل کو صباحہ کھو سی گئی۔

"چائے۔" اس نے کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔۔۔۔ مگر وہ ہنوز سامنے کھلی آیت میں گم تھا۔ اس کی اتنی گہری توجہ دیکھ کر صباحہ نے بھی اس کی نظروں کی پیروی کی۔

وہ سورہ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ کا ترجمہ پڑھ رہا تھا

"بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے

والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں (کچھ شک نہیں) اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے بخشش اور اجر عظیم۔"

آویز نے یہ آیت کوئی پانچ چھ بار پڑھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے گئے۔ تفکر، پشیمانی، کچھ کھو جانے کا احساس اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

"صباحہ! کیا میں مسلمان ہوں..... کوئی ایک بات بھی تو مجھ میں مسلمانوں جیسی نہیں۔ دیکھو میں فرماں بردار نہیں ہوں۔ میں خدا کے احکام سے ہی آگاہ نہیں تو فرمانبرداری کیسی۔

مجھ میں صبر نہیں ..... میں نے آج تک کسی معاملے میں صبر نہیں کیا۔ میں نہیں جانتا صبر کیا ہے اور کب کیا جاتا ہے۔ جو چیز طلب کی اگلے لمحے ہی مل گئی۔ میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی، روزہ نہیں رکھا۔ کبھی خیرات نہیں کی اور اللہ ..... دنیا کی رنگینیوں، مستیوں میں کبھی یاد ہی نہیں آیا میں نے ڈھیروں گرل فرینڈز بنائیں۔ ان کے ساتھ ہر حد سے گزر گیا۔ پاکی ناپاکی کا تصور مجھے چھو کر بھی نا گزرا۔ صباحہ میں بہت اپ سیٹ ہوں ..... دیکھو میں ہائی سوسائٹی کا ایک ہائی کوالیفائیڈ انسان ..... جو بہت باعزت ہے ..... معاشرہ اسے بہت امتیازی مقام دیتا ہے ..... مگر میں کتنا گرا ہوا، گندگی میں لتھڑا ہوا ..... اس بات کو ہر کوئی نظر انداز کر دیتا ہے اور تم ..... گندگی سے اٹھ کر آئی ہوئی۔ مگر کوئی کیا جانے کہ تمہارا اندر کتنا پاکیزہ اور نکھرا ہوا ہے۔ تمہارے اندر کیسا نور ہے ..... تمہارا کردار کتنا مضبوط ہے کہ میرے جیسا عیاش بندہ اس میں نقب نہیں لگا سکا۔ صباحہ! تم اندازہ نہیں لگا سکتیں اس وقت میرے دل میں کیسی بے چینی اور اضطراب ہے..... میں کیا ہوں صباحہ! خاک کا ایک پتلا ..... کیا، کیا میری توبہ قبول ہو گی..... نیک انسانوں کی توبہ قبول ہوتی ہے اور ان ہی کی بخشش ہوتی ہے۔ میں تو بہت خراب ہوں۔" بولتے بولتے وہ رو پڑا تھا۔ بالکل کسی ننھے بچے کی مانند.....

صباحہ کچھ لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی..... زندگی میں پہلی دفعہ یوں کسی مرد کو بلک بلک کر روتے دیکھا تھا ..... اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا نازک ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں تھپتھپایا۔

"مذہب اسلام اس کے احکام آپ کے ذہن کے کسی کونے میں تھے۔ وقتی طور پر ان پر دنیاوی رنگینیوں اور لذتوں کا نشہ چڑھ گیا..... آسائشات، زندگی، دولت، ہر چیز وافر مقدار میں تھی۔ آپ اندھا دھند دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور جب انسان غفلت سے جاگ جائے..... سچے دل سے توبہ کرے۔ آئندہ گناہوں سے باز رہنے کا ارادہ دل سے کرے تو..... اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ستر ماؤں سے زیادہ مہربان، رحیم و کریم ہے۔ توبہ، استغفار کا دروازہ اس نے ہم جیسے نادانوں اور گناہ گاروں کے لیے ہی کھولا ہے۔"

وہ بہت دھیمے لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی اور وہ بہت پیاسی نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

"صباحہ تم..... تم میری کس نیکی کا انعام ہو! جو یوں میری زندگی میں آئیں اور میری زندگی ہی بدل دی۔"

وہ آنکھوں میں نرمی لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اب یہ چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ میں آپ کے لیے دوبارہ بنا کر لاتی ہوں۔" وہ اس کی نظروں کی وارفتگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھی۔

"نہیں، مجھے چائے نہیں پینی ..... میرا دل بہت بوجھل ہو رہا ہے۔"

اس نے مضمحل سی آواز میں کہا۔ صباحہ چائے کے کپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔



اور پھر آویز خاں کی زندگی کے معمولات آہستہ آہستہ بدلتے چلے گئے۔ جس راستے پر قدم رکھا تھا اللہ نے ہاتھ تھام لیا تو آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس نے نماز بھی شروع کر دی تھی۔

اس کے مزاج میں بہت ٹھہراؤ اور سنجیدگی سی آ گئی

ہی۔ وہ جو دوستوں میں بہت باتونی اور چلبلا مشہور تھا ۔۔۔ اب بہت ناپ تول کر بولنے لگا۔ اس کے انداز و اطوار کی تبدیلی نے اس کے ملنے جلنے والوں کو بھی حیران کر دیا تھا۔

صباحہ کا ایم بی اے کا لاسٹ سمسٹر کا ایگزام بھی ہو چکا تھا ہو ۔۔۔ وہ آج کل فارغ تھی۔ آویز نے اسے اپنا آفس جوائن کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے فوراً ہامی بھرلی۔



بہت جلد اس نے آفس ورک کو سمجھ لیا تھا۔ چھ ماہ گزر چکے تھے۔ آویز نے چندا سے بات کرلی تھی۔ وہ پانچ سال کے لیے محفوظ تھی۔

ابھی تک وہ امریکہ واپس نہیں گیا تھا۔۔۔ اس دن حسب معمول وہ دونوں اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ جب صباحہ کو چائے کا خیال آیا۔

"مجھے سستی ہو رہی ہے چائے بنا کر لاؤں؟" وہ کسلمندی سے بولی۔

"ہاں ہاں مجھے خود طلب ہو رہی ہے۔" کتاب پر نظر جمائے آویز نے بھی کہا تو صباحہ فوراً اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھے اندر داخل ہوئی۔۔۔ ایک کپ آویز کی طرف بڑھایا دوسرا خود اٹھا لیا۔

"اپنی چائے میں بھی چینی نہیں ڈالتی ہو۔۔۔" پہلا سپ لے کر آویز نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے بھی آپ کی طرح عادت ہو گئی ہے بغیر چینی کے پھیکی چائے پینے کی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"صباحہ! ہم دونوں کو ایک دوسرے کی بہت سی عادتیں پڑ گئی ہیں۔" وہ گہرے لہجے میں بولا۔

"آں۔۔۔ ہاں ایک ساتھ رہتے ہوئے ایسا ہو جاتا ہے۔" صباحہ نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"صباحہ! تم سے کچھ کہنا ہے۔" وہ ہموار لہجے میں بولا۔

"ہاں کہیے۔۔۔" "بابا کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی آٹھ دن پہلے۔۔۔ میں ان کے پاس جانا چاہ رہا ہوں۔"

اس کی بات مکمل ہونے تک صباحہ کے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

"ہاں ہاں جانا چاہیے آپ کو۔۔۔ آپ کے بابا کی طبیعت بھی ناساز ہے اب تو زیادہ ضروری ہے۔"

صباحہ کے دل کو نہ جانے کیا ہو رہا تھا اپنے دل کی کیفیت پر حیران ہونے کے علاوہ وہ پریشان بھی تھی۔

جس دن وہ گیا وہ باوجود کوشش کے اپنی افسردگی نہ چھپا سکی۔ اس کے جانے کے کئی روز بعد اس پہ آشکار ہوا کہ وہ بری طرح آویز خاں کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اس کے بعد آفس میں باس کی ذمہ داری کو وہ نبھا رہی تھی۔



تقریباً" تین ماہ بعد آویز خان کی واپسی ہوئی۔۔۔ صباحہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ مگر آویز کا رویہ بہت عجیب تھا۔ بہت رسمی سا۔۔۔

اپنے آنے کے چھٹے روز اس نے صباحہ کو اپنے سامنے صوفے پر بٹھایا اور بہت سنجیدگی سے بات شروع کی۔

"صباحہ! تم جانتی ہو میری نظر میرے دل کو تمہاری عادت سی ہو گئی ہے۔ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہے صباحہ! میں انسان بنا۔۔۔ میں نے اسلام کو جانا۔۔۔ میں خدا کے قریب ہوا تو تم سے متاثر ہو کر اور تمہیں متاثر کرنے کے لیے۔۔۔ میری زندگی میں تم پہلی لڑکی ہو جس کی مجھے طلب ہوئی لیکن تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ٹھکرائے جانے کے احساس سے روشناس ہوا تم نے مجھے حقوق و فرائض سے آگہی دی۔

صباحہ! اب جب میں امریکہ گیا تو بابا کی حالت بہت سیریس تھی۔ میں ان کی اکلوتی اولاد نرینہ ہوں مجھ سے بڑی میری ایک سسٹر ہیں جو میریڈ ہیں اور پیرس میں مقیم ہیں۔ اب بابا کو میری شادی کی خواہش تھی

انہوں نے آنا "فانا" میرے چچا سے بات کی اور ان کی بیٹی کا رشتہ مانگ لیا اور مجھ سے کہا کہ انہوں نے آج تک میری ہر خواہش پوری کی ہے۔۔۔ بری بھلی کسی بات سے نہیں روکا للہذا اب اگر وہ میری ذات سے کوئی خوشی چاہتے ہیں تو مجھے ان کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔ سو میں نے ہاں کہہ دی۔۔۔ میری شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔۔۔ ساری پاکستانی رسمیں وہاں امریکہ میں ہوئیں 'وہاں امریکہ کے دوستوں نے میری شادی کو بہت انجوائے کیا۔ مگر اس ساری دھوم دھام میں میرا دل کیسے کرچی کرچی ہو کر بکھرا یہ میں جانتا ہوں۔ صباحہ! میں چاہنے کے باوجود تمہیں اپنانا نہیں چاہتا۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اپنے احسانوں کے بدلے میں تم سے کچھ طلب کروں۔ جارہا ہوں اپنی فیملی 'اپنی بیوی کے پاس۔۔۔ صباحہ! میں نے توبہ کی۔ آئندہ میں کوئی گرل فرینڈ نہیں بناؤں گا۔۔۔ کسی کے ساتھ چیٹنگ نہیں کروں گا۔ اپنی وائف کے ساتھ وفادار رہوں گا۔۔۔ میں ایک پاک صاف زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔۔۔ گناہوں سے پاک زندگی۔۔۔ میں خدا کے حضور سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔۔۔ اور یقیناً "خدا مجھے معاف کردے گا۔۔۔ کیونکہ وہی جانتا ہے کہ میں نے اپنے دل کی خواہش کو کیسے کچلا ہے۔۔۔ مگر تم صباحہ۔۔۔ میری سوچ انداز فکر کو بدلنے والی تم ہو! تمہارا احسان ہے مجھ پر۔۔۔ میں یہ اس احسان کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا للہذا میں نے اپنا سارا بزنس جو کہ پاکستان میں ہے تمہارے نام منتقل کردیا۔ اب اس بزنس کی مالک تم ہو۔ یہ فیصلہ میں نے اس لیے بھی کیا کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پھر کبھی زندگی میں مجبور ہو جاؤ۔۔۔ میں چاہتا ہوں تم اس قدر مضبوطی سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کہ کوئی تم سے کھیل نہ سکے۔۔۔ اور مجھے ہنڈرڈ پرسنٹ یقین ہے کہ تم یہ بزنس سنبھال بھی لوگی اور اچھے طریقے سے چلا بھی لوگی۔۔۔ یہ بنگلہ بھی میں تمہارے نام کرچکا ہوں۔۔۔ دل تو نہیں چاہتا کہ تمہیں یہ مشورہ دوں مگر تمہارا حق نہیں چھینا جاسکتا۔ اگر زندگی میں کوئی بے لوث 'محبت کرنے والا شخص ملے تو اسے ہم سفر بنالینا۔ زندگی آسان ہو جائے گی۔۔۔ اور ہاں یہ سب بزنس ' اس بنگلے کے کاغذات ہیں۔۔۔ اور ایک یہ ڈائری ہے۔۔۔ اسے میرے جانے کے بعد پڑھنا۔"

اس نے سامنے میز پر پڑی ہوئی فائل اور ڈائری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ صباحہ چپ چاپ ساکت سی۔۔۔ آنکھوں میں ویرانی لیے اسے تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی نے آویز کو بے چین کر دیا۔

"صباحہ! مجھے اپنے کچھ دوستوں سے ملنا ہے۔ کل تو مجھے چلے جانا ہے آج ہی وقت ہے۔۔۔ للہذا میں جارہا ہوں۔ اب رات کو ملاقات ہوگی۔ گڈ بائے ٹیک کیئر۔۔۔"

وہ کہہ کر تیزی سے اٹھا اور لاؤنج سے نکل گیا اس کی طرف دیکھے بغیر۔۔۔ جو مدھم ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ جامد سی نجانے کتنی دیر وہاں بیٹھی رہی۔



پھر اگلے ہی روز وہ چلا گیا ہمیشہ کے لیے۔۔۔ صباحہ 'خالہ چندا سے ملنے گئی تو پتہ چلا نانی چھ ماہ پہلے گزر چکی ہیں۔۔۔ اور چندا خالہ اپنے کاروبار سے اکتا چکی ہیں۔ للہذا وہ انہیں ساتھ ہی لے آئی۔۔۔ صباحہ نے خود کو بہت مصروف کرلیا۔۔۔ جانے والا اتنا بے درد تھا کہ کبھی فون کرکے حال بھی نہ پوچھتا تھا۔۔۔ اس کا فون بھی اٹینڈ نا کرتا بس ایک دفعہ اس کے میسجز کے جواب میں ایک میسج بھیجا تھا۔

"صباحہ! تمہاری یاد دل میں سمندر کے پانی کی طرح ہے۔ اس میں کنکر نہ پھینکو۔۔۔ اضطراب پیدا ہوتا ہے۔۔۔ میٹھے میٹھے درد کو 'برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔۔۔ تمہاری آواز سنوں گا تو دیوانہ ہو جاؤں گا۔"

پھر اس کے بعد صباحہ نے اس سے بات کرنے کی کبھی کوشش ہی نا کی۔۔۔ اس کی دی ہوئی ڈائری کو وہ بلا ناغہ رات کو پڑھتی۔۔۔ اس کی یادیں اس کی ہم سفر تھیں۔۔۔ مگر اب اس کے اور اس کی یادوں کے درمیان عون آچکا تھا۔



کلینک سے نکلنے کے بعد اس نے پارکنگ ایریا سے اپنی گاڑی نکالی اور مسکراتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگی ..... خوشی اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھلک رہی تھی..... آج اسے خوش خبری ہی ایسی ملی تھی۔ اسے بہت بڑا درجہ ملنے والا تھا اک ماں کا درجہ۔ بے حد خوشی میں گاڑی ڈرائیو کرتی وہ گھر آئی..... گیراج میں گاڑی کھڑی کرکے وہ جلدی سے اندرونی حصے کی جانب بڑھی ..... وہ یہ خبر سب سے پہلے عون کو سنانا چاہ رہی تھی..... سامنے ہی ملازمہ مل گئی۔

"عون گھر پر ہی ہے نا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"جی بیگم صاحبہ! وہ پچھلے لان میں بیٹھے ہیں۔" ملازمہ نے بھی اس کے چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ کو دیکھا..... اور حیران سی ہوئی.....

صباحہ الٹے قدموں واپس آئی اور لان کی جانب گئی۔ وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتی عون کی جانب آئی جو کرسی پر بیٹھا کسی سے محو گفتگو تھا۔ سیل فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ صباحہ کی جانب اس کی پشت تھی۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھی کہ اچانک رک گئی۔

"یار صباحہ کی بات ہی نہ کرو..... ایک دم سٹھیائی ہوئی عورت ہے۔ مجھ سے عمر میں بھی بڑی ہے..... ہر وقت باس بنی رہتی ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے صرف اس کی دولت کی خاطر اس سے شادی کی ہے۔ ایک دم بور عورت ہے۔ محبت تو جانم میں نے تم سے کی ہے۔ جلد ہی ہم کورٹ میرج کریں گے..... صباحہ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا" "یار وہ ایک بزنس وومین ہے بزنس کی گتھیاں سلجھانے میں لگی رہتی ہے۔

یہ شادی نہیں سمجھو ایک ڈیل ہے....." مزید سننے کی صباحہ کے اندر تاب نا تھی وہ لرزتے قدموں سے دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور بیڈ پر اوندھی لیٹ کر وہ بے تحاشا روئی..... تقریباً" آدھ گھنٹے بعد عون کمرے میں آیا اسے یوں روتے دیکھ کر بری طرح چونکا پھر طنزیہ انداز میں بولا۔

"بہت یاد تڑپا رہی ہے پچھلی محبت کی؟"

"محبت اگلی پچھلی نہیں ہوتی..... محبت بس محبت ہوتی ہے..... میں نے شادی سے پہلے تم سے کچھ چھپایا نہیں تھا اور محبت تو تم کو بھی نہیں چاہیے۔ تم نے صرف دولت کی خاطر مجھ سے شادی کی۔ لیکن یہ جان لو یہ دولت جس کی خاطر تم نے مجھ سے شادی کا ڈھونگ رچایا ہے اس سارے بزنس کا اصل مالک آویز خان ہے..... سمجھے تم..... اور ایک بات مزید ذہن نشین کرلو ..... آویز خاں میرے دل کی رگوں کے اس قدر قریب ہے کہ اگر میں یہاں تڑپ رہی ہوتی ہوں تو اسے سات سمندر پار خبر ہو جاتی ہے۔ اگر میں یہاں ہنسوں تو اس کا دل وہاں مسکرا رہا ہوتا ہے.....

اور جس دولت کا لالچ پال کر تم مجھے برداشت کر رہے ہو۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں اسے جیسے مرضی استعمال کروں جس کے مرضی نام کروں۔ مگر میرے مرنے کے بعد یہ خود بخود آویز خان کے کنٹرول میں چلی جائے گی ..... یہ حقیقت جاننے کے بعد چاہو تو مجھے رکھو..... چاہو تو چھوڑ دو..... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا....."

وہ تڈر لہجے میں کہتی بیڈ سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ عون ششدر سا وہیں صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔



"میڈم! ایک خاتون آپ سے ملنا چاہ رہی ہیں۔" وہ فائل میں گم تھی جب انٹر کام پر سیکرٹری نے بتایا۔

"پہلے سے کوئی اپائنٹمنٹ" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"نہیں میڈم! وہ کہہ رہی ہیں وہ آج فرسٹ ٹائم آپ سے مل رہی ہیں اور ملنا بھی ضروری ہے۔" سیکرٹری نے بتایا۔

"نام کیا ہے ان کا؟" صباحہ نے اب کے کچھ متجسس ہو کر پوچھا۔

"سائرہ آویز خان۔" اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ وہ جیسے یک دم طوفانوں میں گھری تھی۔

"بھیجوانہیں۔" اس نے آہستگی سے کہا اور فون رکھ دیا۔ کچھ لمحوں بعد کوئی حسین پری تھی جو اس کے آفس میں جلوہ گر ہوئی۔۔۔۔ بلیو کلو کی ساڑھی میں ملبوس۔۔۔۔ گلابی دمکتی رنگت' درمیانہ قد۔۔۔۔ نازک مومی ہاتھ پاؤں۔۔۔۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں۔۔۔۔ خوب صورت تیکھے نقوش' اک مجسمہ حسن تھا۔

صباحہ مبہوت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم!" اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا!

"وعلیکم السلام۔۔۔۔ بیٹھیے۔" اس نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔

سائرہ اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا لیں گی آپ ٹھنڈا یا گرم؟" صباحہ نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں' تھوڑی دیر بعد میں لنچ کرنے والی ہوں۔ لنچ سے کچھ دیر پہلے میں کچھ نہیں لیتی۔" وہ بہت خوب صورت انداز میں بولی۔

"ایزیووش' پھر ہم ایک ساتھ لنچ کریں گے۔" صباحہ نے بلا تامل کہا۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ بہت عرصے سے دل میں حسرت تھی آپ سے ملنے کی۔" "آپ مجھے پہچان تو چکی ہوں گی کہ میں تعارف کروادوں" سائرہ کے لہجے میں چبھن سی تھی۔

"جی ہاں میں آپ کو پہچان چکی ہوں۔" "آپ آویز خان کی وائف ہیں۔۔۔۔ اور آویز خان میرے محسن۔"

"صرف محسن!" سائرہ نے تیزی سے بات کاٹی۔

صباحہ نظریں چرا گئی۔

"آویز خان کی زندگی میں تم کیا ہو؟ کہاں ہو؟ شاید تم خود بھی نہیں جانتیں۔۔۔۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔۔۔۔ تم آویز خان کے لیے اور آویز خان تمہارے لیے کیا ہیں۔ تم بس خاموشی سے سنتی جانا۔۔۔۔ میں یہی سب تمہیں بتانے آئی ہوں کہ جب آویز خاں سے میری شادی ہوئی۔۔۔۔ اس سے پہلے میں اسے ایک کھلنڈرے' شوخ مزاج' آزاد خیال' لبرل مائنڈ کا شخص سمجھتی تھی۔۔۔۔ اس سے میری شادی طے پائی مجھے اپنی خوش نصیبی پر رشک محسوس ہوا۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن میری زندگی کا حصہ بن رہا تھا۔ میں بہت نازاں و مغرور تھی۔۔۔۔ پھر شادی ہوئی اور میں چونک کر رہ گئی اور آج تک چونکتی' حیران ہوتی آرہی ہوں۔ شادی کے بعد وہ بہت بدلے ہوئے روپ میں میرے سامنے تھا۔ اس کی شوخی' تیزی طراری' کھلنڈرا پن' غرور سب یہیں پاکستان میں ہی رہ گیا۔ وہ ایک بہت سنجیدہ' مدبر' با اخلاق' بے نیاز' حقوق و فرائض کی ادائیگی کرنے والے منظم لائف گزارنے والے کی حیثیت سے میرے سامنے تھا۔ اس نے ہر طرح میرا خیال رکھا۔۔۔۔ پھر بھی مجھے کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔۔۔۔ وہ پارٹیز میں جانے سے کترانے لگا جن کی وہ جان ہوا کرتا تھا۔ وہ پروگرامز اور کنسرٹ سے کترانے لگا۔ وہ پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرنے لگا۔۔۔۔ وہ جھوٹ اور مذاق سے احتراز کرنے لگا۔۔۔۔ ہر کوئی اس کی تبدیلی سے حیران تھا۔۔۔۔ مگر پھر آہستہ آہستہ یوں ہوا کہ وہ مجھ پر روک ٹوک کرنے لگا۔ میں کسی لڑکے سے ہاتھ ملاتی وہ برا مانتا' میرے کپڑوں' میرے رہن سہن پر نکتہ چینیاں شروع کردیں۔

اور پھر ہماری لڑائیاں شروع ہو گئیں۔۔۔۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں وہ مذہب کو ترجیح دینے لگا اور میں دنیا کو۔۔۔۔ یوں ہمارے درمیان ان ہی چھوٹے بڑے معاملات کی وجہ سے خلیج بڑھتی چلی گئی۔ پھر وہ ڈپریشن میں رہنے لگا۔ اسی ڈپریشن کے دوران اسے نیند میں بولنے کی عادت پڑ گئی۔۔۔۔ اور نیند میں جو باتیں وہ کرتا اس میں صباحہ کا ذکر ضرور شامل ہوتا۔۔۔۔ میں جتنی بھی لاپروا سہی مگر اس کی شریک سفر' اس کی بیوی تھی۔۔۔۔ مجھے بہت بے چینی ہوئی اور پھر میں نے کیا کیا کچھ کیا صباحہ کے بارے میں جاننے کے لیے یہ میں جانتی

ہیں۔ مگر میں نے ان سے سب کچھ پوچھ لیا اور انہوں نے کچھ بھی چھپائے بغیر سب بتا دیا......

چاہے میں لاکھ مغربی ماحول کی پروردہ آزاد خیال لڑکی تھی۔ مگر میرے اندر کی مشرقی لڑکی شوہر کی محبت میں گرفتار تھی۔

اس کی زندگی میں تمہارا اتنا اثر دیکھ کر مجھے تم اپنی اپنی سی لگنے لگی۔ ایسے لگتا تم ہمارے ہی گھر میں چلتی پھرتی اور رہتی ہو۔ آویز نے اپنی ساری توانائیاں اپنے بزنس میں صرف کردیں۔ وہ امریکا کا کامیاب قابل رشک بزنس مین ہے۔ وہ دو دفعہ حج بھی کرچکا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے اسے محسوس ہوا کہ تم خوش نہیں ہو ..... تم اذیت میں ہو! وہ مجھ سے کہتا سائرہ! صباحہ اذیت میں ہے..... وہ بہت سادہ مزاج کی، مخلص لڑکی ہے کسی کے جال میں آگئی ہے۔ وہ اتنے پریشان ہوئے کہ بیمار ہوگئے..... اور پھر اب جب ان کی طبیعت کچھ سنبھلی ہے تو میں..... میں پاکستان آئی ہوں صرف تم سے ملنے ..... دیکھنے کہ تم کس حال میں ہو؟"

وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ صباحہ کے چہرے پر جیسے کسی زلزلے کے آثار تھے..... وہ یک ٹک اسے تک رہی تھی..... کتنے لمحوں بعد وہ جیسے سکتے کی حالت سے نکلی۔

"میں ٹھیک اور بہت خوش آپ کے سامنے ہوں ..... میں نے بس ایک غلطی کی ہے..... جا کر آویز خاں کو بتا دینا میں بھول گئی تھی کہ میرے نصیب میں صرف آویز خاں کی بے پناہ محبت تھی..... میں نے اپنے باپ کی محبت پانے کے لیے اپنی شناخت پانے کے لیے..... خود کو پابند کرلیا..... ایک رشتے کا پابند..... میاں بیوی کا رشتہ..... صباحہ شادی کرچکی ہے..... ایک ایسے شخص سے جس سے اسے محبت نہیں ہے۔ اور کوئی بات نہیں مسز آویز..... لنچ ٹائم ہوگیا ہے چلیں کسی ہوٹل میں لنچ کرتے ہیں۔" سائرہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کھڑی ہوگئی..... اور گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

"یہ محبت کے راز ہیں مسز آویز خان..... ہر دکھ سکھ کے سگنل کیسے ایک دل سے دوسرے دل تک پہنچتے ہیں۔ آپ نہیں جان پائیں گی۔ دل کے راستے دل تک کیسے جاتے ہیں۔ دل کے راز محرم راز ہی جان سکتا ہے۔" اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔



ثمرہ بخاری

انا سی جمالہ

کارڈ کا رنگ گہرا گلابی تھا۔ سنہری حاشیہ اور سرخ گلاب بنا ہوا تھا۔ قریب ہی دو دل بھی بہار دکھا رہے تھے اور نوید مسرت لکھا بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

"یہ نوید اور مسرت کون ہیں؟ آپ کے کیا لگتے ہیں دادی؟" شبلی نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بے دلی سے سوال داغا تھا۔

دادی نے برا سا منہ بنا کر عینک کے اوپر سے گھور کر دیکھا، پھر ارشاد فرمایا۔

"تم جیسے پڑھانے والوں کے شاگرد بڑے ہو کر والدین کا نام روشن نہیں کریں گے بلکہ پورے خاندان کی نیک نامی کو آگ لگا کر سیاہ کر دیں گے، اتنا نہیں پتا نوید مسرت کا کیا مطلب ہے۔"

"کبھی ایسا کارڈ ہمارے گھر میں بٹے تب نا۔ پتا نہیں آپ کیا سوچ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔"

"کیا بول رہا ہے اونچا بول 'یقیناً'" اپنی اس نالائقی پر شرمندگی ہی ہو رہی ہوگی، لیکن یہ خالی خولی شرمندگی کا نہیں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

"یار ربلی! تو ادھر بیٹھا ہے، ادھر جلیبی نے اعلان کر دیا ہے اس اتوار کو ہماری اور اس کی کرکٹ ٹیمیں میدان میں اتریں گی اور وہ ہمیں ہرا کر دم لے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو ہمیں اجازت ہوگی، ہم اس کا جو بھی نام رکھ دیں۔" جوادی نے انٹری دی تھی۔

"یار! وہ موٹی کمر کو لچکا کر چلنے کی کوشش کرتا ہے، اگر اسے ہم۔"

"اے ہے خبردار جو کسی کا الٹا سیدھا نام دھرا تو، اور یہ ابھی کیا بولا، جلیبی۔ یہ نام بھی یقیناً" تم لوگوں نے ہی رکھا ہوگا۔ آئے ہائے کیسے لڑکے پیدا ہوئے ہیں ہمارے خاندان میں نری شرمندگی۔"

"یہ کارڈ کیسا ہے، کیا نانا، ماموں سہرا باندھ رہے ہیں؟" جوادی نے بڑھ کر کارڈ اٹھا لیا۔

"ارے تیرے نانا، ماموں کے تو نخرے ہی ختم نہیں ہوتے اور اوپر سے تم نے نانا کہہ کہہ کر بالکل ہی بیڑا غرق کر دیا ہے، اب وہ ایسا بڈھا بھی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ پینتالیس کا رہا ہوگا۔" دادی نے نظر چرا کر آہستہ



ناولٹ



سے کہا تھا۔
شبلی دھپ سے اچار کے لیے کاٹ کر پھیلائی کیریوں پر جاگرا۔
"دادی! اب بھی آپ نے بیان نہ بدلا تو میں ان اچار کے مسالوں پر جاگروں گا' جنہیں چھان پھٹک کر میز پر رکھا گیا ہے۔" جوادی کی دھمکی جان دار تھی۔
"کمبختو کرلو چار' چھ سال کا اضافہ' توبہ اب اچار کیا ڈالوں' کیریوں کی چٹنی بنادی ہے تم نے۔"
"بتایا نہیں کارڈ کہاں سے آیا ہے؟" جوادی کارڈ کو دیکھ رہا تھا۔
"نجمی کی شادی ہو رہی ہے۔" کیریوں کے غم میں ڈوبی دلوی نے اطلاع دی تھی۔
"آہ تو نجمی بھی آخر بیاہی گئی۔" جوادی نے کارڈ واپس تخت پر رکھ دیا۔
"کیا مطلب ہے' نجمی میں کون سا عیب تھا جو بیاہی نہ جاتی اور کون سا اس کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ ابھی پچیس کی تو پوری ہوئی ہے۔"
"یعنی اگر آپ دھیان دیتیں تو ادھر بھی کھپ سکتی تھی' خیر جو ہوا اچھا ہوا' ہمیں بھی اس سے دلچسپی نہیں تھی۔" شبلی نے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔
"تم لوگ شادی پر جانے کی تیاری کرلو۔"
"کرلیں گے' ہمیں کون سا غرارے سلوانے ہیں۔" شبلی' جوادی کے برابر بیٹھ گیا۔
"تو اور کیا' یہ ہی دو' چار پینٹیں ہیں جنہیں رگڑ کر دھو مانجھ لیں گے اور استری کرکے پہن لیں گے بک ہا۔" جوادی نے آہ بھر کر کہا۔
"خبردار جو اول جلول حلیے میں وہاں گئے۔ ناک کٹواؤ گے کیا میری اور یہ جینز کی موٹی پینٹیں چڑھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ شادی گاؤں میں ہے' کرتے شلوار پہن کر شرکت کرنا۔"
"بہروپ ہم نہیں بھر سکتے' جیسے ہیں جو پہنتے ہیں وہی پہن کر جائیں گے۔"
پھر جوادی کو کچھ خیال آیا۔
"گاؤں میں ہے' کہاں ہے وہ گاؤں اور ترقی کی دوڑ میں کہاں تک پہنچا ہے؟؟"
"گھبراؤ نہیں۔ بدحراموا! وہ بھی تو لوگ ہیں جو وہاں پر سالہا سال سے بس رہے ہیں۔ تم نے دو دن کے لیے جانا ہے اور ہاتھ پیر پھول رہے ہیں۔ ویسے شہر کے قریب ہے اور ترقی یافتہ ہی سمجھو۔"
"آپ اور نانا ماموں چلے جائیں۔" شبلی نے جوادی کو دیکھ کر دادی سے کہا اور جوادی بھی سرہلانے لگا۔
"کیوں ہم دونوں کیوں چلے جائیں۔ تم نے خاندان سے کوئی میل ملاپ' کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ نجمی کی نانی میری دوپٹہ بدل بہن بنی تھی ہاں۔"
"اوہ اچھا وہی نا جس نے اپنا پھٹا پرانا دوپٹہ آپ کے سر پر ڈال کر آپ کا نیا نکور دوپٹہ ہتھیا لیا تھا۔ دادی آپ ہمیشہ سے بھولی ہیں۔" شبلی نے ماضی میں دھکیلا تھا۔
"تجھے کیسے پتا؟" وہ حیران ہوئیں۔
"ایسے لوگوں سے بلکہ ایسے مکار' مطلب پرست' منافق اور۔" جوادی میم کے حرف سے شروع ہونے والے لفظ کی تلاش میں اٹکا۔
"منافرت پھیلانے والے' مرجانیے۔" شبلی نے اکٹھے دو لفظوں کا اضافہ فرمایا۔
"آئے ہائے وے' زبان کو لگام دو' اب اتنا بھی پرانا نہیں تھا اس کا دوپٹہ۔ چلو جو ہوا سو ہوا' اب تو بڑی محبت سے بلایا ہے اس نے۔ ویسے میں اب اس سے ایک نیا نکور دوپٹہ لے کر رہوں گی۔ واقعی بڑی زیادتی کی تھی اس نے میرے ساتھ۔ وہ میرا ہرا دوپٹہ ساری رات جاگ کر اس پر ستارے ٹانکے تھے' وہ اس نے لے لیا اور مجھے اپنا جوہے رنگ کا دوپٹہ اوڑھا دیا' جس میں جگہ جگہ سوراخ ہو رہے تھے۔"
"تو کیا ضرورت ہے جانے کی۔ چھوڑیں ایسے منافق دوستوں کو۔"
"نا اب اتنے سال تو میں اس سے بہنایا جوڑے رہی۔ اب اس کی پوتی کی شادی پر یہ شکایت کرتی کیا اچھی لگوں گی اور ویسے بھی ایک مسئلہ اور بھی تو تھا۔ اس کے پاس تو سارے دوپٹے ایسے ہی تھے بے چاری

غریب والدین کی پانچویں بیٹی تھی نا۔ اس کے پاس تھا کیا جہیز دینے کو۔"

آب دیدہ ہوئیں، مگر جلد ہی چہرے کی رنگت بدلی۔

"تم دونوں شیطان کے چیلے، پھاپھے کٹنی کے رشتے دار، ہائے ہائے دیکھو تو برسوں کی دوستی میں کیسی دراڑ ڈالنے لگی تھی۔ توبہ ہے اللہ بچائے تم سے جوادی، شبلی خبردار۔ آج کے بعد تمہارے منہ سے اقبال بیگم کے خلاف ایک لفظ نہ سنوں۔"

"اقبال بیگم، کیا ان کا نام ان کی پیدائش سے پہلے رکھ کر لڈو بانٹ دیے گئے تھے۔ اور جب اقبال کے بجائے اقبالہ پیدا ہوئیں تو والدین مارے شرمندگی کے یہ خوف ناک خبر چھپا گئے تھے۔"

"جوادی! یہ دیکھ لے میری جوتی، میرے پیر کے قریب ہی پڑی ہے اور یہ ہے بھی بالکل نئی نکور ایسی مار لگاؤں گی، چار دن تک ٹکوریں کرتا پھرے گا۔"

"کیا ہم آپ کی دوست کو آنٹی بالی یا آنٹی بلو کہہ سکتے ہیں۔ دیکھیں نا اقبال آنٹی تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔" شبلی نے اجازت طلب فرمائی تھی۔

"نا تمہیں کس نے کہا ہے تم آنٹی کہو۔ دادی ہی بنی تمہاری اور دادی کہتے ہوئے ساتھ نام نہیں لیا جاتا۔ اب میرا دماغ نہ کھاؤ، اٹھ کر دیکھو، ماں تمہاری واشنگ مشین لگانے لگی تھی۔ جا کر کپڑے دھلواؤ اور سنو، میری سفید بیڈ شیٹ کو نیل ضرور دے لینا۔"

"آپ کے اس حکم ناگہانی نے ہمیں نیلو نیل کر دیا ہے دادی۔" جوادی سے اٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔



اگلے دو دن خاصے سخت تھے، دادی نے اقبال بیگم کی نواسی نصرت پروین عرف نجھی کے لیے تحائف خریدنا تھے اور اس کے لیے بڑی بہو یعنی جوادی کی والدہ کی خدمات مستعار لی گئی تھیں۔ انہیں بازار لے جانے اور لے کر آنے کی ذمہ داری ان دونوں کے سر تھی۔

تحائف کی فہرست میں ایک عدد استری، ایک عدد سلائی مشین رکھنے کی فرمائش دادی کی تھی۔

"کیا پتا اسے کپڑے سینے ہی نہ آتے ہوں؟" شبلی کو اعتراض تھا۔

"اسی لیے تو دے رہی ہوں، جب سلائی مشین اس کے پاس ہوگی تو سلائی کا شوق بھی پیدا ہوگا اور آج کل درزی جس طرح ریٹ بڑھا رہے ہیں، سلائی سیکھنا لڑکیوں کے لیے بڑا ضروری ہے اور تم لوگ ہر بات پر اعتراض کرنے نہ بیٹھ جایا کرو اور یہ جتنی زبانیں گھر میں چلتی ہیں نا۔ دکانداروں سے بھی چلا لینا اور ریٹ کم کروا کر خریداری کرنا، اور سنو جوڑے اعلا قسم کے ہونے چاہئیں۔"

"چوہا رنگ لے لوں؟ دادی بالی کو ماضی کی یاد بھی دلائے گا۔"

"جوادی! بس کر دے نا۔ بات نہ پکڑا کر اور اچھے اچھے کھلے کھلے رنگ لینا۔ نجھی کی شکل و رنگ روپ شروع سے فقیرنیوں جیسی ہی ہے، ذرا کھلے رنگ پہنے گی تو ہی رونق آئے گی۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے اماں! پر یہ تو بتائیں، شادی پر جائے گا کون کون؟" جوادی کی والدہ نے اہم مسئلہ اٹھایا۔

"بھئی۔ بلایا تو سب کو ہے۔ اب جو بھی جانا چاہے۔"

"ایسا ہے آپا کہ میرے اسکول میں تو آج کل کام بہت ہے، میں نہیں جا سکوں گا اور میں نہیں جاؤں گا تو پھر ہماری بھابی (شبلی کی والدہ) وہ بھی نہیں جا سکتیں کہ میرے لیے کھانا وغیرہ بھی تو بنے گا کہ نہیں۔"

"اور میں تو کہے دیتی ہوں اماں! مجھ سے گلہ کرنا نہ امید رکھنا آپ کے ہیڈ ماسٹر بیٹے نے آج کل بڑا کھپایا ہوا ہے مجھے، اسکول میں امتحان ہونے والے ہیں اور یہ لوگ درجنوں کی تعداد میں نالائق اسٹوڈنٹس کو گھر بلا کر پڑھاتے ہیں، چائے بناتے ہیں، تو خود کالی نیلی چائے بن گئی ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے، میں، شبلی اور جوادی جائیں گے۔ یہ بچے بھی گلہ کرتے رہتے ہیں، کہیں تفریح کے لیے

نہیں لے جاتے تو چلو ان کا گلہ بھی دور ہو جائے گا۔"
"ہمیں پتا ہوتا یہ گلہ اس طرح دور ہوگا تو کبھی کرتے ہی نا۔" جوادی افسردہ تھا۔
شبلی اس وقت وہ گلاس لبوں سے لگائے بادام کا شربت پی رہا تھا۔ جو دادی نے اپنے لیے بنوایا تھا مگر باتوں میں پینا بھول گئی تھیں۔



شادی میں ابھی تین روز باقی تھے۔ لیکن دادی کا کہنا تھا۔
"اقبال میری دوپٹہ بدل سگی بہن ہے' اب میں غیروں کی طرح عین مہندی کے روز جاتی کیا اچھی لگتی ہوں' پہلے جانا ہی مناسب ہے۔"
شادی والے شہر جانے کے لیے ہیڈ ماسٹر ابا کی گاڑی لی گئی تھی' جسے شبلی نے ڈرائیو کرنا تھا اور ابا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔
"اگر گاڑی میں کوئی خرابی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا اور کان کھول کر سن لو' جوادی کو تو ہاتھ بھی نہ لگانے دینا' یہ گاڑی کو چلاتا نہیں' جہاز سمجھ کر اڑاتا ہے۔"
"دادی! آپ تو کہتی تھیں گاؤں ہے۔ یہ تو چھوٹا موٹا شہر بن چکا ہے۔" شبلی نے اس چھوٹے سے پر رونق شہر میں داخل ہو کر خوش ہو کر کہا تھا۔
"یہ سب دکھاوا ہے' لوگ ویسے ہی پر خلوص اور زبان کے کڑوے ہیں' بات بات پر انا کے مسئلے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جس گھر کی لڑکی زیادہ پڑھ لکھ جائے' وہ خاندان بے غیرت مشہور ہو جاتا ہے۔"
"واہ' واہ' واہ پھر یہ نانی بالی کا تعلق غیرت والوں سے ہے یا بے غیرتوں سے؟" جوادی نے معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔
دادی نے چمک کر فرمایا۔ "اس کا تو پتا نہیں' لیکن اس طرح کے سوال اگر تم نے گھر والوں کے سامنے کیے تو میرا خاندان ضرور غیرت کے تقاضوں کے خلاف قرار دیا جا سکتا ہے۔ زبان بند ہی رکھنا اپنی۔"
"دادی! آپ تو خفا ہو گئیں۔ میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا' ویسے کتنی دور جانا ہے۔ ابھی شہر تو شروع ہو چکا ہے۔"
"بس اگلا محلہ اقبال کا ہے۔ کھلی سی گلی میں جس دروازے کے آگے بھینس بندھی ہوگی' وہی گھر اقبال کا ہوگا۔"
"اچھا اور جو اتنے سالوں میں بھینس داغ مفارقت دے چکی ہوئی تو پھر؟"
شبلی کو نشانی پر اعتراض تھا۔
"تو پھر۔" دادی ہنسیں۔ "پھر اقبال کا کالا بجنگ میاں تو ضرور ہی دروازے پر بیٹھا ہوگا اور مسواک سے دانت چمکا رہا ہوگا۔"
اور دادی کا قیاس درست تھا۔ بھینس بھی ابھی تک زندہ تابندہ تھی اور ایک ثابت مسور جیسے کالے سے بڑے میاں بھی دروازے کی پہلی سیڑھی پر بیٹھے دل جمعی سے مسواک فرما رہے تھے۔
"ان میں سے بھینس کون سی ہے؟" جوادی نے دونوں کو بغور دیکھا اور دادی سے کراری سی چپیڑ کے حق دار ٹھہرے۔
"گاڑی پر مہمان آئے ہیں۔" بچوں نے جا کر اطلاع دے دی تھی۔
اور چونکہ ابھی تک گاڑی پر کوئی مہمان نہیں آیا تھا اس لیے استقبال شاندار رہا۔
"اقبال! یہ تو ہے' ہائے اتنی کمزور ہو گئی ہے۔"
دادی جا کر ایک ہم عمر خاتون کے گلے لگ گئیں۔
دونوں نے بچوں اور خواتین سے سجے اس ہجوم کو دیکھا' پھر پیشانی تک ہاتھ لے جا کر شائستگی سے سلام کیا۔
جواب میں شرمیلی سی بھنبھناہٹ ابھری اور کھلکھلاہٹیں بلند ہوئیں۔
"یہ پوتے ہیں میرے' وے بے ہدایتو آگے آؤ سلام کرو۔ یہ بھی دادی ہے تمہاری۔ ویسے اقبال! جب میں نے تمہارے بارے میں بتایا تو دونوں ضد کر کے ساتھ آئے ہیں۔"
"اچھا ضدی بھی ہیں' ہاں جی' آخر پوتے کس

والے کے ہیں' تیرا میاں کم ضدی تھا۔ میں نے تو نام لی کتے کی دم۔"

"اوں ہوں!" دادی کھنکاریں آنکھوں ہی آنکھوں میں یاد دلایا۔ اب وہ جوانی دیوانی کے دن نہیں ہیں کہ جو منہ میں آیا بک دیا' اب تو مجبوراً" اولاد کے سامنے سنجیدہ بننا ہے۔

"چلو چلو' اندر تو آؤ۔ دیکھو کیسی رونق لگی ہوئی ہے۔"

"کیا یہ دونوں بولتے بھی ہیں؟" کوئی شوخ سی لڑکی معلومات میں اضافہ چاہتی تھی۔

تینوں کو جس کمرے میں لا کر بٹھایا گیا وہاں ڈھولک کی تھاپ پر گانے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔

"ٹھو لڑکیو! مہمانوں کو بیٹھنے دو اور ممتاز کدھر ہے' اسے کہو اچھی سی چائے بجھوا دے۔"

"بھابھی تو منہ سر لپیٹ کر اپنے کمرے میں بند ہے۔"

"آئے ہائے' ایک تو اسے بے وقت ڈرامے سوجھتے ہیں۔ بلا اسے' پوچھوں تو اب کیا فساد پھیلانے کا ارادہ کر لیا ہے' اور ہاں نجی کدھر ہے؟ اسے بھی بلاؤ اور اصغری کو بھی اطلاع دو' پتا ہے اصغری صبح سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

خوش خبری دادی کے گوش گزار کی گئی۔

"کیسی ہے اصغری' وقت پر بیٹی گھر کی ہو رہی ہے خوش تو ہو گی۔"

"ہک ہا۔ خوشی کی بھی خوب ہی کہی تم نے' ارے یہ جو دنیا ہے نا' کہاں کسی کو خوش ہونے دیتی ہے۔ اب تم آ گئی ہو' رات کو الف سے یے تک بتاؤں گی سب تمہیں۔"

"سلام دادی!" دبلی پتلی سانولی سی لڑکی جس نے پیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کمرے میں داخل ہوئی اور دادی کے سامنے جھک گئی۔

"ارے یہ تو نجی ہے' کتنی بڑی ہو گئی ہے۔" دادی نے سینے سے لگایا۔

"بڑی ہو گئی ہے' اسی لیے تو بیاہ رہے ہیں۔" اقبال

بیگم دل کھول کر ہنسیں۔
"ہاں بھئی اللہ خیر سے اپنے گھر لے جائے' یہ دونوں تیرے بھائی ہیں او تم دونوں منہ اٹھا کر کیوں بیٹھے ہو' ہاتھ پھیرو بہن کے سر پر۔ دعائیں دو اسے۔"
دونوں جھٹ کھڑے ہوئے۔ اکٹھے ہی اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ مگر وقت پر دعا کوئی نہیں سوجھی۔
جوادی بولا۔
"پیاس لگ رہی ہے' پانی پلا دو۔"
اس پر شبلی کو دعا یاد آ گئی۔ "اللہ ہمیشہ تمہیں سیراب رکھے۔"
"کیا ہے کس نے بلایا تھا مجھے؟" قدرے فربہ اور پھیلے پھیلے نقوش والی نک چڑھی سی خاتون زمانے بھر کی سستی چہرے پر سجائے کمرے میں داخل ہوئیں۔
"یہ غلطی میں نے کی ہے۔" اقبال بیگم نے اعتراف جرم کیا۔
"کیوں اب کیا ہوا ہے' دو گھڑی چین نہیں ہے میرے لیے؟"
"یہ اس گھر کی اکلوتی بہو ممتاز ہے۔" اقبال بیگم نے تعارف کرایا تھا۔
"ابھی آنکھ لگی تھی میری۔" ممتاز نے پھر جتایا۔
"تا یہ کوئی وقت ہے سونے کا۔ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ تمہاری ساس اکیلی چولہے کے آگے بیٹھی ہے۔ تمہیں پروا ہی نہیں ہے' جاؤ چائے بنا کر لاؤ۔"
ممتاز اسی سستی اور بے زاری کے ساتھ پلٹی۔
"او ہاں' یاد آیا۔ تمہارے بھائی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا ممتاز کو بھیج دو' وہ شادی پر ہماری طرف سے شرکت کرے گی۔ میں نے بتایا تو تھا اسے کہ لڑکی والوں کی طرف سے شرکت کا فیصلہ ممتاز کا اپنا ہے' مگر تیرے بھائی کو یقین نہیں آیا۔ اب خود بات کر لے اس سے اور بتا دے ہماری طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔"
"کر لوں گی۔" ایسا کہتے جو چمک آنکھوں میں ابھری اور خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر آئی تھی۔ جوادی' شبلی سے چھپی نہیں رہ سکی۔

"ممتاز کے بھائی سے شادی ہو رہی ہے نچھی کی۔ ممتاز اور جمال نصرت کے تایا کے بچے ہیں' یہ رشتے بچپن میں ہی طے کر دیے گئے تھے۔"
اقبال بیگم بتا رہی تھیں اور جوادی شبلی معاملے کی تہہ تک تقریباً پہنچ ہی گئے تھے۔
"جاؤ لڑکیوں باہر پیپل کے نیچے ڈھولک رکھ کر بیٹھو اور گاؤ۔"
"ادھر تو بڑی گرمی ہے دادی۔"
"گرمی کی کچھ لگتی۔ لڑکیوں میں برداشت ہونی چاہیے' اب کیا پیپل کے نیچے اے سی لگوا دوں۔"
"میں چائے لاتی ہوں۔" نصرت اٹھ کھڑی ہوئی۔
"بیٹھی رہ لڑکی! تو کیا رخصتی تک کام ہی کرتی رہے گی؟" اقبال بیگم نے گھرکا۔
"بھابھی چائے نہیں لائے گی۔" وہ آہستگی اور سنجیدگی سے بولی تھی۔
"تو جا اپنے کمرے میں' ابھی سدرہ سے کہتی ہوں' بنا لاتی ہے۔"
"لگتا ہے' بہو بہت ہی بد دماغ ہے۔" دادی نے قیاس کیا۔
"کیوں نہ ہو' اس گھر کی بیٹی اس کے میکے کی چھوٹی بہو بن کر جا رہی ہے۔" اقبال بیگم کچھ اداسی سے بولی تھیں۔
"اوہ! تو ایسا ہے' مگر یہ رشتے تو پیار اور محبت کے ہوتے ہیں۔"
"چھوڑ بھی' یہ ادلے بدلے کے رشتے صرف ضد اور انا کے ہوتے ہیں۔ میری اصغری بھی سخت پریشان ہے' مگر کیا کریں۔ برادری کا معاملہ ہے' سب ہی کسی نہ کسی رشتے سے ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ بس اللہ رحم کرے۔ نصرت بڑی صابر اور خاموش طبع مگر ذہین لڑکی ہے اور ممتاز کا چھوٹا بھائی جمال ابھی تک کاکا ہی بنا ہوا ہے' اپنی کوئی سوچ ہی نہیں ہے' جو ماں' بہنوں نے سکھا دیا بس اسی پر آنکھیں بند کر کے چل پڑا۔"
"یوں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اقبال' نصرت

کیسے گزارہ کرے گی؟"
"میں نے کہا نا' برادری کا معاملہ ہے۔ نصرت جیسی اور بھی کئی لڑکیاں ہیں' جو چپ چاپ ممتاز جیسی بھابیوں' بھاجوں کی زیادتیاں سہہ رہی ہیں' بس زندگی اسی کا نام ہے۔"
اتنے میں نصرت چائے لے آئی' چائے اچھی تھی اور بڑے سلیقے سے پیش کی گئی تھی۔
دونوں لڑکے خاموش تھے۔
" نصرت کا بھائی یعنی ممتاز کا میاں بیوی سے کچھ نہیں کہتا؟"
"کیا کہے' جو کہے گا' بہن کو بھگتنا پڑے گا۔ یوں بھی میری اصغری کے بچے ماں کی فطرت لے کر آئے ہیں۔ سادہ مزاج اور نیک بچے ہیں' خوامخواہ کے جھگڑوں سے دور بھاگتے ہیں۔"
ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ ممتاز چلی آئی۔
"دادی! گھر فون کیا تھا میں نے۔ میری اماں پوچھ رہی ہیں' ٹی وی اور فریج فل سائز کا تو لیا ہے نا۔ جمال کو یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جو خانہ پری کے لیے دی جاتی ہیں' پسند نہیں ہیں۔ میں نے کہہ دیا ابھی تک تو دور' دور تک ان دونوں چیزوں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔"
"ٹی وی اور فریج ہماری دادی تحفے میں دے رہی ہیں۔" شبلی نے کہا تھا اور دادی نے حیرت سے دیکھا۔
"آ۔ اچھا!" ممتاز کو بھی جھٹکا سا لگا' پھر بولی۔
"اور آپا کہہ رہی ہیں۔ یہ آپ لوگوں نے ہلکی سی کمپنی کی جو موٹر سائیکل خریدی ہے' اس پر بھی جمال بڑا ناراض ہے۔ اسے واپس کروا کر اچھی سی بھاری والی موٹر سائیکل خریدیں۔"
"نا تو' تو یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہے کہہ نا۔ اپنے گھر والے سے۔ خریدے یہ سب کچھ تیرے بھائی کے لیے۔"
"میرے بھائی کے لیے کیوں دادی؟ یہ تو تمہاری لڑکی کا جہیز ہے اور میرا میاں کیوں کرے یہ سب۔ نصرت کی اماں کے پاس جو اتنا زیور ہے۔ وہ کیا قبر میں لے جانا ہے' بنائے نا اپنی بیٹی کا جہیز۔"
"اے لڑکی! تم جہیز میں کیا' کیا لائی تھیں؟" دادی برداشت نہ کرسکیں اور جو دادی کے منہ کا سوال کر بیٹھیں۔
"میں جو بھی لائی تھی مگر یہ سب میرے بھائی کی ڈیمانڈ ہے' میں کوئی اپنے منہ سے یہ سب نہیں کہہ رہی' نہ ہی مجھے اس میں سے حصہ لینا ہے۔"
ممتاز اتنا کہہ کر جھٹکے سے مڑی تھی' اور نصرت تھک کر بیٹھ گئی تھی۔
"اقبال! میں تو ہلکی پھلکی چیزیں ہی بچی کے لیے تحفے کے طور پر لائی تھی' مگر اب میرے بچوں نے یہ ٹی وی' فریج کی بات کی ہے تو میں دلا کر رہوں گی۔ ابھی اپنے بیٹے کو فون کرتی ہوں۔ شہر سے بھجوا دے گا۔"
"نہیں نہیں دادی! آپ تکلیف کیوں کرتی ہیں۔"
نصرت نے کہا اور اقبال بیگم نے بھی نواسی کی ہاں میں ہاں ملائی۔
"تم رہنے دو' ہماری بچی کے نصیب میں اگر خوشی ہے تو ان چیزوں کے بغیر بھی اسے مل جائے گی اور ان کی فرمائشوں کو ہم کہاں تک پورا کریں۔ بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ ممتاز کا میاں حسنات' نصرت کا اکلوتا بھائی ہے اور اس کے اپنے دو بچے ہیں۔ بیوی سے بگاڑ نہیں سکتا' جو کماتا ہے بیوی کے ہاتھ پر رکھتا ہے' اب جو نصرت کا یہ جہیز بنا ہے نا تو یہ سب اصغری اور اس کے میاں کی جمع پونجی ہی ہے' مگر نصرت کا باپ بے چارہ بھی اب بوڑھا ہو رہا ہے۔ بیمار آدمی ہے' کہاں سے منہ بھرے ان کے اور ممتاز چاہتی ہے جب تک اصغری کی ایک ایک انگوٹھی نہ بک جائے فرمائشیں جاری رہیں' مگر اصغری بے چاری کو ابھی نصرت سے چھوٹی عطرت بھی تو بیاہنی ہے اور برادری میں تو جتنا جہیز پہلی کو دو' اتنا ہی دوسری کو بھی دینا پڑتا ہے۔"
"دُر فِٹے منہ' لعنت ایسی برادری پر۔" دادی جوش میں آگئیں۔
"کیا کریں مجبوری ہے۔" اقبال بیگم افسردہ تھیں۔

جوادی اور شبلی چائے پی کر کمرے سے باہر آ گئے۔
سامنے گھنے پیپل کے نیچے لڑکیاں ڈھولک لیے بیٹھی تھیں' بدقسمتی سے کسی ایک گانے پر اتفاق نہیں ہو سکا تھا' تو اب لڑائی جاری تھی۔
"لاؤ۔ ادھر دو ڈھولکی' مرجانیو! کبھی تو صلح صفائی سے مل جل کر بیٹھ جایا کرو۔" جوادی نے ڈھولک دبوچی اور لتاڑا۔
"آپ کون ہیں ہمارے معاملے میں بولنے والے؟" لڑکیوں کو شاید ڈانٹ تیا گئی تھی۔
"کوئی نہیں ہیں تو ہو بھی سکتے ہیں۔ اس امکان کو ذہن میں رکھیں خواتین۔" شبلی کی بات پر لڑکیاں بے چاریاں شرماتیں نہ تو اور کیا کرتیں۔
"نور جہاں! چینی کا پیکٹ کدھر رکھا تھا؟" ایک ذمہ دار سی لڑکی چلی آئی تھی۔
"وہ تو میں نے ماسی برکت کو دیا تھا۔"
"اوہو! میں نے کہا تھا اسٹور میں رکھ دو' اب یہ ماسی برکت پتا نہیں کدھر ہو گی۔"
"عطرت! یہ دونوں کون ہیں؟" ایک لڑکی نے شرما کر پوچھا تھا۔
"یہ!" اس نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ "مہمان ہیں۔"
"سبحان اللہ۔ کیا جامع جواب ہے۔" جوادی جھوم اٹھا۔ "اب اپنا تعارف بھی کروا دیں۔"
"یہ میزبان ہیں۔" جواب شبلی نے دیا اور جوادی پھر جھوم اٹھا۔
عطرت نے کچھ نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں انہیں دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔
"چلو 'میں سس کنی' گاتے ہیں۔"
جوادی نے ڈھولک بجانی شروع کی' لڑکیاں زور شور سے گانے لگیں۔
"ہاں ہاں۔ یہ ہی امید ہے اس سے' جاتے ہی میری ماں کو مارے گی' خبردار جو کسی نے یہ گانا گایا' گلا گھونٹ دوں گی میں۔" ممتاز آگ بگولہ ہوتی چلی آئی تھی۔
"چلو۔۔۔ نند گلی کا گند۔" گاتے ہیں شبلی نے کہا اور شروع ہو گیا' سب پوری آواز سے گا رہے تھے۔ ممتاز ہاتھ نچا کر کیا کہہ رہی تھی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا' آخر وہ پیر پٹختی چلی گئی۔



شام اتر آئی تھی اور گھر میں روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ کتنی جگمگاہٹ تھی' مسکراتے نوجوان لڑکے لڑکیاں ہنستے مسکراتے شرارتیں کرتے بچے سجی سنوری سہاگنیں اور باتوں میں مگن بزرگ اگر کوئی سوگوار تھی تو وہ جس کے لیے یہ محفل سجائی گئی تھی۔
نصرت پیلے جوڑے میں خود بھی زرد دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی' نہ آنکھوں میں چمک۔ وہ آج بھی عطرت کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کاموں کو نپٹانے میں لگی تھی کہ فارغ بیٹھتی تو سوچیں اسے الجھانے لگتی تھیں۔
"یہ حسنات بھائی ہیں۔ بیوی کے غلام' بزدل۔" نصرت کی سہیلی کو ایک لڑکی بتا رہی تھی۔
"ہاں۔ میں جانتی ہوں' مگر یہ نہیں پتا تھا شادی کے بعد اتنے بدل گئے ہیں۔"
"ارے بیوی سے پوچھے بغیر سانس بھی نہیں لیتے۔"
اتنا سننے کے بعد جوادی اور شبلی یہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے' جا کر حسنات سے ہاتھ ملایا اور تعارف کروایا۔
"او اچھا! آپ دونوں آئے ہیں' نانی اماں کی پرانی سہیلی کے ساتھ' بڑا انتظار تھا نانی کو آپ کا۔"
"جی ہم ہی آئے ہیں اور بڑا حیران ہوئے ہیں اس شادی میں شریک ہو کر۔"
"میں سمجھا نہیں۔" حسنات حیران تھا۔
"حیران ہیں' آج کے دور میں بھی بہنوں سے اتنی محبت کرنے والے' ان کا اتنا خیال رکھنے والے بھائی موجود ہیں۔ کیا کچھ نہیں دے ڈالا آپ نے بہن کو جہیز میں۔"
"جہیز' وہ تو۔" حسنات سچ کہتے کچھ اٹکا۔

”جی جی۔ آپ کی نانی ہماری دادی کو بتا رہی تھیں ایک ایک چیز آپ کے خون پسینے کی کمائی سے بنی ہے اور آج آپ کی سسرال جواب آپ کی بہن کی سسرال بھی بننے جا رہی ہے‘ ادھر سے فل سائز فریج اور ٹی وی کی فرمائش بھی آگئی ہے۔“

”آ آ چھا‘ مگر مجھے تو نہیں پتا۔“

”آپ کی بیگم نے ہی فرمائش کی ہے۔ آخر اب وہ نند ہے آپ کی بہن کی۔“

حسنات خاموش سا ہو گیا۔

”بھئی‘ جب آپ نے بیوی کے جہیز میں یہ سب لیا تھا تو اب دینا بھی ہو گا۔“

”ہم نے تو جہیز میں کچھ نہیں مانگا تھا۔ ممتاز چند جوڑے کپڑے تھوڑا زیور اور معمولی سا فرنیچر لائی تھی۔“

”اچھا پھر ایسے موقع پر مطالبہ کر دینا تو آپ کا حق بنتا ہے۔“

”یہ ٹی وی اور فریج والی فرمائش کب ہوئی ہے میں نے تو سوچا تھا چلو اب جہیز مکمل ہو گیا ہے۔“

”یاد آیا‘ وہ بائیک ابھی انہیں پسند نہیں آئی۔“

”کمال کرتے ہیں یہ لوگ۔ ہمارے سگے تایا کا گھر ہے اور ممتاز سے میں نے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا‘ مگر۔“

”او میں کیا جی۔ کدھر کھڑے ہو گئے ہو ادھر آؤ۔“

”جی جی۔ آیا!“ حسنات صاحب ممتاز کا حکم سنتے ہی قلانچیں بھرتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

”لو یہ بھلا بیوی سے بازپرس کر سکتا ہے۔ ابھی افسردہ اور نالاں دکھائی دے رہا تھا‘ ایک آواز پر حاضر ہو گیا ہے۔“

”اگر جو یہ سب جہیز حسنات کی کمائی سے بنتا تب ممتاز نئی نئی فرمائشیں نہ کرتی۔“

”اب بھی کچھ نہ کچھ تو نکلوانا ہو گا حسنات صاحب کی جیب سے۔“

”ٹھیک کہتے ہو شبلی! میرا خیال ہے‘ یہ ٹی وی‘ فریج اور بائیک اب حسنات صاحب ہی دیں تو مزہ ہے۔“

ابھی دونوں یہیں کھڑے بات کر رہے تھے کہ حسنات صاحب تیزی سے کمرے سے واپس آتے دکھائی دیے۔

”بھئی لڑکیو! جلدی جلدی جگہ بناؤ۔ لڑکے والے آ رہے ہیں‘ عطرت! عطرت! کدھر ہو بھئی۔ وہ لڑکے والے آ رہے ہیں۔ اماں سے پیسے لے کر مٹھائی منگواؤ اور ٹھنڈی بوتلوں کا بھی انتظام کرو۔

”مٹھائی اور بوتلیں ہم لے آتے ہیں‘ آپ پیسے دیں۔“ دونوں آگے بڑھے۔

”پیسے میری امی سے لے لو نا!“ حسنات پیچھے ہٹا۔

”خالہ اصغری تو ابھی ابھی پڑوسن کے ساتھ کہیں گئی ہیں۔ آپ فی الحال دے دیں۔ بعد میں ہم واپس کر دیں گے۔“

بادل نخواستہ حسنات کو پیسے پکڑانے پڑے اسی وقت ممتاز آگئی۔

”یہ۔ یہ اتنے پیسے کیوں دیے ہیں؟؟“

”وہ ان کے سسرال والے آ رہے ہیں تو یہ چاہ رہے تھے‘ خاطر اچھی سی ہو۔“ شبلی نے بتایا۔

”وہ اب نصرت کے سسرال والے ہیں۔ اسی کے لیے آ رہے ہیں۔ پیسے تمہاری اماں کو دینے چاہیے تھے۔“

”یہ کہہ رہے کچھ فرائض میرے بھی تو بنتے ہیں۔“ جوادی نے یہ کہہ کر ممتاز کے چہرے کا رنگ تبدیل کر دیا اور دونوں وہاں سے خاصے فاصلے پر جا کھڑے ہوئے۔

لڑکیاں جلدی جلدی جگہ بنا رہی تھیں۔ مگر ممتاز کا جوش و خروش ماند پڑ چکا تھا۔

”اے اسے کیا ہوا ہے آج؟ اس کے گھر والے آ رہے ہوں تو یہ ایک منٹ نہ خود ٹک کر بیٹھتی ہے‘ نا کسی کو بیٹھنے دیتی ہے۔“ اقبال بیگم حیران تھیں۔

”وہ اصل میں حسنات بھائی نے کہہ دیا ہے۔ ٹی وی‘ فریج وہ خود دیں گے اور بائیک کا انتظام بھی کریں گے۔“

جوادی نے سنجیدگی سے بتا کر خواتین میں خوشی کی لہر

دوڑادی۔

"چلو دیر سے ہی سہی' حسنات کو خیال تو آیا۔" اصغری خالہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

شبلی جاکر حسنات کو پکڑلایا۔

"دل خوش کردیا ہے تم نے ماں' بہنوں کا اب اپنے بیان پر قائم رہنا۔ میں کہتی ہوں حسنات! بزدلی چھوڑدو مرد ہو' مرد بن کر رہو۔"

اقبال بیگم کی باتیں وہ منہ کھولے سن رہا تھا۔

"اماں! اب تو نہ غصہ کریں۔ اتنا کچھ تو کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔" اصغری نے کہا۔

"جی!" حسنات ہکلایا۔

"ہاں۔ اب قائم بھی رہنا' یہ نہ ہو بیوی گھور کے دیکھے اور تم ارادہ بدل لو' اب اپنی بیوی کے بھائی کی فرمائش تم ہی کو پوری کرنی ہے۔"

"ہاں ہاں۔ آنٹی! کہہ تو رہے ہیں بے چارے ٹی وی' فریج' بائیک یہ ہی دلائیں گے اپنے سالے صاحب کو۔"

یہاں موجود برادری کی اتنی ساری عورتیں۔ انکار کریں تو کیسے کریں عجیب سی مسکراہٹ سجاکر خاموش رہا۔

"اے میں نے کہا جی۔ ادھر کیا کررہے ہو' لڑکے والے آنے والے ہیں۔ ابھی تک مٹھائی اور بوتلوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔" ممتاز چلی آئی تھی۔

"آ۔ ہاں وہ تم دونوں گئے نہیں؟" حسنات نے پوچھا۔

"ہمیں یہاں کے راستوں کا کیا پتا۔ جائیں حلوائی کی تلاش میں اور کھڑے ہوں آلو' ٹنڈوں کے ٹھیلے پر' ایک لڑکے کو پیسے پکڑائے تو تھے' لاتا ہی ہوگا۔"

"ہائے ہائے کس لڑکے کو پکڑادیے' پہچان تو ہے نا اس کی؟" ممتاز پریشان ہوئی۔

"پوچھا تھا نام۔ کہنے لگا ممتاز باجی کا رشتے دار ہوں۔"

"لو جی۔ نام بھی نہیں بتایا۔ ضرور کوئی چور اچکا ہی ہوگا' گئی رقم ہاتھ سے۔ نا تمہیں ضرورت کیا تھی اتنا سجی بننے کی۔"

"آخر ان کے سسرال والے آرہے تھے۔" جوادی نے یاد دلایا۔

"وہ اس وقت ان کے نہیں ان کی بہن کے سسرالی بن کر آرہے ہیں اور یہ بھی سارے کان کھول کر سن لو۔ ان کے آتے ہی میں ان کی طرف سے شریک ہوکر بیٹھوں گی' مجھے کاموں کے لیے کوئی آواز نہ دے' ہاں نہیں تو۔"

ممتاز لمبا سا گھنگھرو والا پراندہ لہراتی چلی گئی۔

"لائیں نکالیں پیسے۔ بوتلیں اور مٹھائی منگوانی ہے۔" شبلی حسنات کو یاد دلا رہا تھا۔

"رہنے دو' پہلے ہی اتنے پیسے برباد کردیے۔"

"اے یہ خوب کہی حسنات میاں! اپنے چند ہزار پر اتنا رونا اور وہ جو تمہاری بیوی فرمائشی جہیز بنواکر لاکھوں روپے کو آگ لگارہی ہے' وہ کسی گنتی شمار میں نہیں' صرف اس لیے نا کہ وہ تمہاری کمائی نہیں۔ بوڑھے باپ کی محنت اور ماں کی عمر بھر کی بچت ہے۔"

دادی نے تمام مجمع کے بیچ خبر لی۔

"ہائیں تو یہ جہیز حسنات نہیں بنوا رہا۔" خاندان کی عورتیں پہلے حیران ہوئیں' پھر حسنات کو لعن طعن کرنے لگیں۔

اور اقبال بیگم سر پکڑے بیٹھی تھیں' کہا بھی تھا بچپن کی اس سہیلی سے یہ بات صرف خود تک محدود رکھنا' مگر بھول گئی۔ یہ تو شروع سے منہ پھٹ رہی ہے۔

"او مٹی کے مادھو! اپنی بیوی اور اس کے گھر والوں سے یہ کیوں نہیں پوچھتے جب بیٹی رخصت کی تھی تب تو ایسا کچھ نہیں دیا تھا۔"

"کیا ہوا' کیوں شور مچا رکھا ہے؟" ممتاز مجمع چیرتی ہوئی اپنے میاں کے برابر آکھڑی ہوئی۔

"اے تاجی!" یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ نصرت کا جہیز بھائی اور بھابھی جی بنوا رہے ہیں' تم میاں' بیوی نے ایک دھیلا نہیں لگایا۔"

"بات یہ ہے کہ پھوپھی جی! جس کے پاس ہے وہ

لگائے گانا۔ ہمارے پاس ہے کیا؟"
"ملعنت ' نٹے منہ ممتاز ' وہ جو کل تو لہک لہک کر اپنے نئے سونے کے کڑے دکھا رہی تھی۔ وہ کیا چوری میں ملے ہیں۔"
"دیکھا تم نے ' یہ تمہاری ماں ' بہن ہمیشہ میری بے عزتی کروا کے خوش ہوتی ہیں ' جو دے رہی ہیں اپنی بیٹی کو دے رہی ہیں ' کوئی میرے کمرے میں نہیں سجے گا یہ جہیز۔"
"تو تیری ماں نے تیرا کمرہ سجانے کو کیوں جہیز نہیں دیا تھا اور یہ بھی ہم جانتے ہیں تم لوگ فرمائشیں کر رہے ہو۔"
خاندان کی ایک بڑی بوڑھی کو طیش آگیا تھا۔
"یہ فریج اور بائیک تو کمرے میں سجنے سے رہی۔"
جوادی نے موقع دیکھ کر یہ بھی یاد دلا دیا۔
"دیکھا دیکھا ' سب میری بے عزتی کر رہے ہیں ' ہونے والے داماد کی بہن ہوں ' مگر کیسے مٹی پلید کی جا رہی ہے میری ' بھئی یہ رشتہ ہم نے کوئی زبردستی تو نہیں کیا ' اب بھی تم لوگ انکار کر دو ' میں منع کر دیتی ہوں اپنے گھر والوں کو ' کوئی بارات نہیں آئے گی یہاں۔"
"مناسب تو یہ ہے۔" شبلی نے یہ سوچتے ہوئے اقبال بیگم اور اصغری خالہ کی طرف دیکھا۔
وہ بہت ڈری ڈری دکھائی دے رہی تھیں اور شبلی نے کچھ بولنے کا ارادہ ترک کر دیا۔
"ہاں دیکھا ' اب کیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ یہ تو نصرت کی قسمت اچھی ہے جو میرے بھائی جمال جیسا اسے مل رہا ہے ' ورنہ ایسی معمولی شکلیں گھروں میں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔"
ممتاز سر اٹھا کر چلتی ان کے درمیان سے نکل گئی تھی۔
"معاملہ خاصا ٹیڑھا ہے ' مگر سیدھا کرنے کی کوشش تو کرنی ہی ہو گی۔"
ابھی دونوں میں بات چیت جاری تھی کہ دولہا کی طرف سے ممتاز کی چار نک چڑھی بہنیں اور رنگالی ہری مرچ کی خصوصیت رکھنے والی خالہ ' پھپھیاں وغیرہ چلی آئیں۔
ممتاز نے جا کر ایک ایک کی شکایت لگائی اور اب عطرت ' اصغری خالہ اور خاندان کی چند دوسری خواتین ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں لگی تھیں۔
"اے مجھے بھی بتاؤ۔ ہوا کیا ہے ' میری نچھی کدھر ہے ' دکھائی نہیں دے رہی۔"
آنے والیوں میں ایک بوڑھی سی خاتون آنکھوں میں جذبات کا سمندر لیے نچھی کی تلاش میں ادھر ادھر سر گھما رہی تھیں۔
"یہ کون ہے محبت کی ماری؟" جوادی نے ایک لڑکی سے پوچھا۔
"ارے آپ نہیں جانتے یہ ساس ہے نچھی کی۔"
"ساس ' کیا یہ کرائے پر لی ہے۔ ان سب سے تو بالکل مختلف ہے؟" دونوں حیران تھے۔
جی نہیں اصلی ہے ' کرائے پر تو قاتل لیے جاتے ہیں۔" لڑکی بھی ذہین و فطین تھی۔
"ارے قتل ہی تو کر ڈالا ہے ان کی ادا نے ہمیں ' یہاں ساری کی ساری نچھی کو کچا چبانے کے در پے ہیں اور یہ ہیں کہ اس کی محبت میں ایسے تڑپ رہی ہیں جیسے جل بن مچھلی تڑپتی ہے۔"
"بے چاری سیدھی سادی خاتون ہیں ' پھر کانوں سے بہری بھی ہیں ' اس لیے کوئی لفٹ نہیں کراتا ' یہ بھابھی ممتاز اور ان کی بہنیں ہی گھر کی کرتا دھرتا ہیں۔"
"اور وہ جمال ' صرف جمال ہی جمال ہے یا جلال میں بھی آتا ہے؟"
"وہ بے چارے اتنی ساری بہنوں کے اکلوتے لاڈلے چھوٹے بھیا ' بس چپ ہی رہتے ہیں ' یہ دو گلیاں چھوڑ کے تو گھر ہے ' ملاقات کر آئیں آپ۔"
"ہوں! شبلی! پھر کیا خیال ہے شادی سے پہلے ایک ملاقات کر نہ لی جائے۔"
"میرا خیال ہے جوادی! ہمیں پہلے حسنات سے ایک میٹنگ کر لینی چاہیے۔ اس وقت بیگم صاحبہ کا آسیب بھی ادھر موجود ہے ' شاید بات ان کی سمجھ میں

آجائے۔"

"ہاں چلو کوشش کر دیکھتے ہیں۔"

دونوں حسنات کی تلاش میں باہر آئے تو اسے مٹھائی کی پلیٹ پکڑے کہیں جاتے پایا۔

"کیا ہوا، ٹہل ٹہل کر کھائیں گے کیا۔ ویسے اچھا طریقہ ہے ساتھ ساتھ ہضم بھی ہو جائے گی، ہے نا۔"

"او نہیں نہیں۔ وہ تو میں جمال کو دینے جا رہا تھا۔"

"خوامخواہ بھئی۔ اب جو رشتہ آپ کا جمال سے ہے وہی جمال کا آپ سے۔"

حسنات گھبرایا، پھر دھیرے سے بولا۔ "ممتاز کو تم نہیں جانتے، ناراض ہو جائے گی۔"

"مجھے لگتا ہے حسنات بھائی! آپ خود کو بھی نہیں جانتے، سچی آپ سے مل کر سخت شرمندہ ہوں۔ دھبہ ہیں، آپ مردانگی کے نام پر۔"

"تم بھی تم دونوں کی شادی نہیں ہوئی نا۔ اسی لیے بڑھ بڑھ کر بول رہے ہو۔"

"تو کیا آپ دنیا میں اکیلے مرد ہیں جسے شادی کی سزا ملی ہے، ارے آس پاس روزانہ کتنے ہی ملتے ہیں جن کے سہرے کے پھول کھل چکے ہیں، لیکن سچ کہتے ہیں شادی کے بعد مرد کو بھیگی بلی بنتے پہلی بار دیکھا ہے۔"

"او نا۔ تم چاہتے کیا ہو مجھ سے، اب کیا بیوی کے منہ پر طمانچہ دے ماروں۔"

"نہیں۔ فی الحال تو آپ طمانچے کھا رہے ہیں۔"

"دیکھو، میں برا بھی مان جایا کرتا ہوں۔"

"یہ ہی تو ہم چاہتے ہیں۔"

"چپ کر جاؤ۔ ممتاز کے میکے کا یہ ہی دروازہ ہے۔ گھر میں اس وقت صرف جمال ہو گا، بڑا نازک مزاج لڑکا ہے، کوئی بات بری لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے، سچ کہتا ہوں میں تو سلام دعا سے زیادہ بات نہیں کرتا اس سے۔"

باتیں کرتے تینوں گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ سامنے بڑے کمرے میں ایک لڑکا بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم! کیا حال ہے؟" حسنات نے فدویانہ انداز میں پوچھا اور مٹھائی اس کی جانب بڑھائی۔

"یہ کس سلسلے میں؟" جمال صاحب نے سنجیدگی کی دبیز تہہ اوڑھے ہوئے سوال کیا۔

"تمہاری بہن نے بھجوائی ہے۔" حسنات پھر مسکرائے۔

"کمال کرتی ہے یہ آپا بھی۔ نا کیا میں نے کبھی مٹھائی نہیں کھائی یا میں مٹھائی نہیں خرید سکتا۔"

"اچھا چلو۔ یہ تو اچھی بات ہے، کم از کم مٹھائی تو آپ خرید سکتے ہیں۔" شبلی، جوادی اس کے سامنے آ بیٹھے۔

"کیا مطلب! آپ کون ہیں؟" وہ تیوری چڑھا کر بولا تھا۔

"ہم ہی سے قرضہ لے کر تو آپ کے لیے موٹر سائیکل، فریج، ٹی وی لیا جا رہا ہے۔ ہم حیران تھے کہ جب ممتاز کے جہیز میں آپ نے یہ سب نہیں دیا تو اب لے کیوں رہے ہیں۔ اب پتا چلا، مٹھائی آپ نہیں لے رہے کہ وہ آپ خود خرید سکتے ہیں۔ یہ چیزیں نہیں خرید سکتے۔ اس لیے مانگ رہے ہیں۔"

"جمال نے آج تک کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ اوئے۔"

"یوں کہیں نا، منہ سے نہیں مانگا۔ بہن سے کہلوا دیتے ہیں۔"

"میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا اور مجھے کیا ضرورت ہے موٹر سائیکل کی۔ یہ دو گلیاں چھوڑ کر تو میری دکان ہے۔ موٹر سائیکل میں نے کیا شوکیس میں سجانی ہے اور یہ ٹی وی، فریج سب ہے میرے گھر میں، بولو حسنات بھائی۔ چپ رہ کر کیوں میری بے عزتی کروا رہے ہو، کچھ مانگا ہے میں نے؟"

"وہ پتا نہیں جمال! تمہاری بہن ممتاز تو کہہ رہی تھی کہ تم۔"

"اوہو ایک تو یہ آپا بھی نا پتا نہیں کیا کیا سیاستیں چلتی رہتی ہے، سچ کہتا ہوں حسنات بھائی! یہ سب آپ کی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ کیسے مرد ہو، بیوی نہیں سنبھالی جاتی۔"

جمال کی بات پر جوادی اور شبلی نے ہنس کر حسنات کو دیکھا۔ وہ شرمندہ ہوا اور بولا۔
"پر اب کیا کریں۔ دیکھو نا عورتوں نے تو فرمائشیں کردی ہیں۔ پوری نہیں کریں گے تو تمہاری بہن نچھی کا جینا حرام کردیں گی۔"
"میں جمال ہوں' حسنات نہیں ہوں اور میں تو حیران ہوں' آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"
"پرانی باتوں کو چھوڑیں اور حل ایسا نکالیں کہ کسی کو بھی نچھی کو کچھ جتانے کی جرات نہ ہوسکے۔"
شبلی نے کہا اور جوادی آگے بڑھ کر کچھ سمجھانے لگا۔



لڑکی والوں کے ہاں کم عمر لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں' مگر جو سمجھ داری کی عمر میں تھیں۔ وہ ڈری ڈری سی لڑکے والوں کی طرف سے آنے والیوں کے تیور دیکھ رہی تھیں۔
"نا یہ بوتلیں ہیں کہ گرم قہوہ۔"
ممتاز کی آپا نے منہ بنایا اور ساری لڑکے والیاں منہ بنانے لگیں' سوائے جمال کی اماں کے' وہ مزے سے پی رہی تھیں کہ بہری ہونے کی وجہ سے بیٹی کا تبصرہ سننے سے محفوظ رہی تھیں۔
"گرم قہوہ لگ رہا ہے تو مت پیو۔" آواز تھی کہ للکار اور وہ بھی حسنات کی طرف سے — کتنی ہی تو بے ہوش ہوتے بچیں۔
"کیا ہے' کیسے بات کر رہے ہو میرے میکے والوں سے؟"
ممتاز کمر پر ہاتھ جما کر سامنے آئی تو حسنات میاں ڈولنے لگے' لیکن پیچھے کھڑے جوادی' شبلی نے کان میں باجی حسنات کہہ کر جوش دلا دیا۔
"ٹھیک کہہ رہا ہوں نہیں رکھ دو سب بوتلیں نیچے۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کرسکتا۔"
"ہوش میں آجاؤ۔ جانتے نہیں ہو میرے خاندان کی عورتوں کو۔ یہ ہی بوتلیں تمہارے سر پر ماردیں گی۔"
"اگر ایسا کیا تو سر سلامت نہیں جائیں گے' کسی کے۔ سروں کے بغیر ہی جائیں گی ساری۔"
"اے ممتاز! تیرا میاں گانا سنا رہا ہے کیا؟" ممتاز کی اماں نے بوتل کے دو گھونٹ مزید بھر کر بڑے اشتیاق سے پوچھا' پھر لہک کر "ماہی وے سانوں بھل نہ جاویں" گانے لگیں۔
"اپنی ماں کا منہ بند کراؤ۔ اسے بتاؤ۔ میں گا نہیں رہا' غصہ دکھا رہا ہوں۔"
"پر کیوں؟ کون سا خناس دماغ میں بھر گیا ہے' کچھ پتا تو چلے۔" ممتاز فی الحال متاثر ہونے کے موڈ میں نہیں تھی۔
"یہ کہہ رہے ہیں' ٹی وی تو میرے کمرے میں نہیں ہے۔ موٹر سائیکل میری اس حال میں ہے کہ کباڑیے راہ روک کر للچائی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں تو جمال سے پہلے میرا حق بنتا ہے۔"
"ہاں ہاں تو کہو نا اپنی اماں کو۔ جب بیٹیوں کے لیے خرچ کرسکتی ہیں تو بیٹے کے لیے کیوں نہیں۔ حق بنتا ہے تمہارا۔"
"نہیں۔ جب میری بہن کو یہ سب جہیز میں مل رہا ہے تو مجھے کیوں نہیں۔"
"وہ اس لیے میاں صاحب کہ جہیز لڑکی کو دیا جاتا ہے لڑکے کو نہیں' آئے ہائے اب کیا کیا سمجھاؤں' چلو بیٹھ جاؤ ادھر' خبردار جو اٹھے۔"
"تم دیکھنے میں تو لڑکی ہی لگتی ہو۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا۔ دیکھنے میں لگتی ہوں' ہوں نہیں۔" عورتوں کی ہنسی ممتاز کو تپا گئی۔
"تو پھر تمہارا جہیز کدھر ہے؟ کہاں ہے میری موٹر سائیکل؟"
"ہائے ربا! یہ تو بالکل ہی گھوم گیا ہے۔ او کہیں تم برگد کے درخت کے پاس تو نہیں چلے گئے تھے۔"
"نہیں جی۔ ہم دونوں بھی ساتھ تھے۔ یہ برگد کے نہیں آپ کے بھائی جمال کے پاس گئے تھے اور ضد

جمال صاحب ہی کی ہے۔ کہتے ہیں اگر جہیز لوں گا تو دوں گا بھی۔ نہیں تو بے غیرت کہلانے سے بہتر ہے بہنوں کو گولی مار کر آپ بھی مر جاؤں۔"

"ہائے اللہ! یہ کہا جمال نے" "توبہ ایک تو مردوں کی مت بھی نا بس گھاس چرنے ہی گئی رہتی ہے اور تم بتاؤ تمہیں کسی نے کہا تھا' جا کر جمال کے سامنے اپنے دکھڑے رونے کو۔ لو بھلا وہ تو کل کا بچہ ہے۔"

"کل کا بچہ اب جوان ہو چکا ہے بھائی ممتاز۔" شبلی نے اطلاع دی۔

"کیا کہا؟" وہ تپ کر پلٹی۔

"آپ کے بھائی نے جوانی کی خبر دی ہے۔"

"نہیں۔ وہ دوسری بات یہ بھائی کس کو بولا ہے۔ اپنے الفاظ واپس لو۔"

"تو آپ خواتین والا روپ بھی تو دکھائیں نا۔"

"نی ممتاز! تیرا میاں کیوں میلے سے کپڑوں میں گھوم رہا ہے' خود تو سولہ سنگھار کرکے بیٹھی ہے۔ کام چور' نکمی' ایک جوڑا اس کا بھی استری کر دیتا تھا۔"

ممتاز کی اماں سن نہیں سکتی تھیں تو بے حد شاداں و فرحاں بیٹھی تبصرے فرمائی جا رہی تھیں۔

"چلو آپا! اٹھو' گھر جا کر جمال کو تو دیکھیں' چلو ممتاز! تم بھی ساتھ چلو۔" بہنیں واپسی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

"ہاں چلو' دیکھوں تو اسے۔"

"اماں! یہ اپنے حسنات کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ ضرور برگد کے درخت کے نیچے گیا ہوگا۔" اصغری حیران پریشان تھی۔

"اگر ایسا ہے تو ہمیں بھی برگد کے درخت کے نیچے جا کر جنات کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے جنات یہیں موجود ہیں۔"

دادی نے دونوں کو گہری نظر سے دیکھ کر کہا تھا اور جوادی' شبلی بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

"جنات اور یہاں؟" خواتین میں کھلبلی مچ گئی۔

"چلو لڑکیو! تم ڈھولک چھوڑ کر کیوں بیٹھ گئی ہو اور دیکھو اگر بچی کے سسرال والے کوئی مٹھائی بھول کر چھوڑ گئے ہیں تو لاؤ۔ ہم کھا لیتے ہیں۔" دادی بڑی پر جوش دکھائی دے رہی تھیں۔

لڑکیاں رات گئے تک گاتی رہیں۔ ہنسی مذاق ہوتے رہے' ممتاز کی واپسی نہیں ہوئی۔

صبح ناشتے پر بھی ممتاز کو نہ پا کر اقبال بیگم اور اصغری گھبرا گئیں۔

"خدا خیر کرے۔ یہ میکے میں بیٹھی ہے ضرور کوئی نیا شوشا چھوڑے گی۔ او حسنات! تجھے فون تو آیا ہوگا اس کا۔"

"آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا' جب تک اپنے کمرے کے لیے بڑا سا ٹی وی اور میرے لیے موٹر سائیکل نہیں لاؤ گی' واپس آنے کی ضرورت نہیں۔"

حسنات صاحب چھاتی پھلا کر فرمانے کے بعد اب داد لینے والے انداز میں سب کو دیکھ رہے تھے۔

"تو اور ممتاز کو ایسے بول دے' ناممکن۔ ضرور تو نے رات میں کوئی خواب دیکھا ہے۔" نانی بے یقین تھیں۔

"اوہو کمال ہے' بھئی سچی کہا ہے میں نے۔"

"پھر کیا کہا اس نے' ہے تو الٹی مت کی۔ کہہ دیا ہوگا' نہیں آؤں گی۔"

"نہیں آئے گی تو کہاں جائے گی۔ جمال تو پہلے ہی بڑا ناراض ہے۔ اسے تو پتا ہی نہیں تھا اماں! یہ عورتیں جہیز کے لیے کیا کیا فرمائشیں کرتی رہی ہیں' جوادی' شبلی نے بتایا' بڑا شرمندہ ہوا۔"

"واقعی؟" اقبال بیگم اب ان سے تصدیق چاہ رہی تھیں۔

"ہاں ہاں۔ سچ ہی ہوگا' میرے پوتے ہیں ہی بڑے گنوں والے' جہاں جاتے ہیں۔ خوشیاں بکھیر دیتے ہیں۔" دادی نے ان کے ہوش میں شاید آج پہلی بار انہیں سراہا تھا۔

ناشتے کے بعد دونوں ایک بار پھر جمال کے گھر موجود تھے۔

"یہ سوہنے منڈے تو میں نے کل پھپھی اقبال کے گھر دیکھے تھے۔ آؤ جی آؤ' بیٹھو۔"

جمال کی اماں خوش ہو کر با آواز بلند استقبال کر رہی تھیں، جبکہ ممتاز سمیت ساری بہنوں کے منہ کے زاویے بگڑ گئے تھے۔
"چائے بنا کر بھجوا دو بیٹھک میں۔ ہم ادھر ہی بیٹھ رہے ہیں۔" جمال انہیں لے کر چل پڑا۔
"ہونہہ چائے بناؤ ان پھاپھے کٹنیوں کے لیے۔ تم سے سارے خواب مٹی میں ملا دیے، کیسے شان دار سے سامان کی آرزو کر رہے تھے۔"
چھوٹی والی زیادہ ہی غصے میں تھی۔
"نی باندری۔ (بندریا) تو کیوں بگڑی ہوئی شکل اور بگاڑ رہی ہے۔ کبھی مہمانوں کے آنے پہ خوش بھی ہو جایا کر۔"
ماں نے صرف صورت دیکھی۔ الفاظ سننے کی سعادت نہیں حاصل کر سکیں۔ جو دیکھا اسی پر طبیعت صاف کر دی۔
"ممتاز آپا جا کر حسنات بھائی کو تو نہیں بخشیں گی۔"
جوادی، جمال سے کہہ رہا تھا۔
"حسنات جیسے کمزور مردوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میں تو اپنی گارنٹی دیتا ہوں نہ، خوامخواہ کسی کی سنتا ہوں اور نہ فضول میں رعب جھاڑتا ہوں۔"
"یعنی ایک مثالی شوہر والی خصوصیات آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔"
"اوجی۔ بس کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ شرما کر مسکرایا تھا۔
اتنے میں چھوٹی نے چائے لا کر پٹخ دی۔
"تمیز سے۔ ہاتھوں میں جان نہیں ہے، اٹھاؤ یہ ٹرے اور دوبارہ سے لا کر اچھے طریقے سے رکھو۔"
جمال نے جی خوش کر دیا۔

✡ ✡ ✡

اور جی تو اس شادی پر ان تمام لڑکی والے گھرانوں کا خوش ہوا جہاں بیٹیاں جہیز کی کمی کی وجہ سے بیٹھی رہ جاتی ہیں، کیسی سادگی سے لڑکی رخصت ہوئی، جمال نے کہہ دیا تھا۔

"جو اتنا کچھ اکٹھا کر رکھا ہے، واپس کر دیں یا چھوٹی کے لیے رکھ لیں۔ میرے پاس اللہ کا دیا جو ہے بہت ہے۔"
ممتاز بیگم حزن و ملال کی تصویر بنی کن اکھیوں سے شوہر کو دیکھتی رہیں اور رنجیدہ ہوتی رہیں کہ شوہر صاحب نے ایک بار بھی پیار کی نظر ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔ آخر جوادی کو ترس آ گیا۔
"بھائی کی شادی پر آپ کیوں ٹسوے بہا رہی ہیں؟"
"او نہیں وے۔ بکواس نہ کر۔ میں واقعی اداس ہوں۔"
"بوٹیاں کم ملی ہیں؟"
"آئے ہائے بوٹیوں کی کیا بات۔ یہاں چاول حلق سے نہیں اتر رہے تھے۔ دیکھو نا، میرا گھر والا مجھ سے ناراض ہے۔ میرا تو دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔"
جوادی نے شبلی کو اشارہ کیا۔
"کیا ہوا، بر گد والے جنات نے مارا ہے۔" شبلی نے چہرہ دیکھ کر قیاس فرمایا۔
"نہیں نہیں حادثات نے مارا ہے، بھئی میاں ظالم سنوریا کا رول پلے کرنے پر تلا ہوا ہے۔"
"اوہو! دل کو لگا لیا آپ نے۔" جوادی کی زبانی احوال سن کر شبلی نے افسوس کیا، پھر ایک ترکیب بتائی۔ ممتاز نے زور شور سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
اب ادھر بارات کی رخصتی ہوئی ہے۔ ادھر ممتاز بیگم پٹ سے گری ہیں۔ اور بے ہوش ہو گئی ہیں۔
"آئے ہائے ایھا بھی کو کیا ہوا؟" سب سے پہلے یہی دونوں چلائے تھے۔
"مم۔ ممتاز!" حسنات دیوانہ وار لپکا اور باقی لوگوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔
"ہٹو ہٹو۔ ہوا آنے دو۔" حسنات اپنے کرتے کے دامن کو پنکھے کی طرح ہلاتے ہوئے ہوا دے رہا تھا۔
ممتاز نے ذرا سی آنکھ کھول کر اس کا چہرہ دیکھا اور جوادی شبلی کو سراہا۔ واقعی ترکیب کارگر تھی۔

✡

نمرہ احمد

بیلی راجپوتاں کی ملکہ

رات کا دوسرا پہر دم توڑنے کو تھا' سیاہ آسمان پہ ہر سو تارے بکھرے تھے۔ پورے چاند کی روشنی درختوں کے پتوں کو چمکا رہی تھی۔ وہ بیلی کے جنگل کے درخت تھے' اونچے' مضبوط تناور اور اتنے گھنے کہ چاندنی گھاس کو نہیں چھوپاتی تھی۔

ان اونچے درختوں کے سائے جنگل کے بیچ بنی شاہراہ پر لمبے گر رہے تھے۔ ایسے میں جب جانور بھی خاموش ہو گئے تھے' گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سناٹے کو توڑ رہی تھی۔

دونوں اطراف سے جنگل کے بیچ گھری کچی پکی سڑک پر ایک بگھی دوڑتی آ رہی تھی۔

بگھی ساگوان کی تھی۔ اس پہ دو رویہ ایک مہتابی روشن تھی۔ اور اس میں دو عربی گھوڑے جتے ہوئے تھے' چکنے چکنے سفید سے گھوڑے۔ ان کے منہ پر ریشمی پونیاں اور بدن پہ چھم چھم کرتی جھالر کی دھجیاں تھیں۔

باہری نشست پہ کوچ بان بیٹھا تھا' اس کے ایک ہاتھ میں چابک اور دوسرے میں مرصع لگام تھی۔ وہ لگام تھامے چابک مارتا فکرمندی سے بار بار اوپر آسمان کو دیکھتا تھا۔ جہاں صبح کا ستارہ اسے منزل بتا رہا تھا۔

کوچ بان کے پیچھے بگھی کے اونچے دروازے سختی سے بند تھے۔ جنگل کے درخت اسے دیکھ رہے تھے مگر کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ کوچ بان کی سواری کون ہے یا کوئی ہے بھی کہ نہیں۔

بگھی برق رفتاری سے جنگل کے بیچوں بیچ سڑک پہ بھاگتی جا رہی تھی۔ کوچ بان پریشانی سے گردن اٹھا کر وقفے وقفے سے صبح کے ستارے کو دیکھتا تھا اور ذرا کی ذرا پیچھے بند بگھی پہ نظر ڈالتا' اس کے ہاتھوں میں

مکمل ناول





اضطراب تھا اور انداز میں عجلت۔
"رام ناتھ!" دفعتاً بند بگھی میں سے نسوانی آواز گونجی، ٹھہری ہوئی مطمئن سی مگر تمکنت و بے نیازی سے بھرپور۔
کوچ بان کی لگام پہ گرفت پل بھر کو ڈھیلی پڑ گئی، بگھی کے پہیے قدرے سست ہوئے۔
"جی مالکن؟"
"بیلی کتنا دور ہے ابھی؟"
"بس چند کوس رہ گئے ہیں مالک بھگوان نے چاہا تو صبح ہونے سے قبل ہم حویلی میں ہوں گے۔" کہہ کر اس نے چابک زور سے گھوڑے کو رسید کی۔ پہیے پھر سے تیز ہو گئے۔
"جلدی کرو رام ناتھ۔" نزاکت اور تھکان بھری خوب صورت آواز پھر سے اس کے کانوں میں پڑی وہ "جی مالکن" کہہ کر رفتار بڑھانے لگا۔ بند بگھی میں خاموشی چھا گئی تھی۔ اب وہ نہیں بولے گی، کوچ بان کو علم تھا۔ یہ چند فقرے بھی پورے سفر میں پہلی بار اس کے لبوں سے نکلے تھے۔
کوچ بان رام ناتھ ابھی صبح کے ستارے کو دیکھ کر سمت کا حساب ہی لگا رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل سے چند گھڑ سوار نکل کر سامنے سڑک پر آ گئے۔ ایسے کہ بگھی کا راستہ ایک دم سے رک گیا۔ گھوڑے زور سے ہنہنائے، رام ناتھ نے تیزی سے لگام کھینچ لی۔
اسے لگام کھینچنا ہی تھی، کیونکہ اب وہ ہو چکا تھا، جس کے باعث وہ رات کے وقت جنگل کے سفر سے ڈرتا تھا۔ بیلی کا جنگل رات کے اس پہر ہنڈاروں کی آماجگاہ ہوتا تھا، اسے علم تھا۔ اس نے بے اختیار ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کیا۔
بگھی رکی کھڑی تھی۔ سامنے چار گھوڑے تھے۔ ان میں سے تین کے سوار، گھوڑوں سے اتر کر بگھی کے قریب آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی، دوسرا برچھیت تھا جبکہ تیسرے کے پاس بڑا سا راجپوتی بلم تھا۔
چوتھا گھوڑا قدرے پیچھے کھڑا تھا، اس کا سوار گھوڑے کی پشت پہ بیٹھا تھا۔ وہ نیچے نہیں اترا تھا۔ اس کے منہ پہ سیاہ ڈھاٹا بندھا تھا، بس آنکھیں واضح تھیں، باقی چہرہ ڈھاٹے کے پیچھے گم تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا سا نیزہ تھا جو اس نے گھوڑے کی کنوتیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔
تینوں سوار بگھی کے قریب آئے، ان کے چہرے بھی نقاب میں ڈھکے ہوئے تھے۔ برچھیت کے دوسرے ہاتھ میں دستی تھی۔ یہ چھوٹی سی لکڑی تھی جس کے اوپر دھات کا برا سا پیالہ جڑا تھا اس کے اندر شعلہ جل رہا تھا۔
برچھیت نے دستی کوچ بان کے چہرے کے سامنے لہرائی ایک دم روشنی سے گھبرا کر کوچ بان نے چہرہ پیچھے کیا۔
بندوق بردار آگے بڑھا۔
"نیچے آؤ۔" اس کی بندوق کوچ بان پہ تنی تھی، وہ خاموشی سے نیچے اتر آیا۔
"کہاں سے آ رہے ہو؟"
"امرتسر سے مہاراج!" رام ناتھ نے ہاتھ عاجزانہ انداز میں جوڑے۔
"کہاں جانا ہے؟"
"گاؤں جا رہے ہیں مہاراج۔"
"کون سے گاؤں؟"
"بیلی راجپوتاں مہاراج۔"
"بیلی میں کیا کام ہے؟" بندوق بردار غرایا۔
"اپنا گھر ہے مہاراج' پریوار ہے۔"
"ہوں۔" بندوق بردار نے بگھی پہ نگاہ ڈالی۔ "ساتھ کون ہے؟" رام ناتھ نے تھوک نگلا۔
"میری پتنی ہے مہاراج!"
"امرتسر کیوں گئے تھے؟" وہ سوال در سوال کیے جا رہا تھا۔
"میری پتنی بیمار ہے اسے بڑے ہسپتال دکھانے گیا تھا۔"
برچھیت دستی اونچی کیے بگھی کو بغور دیکھ رہا تھا، یکدم چونک اٹھا۔ "یہ بگھی تو راجپوتوں کی ہے۔" پھر اس نے شعلے کا رخ رام ناتھ کی جانب کیا۔ "تم ٹھاکر رگوناتھ کے ملازم ہو؟"

وہ جو سمجھا تھا کہ گلو خلاصی ہوگئی، گڑبڑا کر رہ گیا "جج... جی مہاراج۔"

"اس کا مطلب ہے یہ گاؤں کا آدمی ہے"، بلم بردار نے آہستہ سے دونوں سے کہا جیسے مطمئن ہو مگر برچھیت مطمئن نہیں تھا۔ "تم اپنی بیوی کو ٹھاکروں کی بگھی میں کیوں لے کر جا رہے ہو؟"

"وہ... مہاراج... دراصل..." رام ناتھ سے بات نہیں بن رہی تھی۔

"دیکھو، سیدھی طرح بتاؤ، ساتھ کون ہے۔ تمہاری بیوی یا ٹھاکروں کا کوئی فرنگی مہمان؟"

چوتھا گھڑسوار اسی طرح نیزہ رکھے سارا ماجرا خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

"مہاراج ... دراصل۔" اور اس سے پہلے کہ وہ بگڑے کو سنوارنے کی سعی کرتا، بگھی کے اندر سے آواز ابھری۔

"رام ناتھ!" فضا میں جلترنگ سے بج اٹھے ہوں۔

کوچ بان نے تھک کر سر جھکا دیا۔ اب جھوٹ سے کام نہیں چلنا تھا۔

"جی مالکن!" اس کی آواز پست تھی۔ مالکن کے لفظ پہ تینوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا پھر بندوق بردار نے گردن موڑ کر گھڑسوار کو اشارہ کیا، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بندوق بردار نے جواباً بندوق مزید تان لی۔

"کون لوگ ہیں رام ناتھ؟ راہ گیر رہیں، یا کمپنی بہادر کے سپاہی؟" آواز اب بھی بے نیاز سی تھی مطمئن اور ٹھہری ہوئی بے فکر سی۔

"راہزن ہیں مالکن"، وہ بگھی کے قریب ہو کر ہولے سے بولا، پھر ان کی جانب مڑا۔ "پردے کی بی بی ہے مہاراج! ہمیں جانے دیجیے ہمارا بیلی پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"پردے کی بی بی رات کے اس پہر تمہارے ساتھ کیوں ہے گاڑی بان؟" بندوق بردار کے لہجے میں طنز در آیا تھا، برچھیت نے بھی قدرے چوکنا ہو کر برچھی کا رخ رام ناتھ کے طرف کر لیا۔

چوتھا سوار اسی طرح خاموشی سے گھوڑے کی لگام تھامے اس کی پیٹھ پہ بیٹھا تھا۔

"مہاراج، ہمارا بیلی پہنچنا..."

"یہ کیا پوچھ رہے ہیں رام ناتھ؟" بند دروازے کے پیچھے سے پھر سے آواز ابھری، جیسے ویرانے میں کسی قدیم مندر کی ساری گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔

"یہ پوچھتے ہیں کہ..." رام ناتھ بگھی کے قریب آیا۔ "کہ اندر فرنگی تو نہیں ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں مالکن، یہ بیلی راجپوتاں کے ڈاکو ہیں۔ صرف فرنگیوں کو لوٹتے ہیں۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔" ڈھکے چھپے الفاظ میں نہایت ادب سے اپنی سواری کو خاموش رہنے کا کہہ کر وہ راہزنوں کی جانب متوجہ ہوا۔

"مائی باپ!" اس نے لکھنؤ کے باسیوں کی طرح عاجزانہ ہاتھ جوڑے۔ "بی بی صاحب کی بولی ہے۔" وہ جانے کون سا حیلہ بہانہ گھڑنے کو تھا کہ وہ آواز پھر سے گونجی۔

"رام ناتھ!" اب کے لہجہ سخت تھا، تحکم اور رعونت سے بھرپور۔ "انہیں بتاؤ کہ تمہاری سواری فرنگی ہی ہے۔"

اس سے پہلے کہ کوچ بان جو اپنے قدموں پہ کلہاڑی مارنے والے الفاظ پہ بھونچکا رہ گیا تھا یا وہ تینوں راہزن جن کے لیے یہ بہادری غیر متوقع تھی، سنبھلتے بگھی کا دروازہ اندر سے کھلا، سب کی نگاہیں ادھر کو اٹھیں۔

دروازہ کھلتا چلا گیا، اس کے پیچھے کم خواب کا بھاری پردہ پڑا تھا، ایک سپید ہاتھ باہر نکلا اور پردہ ہٹا دیا۔ برچھیت کی دستی کا شعلہ ہوا سے دھواں سا جا رہا تھا مگر مدھم روشنی میں بھی اندر کا منظر قدرے واضح تھا۔

وہ اندر نشست پہ بیٹھی تھی یوں کہ رخ سامنے کو تھا اس نے سفید میکسی زیب تن کر رکھی تھی۔ جو پاؤں تک آتی تھی، پاؤں میں نازک سی کولہاپوری جوتی تھی جس کے اوپر سنہرے پکھراج جڑے تھے۔ میکسی کی چوڑی دار تنگ آستینیں کلائیوں تک آتی تھیں، اس کے سپید ہاتھ گود میں دھرے تھے اور ان میں ——— ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں۔ ہاتھوں کے نیچے ایک بڑا سا سفید ہیٹ رکھا تھا۔

لباس کا گھاٹ کھلا تھا گردن راج ہنس کی سی لمبی تھی، جس سے ہیروں کا ایک نازک ہار چپکا ہوا تھا۔ راہزنوں کی نگاہیں بے اختیار اس کے پاؤں سے ہوتی ہوئی چہرے پہ اٹھتی چلی گئیں۔

اٹھی ہوئی ٹھوڑی مغرور سی ناک، موم کی سی گوری جلد، بھرے بھرے ہونٹ جن پہ سرخی لگی تھی، سنہری مائل بھورے بال اس نے اکٹھے کر کے بائیں کندھے پہ ڈال رکھے تھے، جو ان کی نگاہ سے پوشیدہ تھا کہ ان کے سامنے اس کا داہنا رخ تھا اور بڑی بڑی سنہری آنکھیں جن کے گرد بہت گہرے کاجل کا حاشیہ کھنچا تھا، آنکھوں کا رنگ بہت چمکیلا سنہری اور کاجل اتنا گہرا تھا، جیسے سیاہ پانی میں سورج جھلملا رہا ہو۔

رعب حسن تھا یا تمکنت جمال کہ اسلحے پہ ان تینوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شاید ایک لمحے کو ان کو حقیقت پہ خواب کا گمان ہوا تھا، جیسے آسمانوں سے اتر کر کوئی اپسرا ان کے سامنے آگئی ہو۔

''رام ناتھ! ان سے پوچھو کہ رات کے اس پہر مسافروں کو اذیت دینے سے کیا حاصل؟'' ملکے سے گردن ان کی جانب موڑے وہ نخوت سے بولی۔

''گاڑی بان اپنی میم صاحب کو کہو، اپنا زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں۔'' بندوق بردار سنبھل چکا تھا۔

رام ناتھ نے بے چارگی و بے بسی سے بگھی کے کھلے دروازے کو دیکھا۔

وہ اس اعتماد اور تحقیر سے اُن کو دیکھ رہی تھی۔

بندوق بردار کو بات دہرانی پڑی۔

''میم صاحب، اپنا زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں۔''

''تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔'' اس کے اعتماد میں رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔ ''نہ ہی میں بھیک دینے کی قائل ہوں۔''

''ہم بھکاری نہیں ہیں۔'' برچھیت غرایا۔

''بھکاری اور ڈاکو میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ رہی زیور کی بات تو وہ میں تمہارے حوالے نہیں کروں گی۔''

''مادام! آپ کا لہجہ ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم آپ کے ساتھ زبردستی کریں۔''

اس کی سنہری آنکھوں میں ناگواری در آئی، طرح صورت پیشانی پہ شکن ابھری۔

''اگر ملکہ عالیہ سے باغی ہوئے اہل ہند انگریز شاہانہ کی عورتوں کا احترام بھول گئے ہیں تو رام ناتھ! انہیں بتاؤ کہ یہ یہاں محکوم ہیں اور ہم حاکم۔''

''نہ ہم محکوم ہیں اور نہ ہی آپ حاکم۔ آپ غاصب، چور اور عہد شکن ہیں، آپ نے ہمارے ہند عظیم کو لوٹا ہے، ہمارا مال، ہماری عزتیں، ہمارا تخت و تاج لوٹا ہے۔ ہم صرف آپ سے اپنی دولت واپس لے رہے ہیں، عزت اور سلطنت کا حساب پھر کبھی لیں گے۔ زیور اتار کر ہمارے حوالے کر دیں میم صاحب۔''

اس نے بندوق پھر اونچی کی۔ منہ پہ بندھے ڈھاٹے سے محض اس کی آنکھیں واضح تھیں۔ چھوٹی چھوٹی اہل فرنگ کے لیے نفرت سے لبریز آنکھیں۔

چوتھا گھڑ سوار خاموشی سے سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

''میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے بھیک دینے کی عادت ہے نہ لُوٹے جانا پسند ہے۔'' عادتاً وہ گردن سے چپکے ہار پہ انگلی پھیرنے لگی۔ ''فراموش کر دو کہ تم مجھ سے میرا زیور اتروا نا تو کیا، اس بگھی کے چند قدم قریب بھی پھٹک سکتے ہو۔'' اب اس کے لہجے میں حقارت در آئی تھی۔

''ہم یہ دونوں کام کر سکتے ہیں، گولی بھی چلا سکتے ہیں۔''

''فضول۔'' اس دیوی جیسا حسن و تمکنت رکھنے والی لڑکی نے تمسخرانہ سر جھٹکا۔ ''خوش فہمیاں انسان کو بہت ذلیل کرواتی ہیں۔'' کہتے کہتے اس نے یوں ہی ایک ہاتھ سے بال سمیٹ کر دائیں کاندھے پہ ڈال دیے جو ان کے سامنے تھا۔

اس عمل کے دوران جب وہ بھورے سنہری بالوں کو ہاتھ سے سمیٹے دوسرے شانے پہ لا رہی تھی، دستی کا شعلہ اور چاند کی روشنی باہم ہو کر خاص زاویے سے اس پہ پڑی کہ ایک لمحے کو اس کے بالوں میں کچھ زور کا چمکا اتنا کہ چمک سے دور گھوڑے پہ بیٹھے سوار کی آنکھیں چندھیا گئیں اور بے اختیار اس نے روشنی

بچنے کو سر پیچھے کیا۔
بس ایک لمحے کا عمل تھا کہ روشنی غائب ہو گئی اور اس نے دیکھا اس کے لمبے سنہری بالوں میں ایک لڑی تھی، موتیوں کی لڑی جیسے ایک موٹی سی لٹ میں سرے سے سرے تک سفید موتی پرو دیے ہوں اس کے بال کمر تک گرتے تھے مگر موتیوں کی لڑی کاندھے اور کہنی کے وسط میں ختم ہو جاتی تھی۔
"ہم خوش فہم نہیں ہیں میم صاحب! مگر آپ ہمیں مجبور کر رہی ہیں کہ آپ کے ساتھ زبردستی کی جائے۔" بندوق بردار جیسے ضبط کھو کر آگے بڑھا رام ناتھ نے گھبرا کر سامنے آنا چاہا مگر بندوق کی نال نے اس کے قدم روک دیے
اور اس سے پہلے کہ وہ راہزن بگھی تک پہنچتے بیلی کے جنگل نے وہ بھاری آواز سنی۔
"نادر!" سب نے یہاں تک کہ رام ناتھ اور بگھی میں بیٹھی لڑکی نے بھی چونک کر راہزنوں کے عقب میں دیکھا جہاں وہ گھڑسوار اپنے ساتھیوں سے مخاطب تھا۔
"کیا؟" بندوق بردار جس کا نام غالباً "نادر تھا" حیرت سے پلٹا۔
"انہیں جانے دو"
نادر کو جھٹکا لگا۔ "مگر....."
"میں نے کہا نا! انہیں جانے دو۔" اس کی آواز اب دھیمی ہو گئی تھی مگر جنگل کے سناٹے نے محسوس کیا تھا کہ اس میں دباؤ یا غصہ بھی تھا۔
"کیسے جانے دوں؟ زیور دیکھا ہے تم نے؟" نادر تلملا کر بڑبڑایا۔ چند لمحے خاموشی چھا گئی، پھر گھڑسوار ادر بھی مدھم بولا۔
"اسے جانے دو نادر! یہ بیلی راجپوتاں کی ملکہ ہے' اسے جانے دو۔"
پھر وہ رکا نہیں' گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کو ایڑھ لگا دی۔ سفید گھوڑا اپنے سوار کو پیٹھ پہ لادے دوڑتا ہوا جنگل کے بیچ درختوں میں گم ہو گیا۔
ان تینوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا

اور پھر اگلے ہی پل اپنے اپنے گھوڑوں پہ سوار ہو کر انہیں اس کے پیچھے دوڑاتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے' مگر جاتے سمے وہ دیکھ چکی تھی کہ نادر کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں غصے اور ناگواری سے بھری تھیں۔

رام ناتھ نے گہرا سانس لیا اور اسے دیکھا' وہ جیسے کسی سوچ میں گم دُھول کے غبار کو نیچے بیٹھتا دیکھ رہی تھی' جو گھوڑوں کے قدموں نے اڑایا تھا۔

"اگر انہیں علم نہ ہوتا کہ آپ فرنگی ہیں تو وہ ہمیں نہ روکتے مالکن!" نگاہیں جھکائے رام ناتھ نے ادب سے اسے اس کی "غلطی" کا احساس دلایا۔ وہ کچھ سوچتی دور جنگل میں دیکھتی رہی۔

"رام ناتھ!" وہ جو مڑ کر آگے نشست سنبھالنے جا رہا تھا' وہ پکار پہ واپس پلٹا۔

"جی مالکن!"

"یہ لوگ کون تھے؟"

"راہزن تھے' مالکن!" اس نے بے اختیار نگاہیں چرائیں۔

"بے شک' مگر تھے کون؟"

"میں کچھ نہیں جانوں مالکن!" کوچ بان نے ہاتھ جوڑے۔

"بے شک' مگر وہ جو گھوڑے پہ تھا اس کا نام کیا تھا؟" وہ اب بھی پرسکون تھی۔

"میں کچھ نہیں جانوں۔"

وہ تلخی سے مسکرائی۔ "جانے دو رام ناتھ جیسے تمہیں واقعی علم نہیں۔" اور سکون سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

وہ سر جھکائے ہاتھ جوڑے واپس جانے لگا جب اسے اپنے عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔

"میں جانتی ہوں' وہ کون تھا۔ رام ناتھ۔" وہ حیرت زدہ سا پلٹا۔ اندھیرے میں مدھم چاندنی میں بھی وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ جس پہ وہی تلخ مسکراہٹ تھی۔

"کون تھا مالکن؟"

"وہ بدر غازان تھا' میں جانتی ہوں۔ اس واقعہ کی خبر گاؤں میں کسی کو نہ ہو۔ اب گاڑی چلاؤ۔ میں صبح سے قبل حویلی پہنچنا چاہتی ہوں۔" پردہ آگے ڈال گیا' اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔

رام ناتھ حیرت چھپاتا' سر ہلا کر حکم کی تعمیل کرتا آگے اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

بگھی ایک دفعہ پھر خستہ حال سڑک پر دوڑنے لگی اور پھر جب سڑک ختم ہو کر کچا راستہ شروع ہو گیا' اس لمحے پو پھٹنے لگی۔

صبح کی پہلی کرنیں بیلی راجپوتاں کے کھیتوں پہ گرنے لگیں تو بگھی میں جُتے عربی گھوڑے بڑے پھاٹک کے سامنے رکے۔ وہاں مجمع سا لگا تھا۔

کوچ بان رام ناتھ پھرتی سے نیچے اترا' سرعت سے سیڑھی نکال کر دروازے سے لگائی اور دروازہ کھولا۔ پردہ اندر سے اس نے خود ہٹایا اور پاؤں باہر نکال کر سیڑھی پہ رکھا۔ اس کی جوتی کے سنہرے پکھراج روشنی میں چمکنے لگے۔ سفید ہیٹ اس نے سر پر رکھ لیا تھا۔

کوچ بان ادب سے پیچھے ہٹ گیا' وہ نزاکت سے زینے اترتی نیچے آئی جیسے پانی پہ چل رہی ہو اور سامنے کھڑے دونوں افراد کو اپنی جانب دیکھتے پایا۔

ان میں سے ایک وردی میں ملبوس گاؤں کا سب انسپکٹر تھا اور دوسرا سوٹڈ بوٹڈ ڈھلتی عمر کا فربہی مائل کمپنی بہادر کا کوئی افسر' فرنگی افسر نے اپنا ہیٹ اتار کر جھک کر "گڈ مارننگ" بولا اس کی — تیوری چڑھ گئی۔ سب انسپکٹر نے بھانپ کر' کچھ کہنے کو لب کھولے مگر صاحب بہادر شروع ہو چکا تھا۔

"آپ یقیناً" انگلستان سے آئی ہیں۔ پہلی دفعہ آپ کو ادھر دیکھا ہے۔ میرا نام جان کارلس ہے۔ میں ضلع کا نیا ڈپٹی کلیکٹر ہوں۔ مجھے یہاں تعینات ہوئے آج تیسرا روز ہے۔"

"مایا راج' یہ لیڈی..." سب انسپکٹر منمنایا مگر جان کارلس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "مجھے بات کرنے دو تھانے دار۔"

"یہ مجمع کیوں لگا ہے ادھر؟" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی میکسی پہلو سے اٹھائے بے زار سی کھڑی تھی' اس کا اشارہ ارد گرد حویلی کے پھاٹک کے ساتھ کھڑے

قوم کی طرف تھا۔

”اومائی لیڈی‘ آپ کی اردو کتنی صاف ہے۔“

”مجھے فارسی کی شدید طلب ہے مسٹر کارلس! مگر یہ مجمع کیوں ادھر لگا ہے؟“

”کل راجپوتوں کی حویلی میں حادثہ ہو گیا تھا۔“

”حادثہ؟ کیسا حادثہ؟“ وہ چونکی

”آگ لگ گئی تھی مہمان خانے میں۔“

”کوئی نقصان تو نہیں ہوا ڈپٹی سی صاحب۔“

”اور تو نہیں بس ٹھاکروں کا لڑکا موقع پہ ہی جل کے مر گیا۔“

”کون؟ ٹھاکر رگوناتھ کا بیٹا گوپال؟“

”نہیں‘ وہ دوسرا لڑکا جو رگوناتھ کا بھتیجا تھا۔“

”شیکھر۔“ وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ شیکھر.....شیکھر مر گیا؟“

”جی وہی ٹھاکر شیکھر راج۔“ وہ مزید کچھ سنے بغیر تیزی سے پھاٹک پار کر کے اندر چلی گئی۔ جان کارلس گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”یہ عورت کون ہے؟“ اب کے اس نے بالآخر سب انسپکٹر کو زحمت دی جو مسلسل کچھ کہنے کے لیے لب کھول اور بند کر رہا تھا‘ کارلس کے سوال پر گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ”میں آپ کو یہ ہی بتانے والا تھا مایا راج۔“ یہ لیڈی شیکھر ہے‘ ٹھاکر شیکھر راج کی بیوی۔“

کارلس چونکا۔ ”یہ مایا فرینڈس ہے؟“

سب انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”جی مایا راج!“ کارلس پھر سے گردن موڑے اسے دیکھنے لگا‘ جو تیزی سے دوڑتی حویلی کے اندر جا رہی تھی۔ اس کا ہیٹ راستے میں مٹی پہ گر گیا تھا۔



یہ 1939ء کی ایک تاریک رات تھی۔ ہند عظیم اس وقت تاج برطانیہ کے تحت تھا۔ وہ تاج برطانیہ جس پہ سورج غروب نہیں ہوتا تھا‘ مگر ہندوستان پہ تاریک [illegible] ہی چاندنی میں ڈوبا اندھیرا ”بیلی راجپوتاں“ پہ بھی اتر آتا تھا۔

بیلی راجپوتاں ہندوستان کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا‘ انگریز سرکار نے کئی برس ہوئے اس کا نام بدل کر کچھ اور کر دیا تھا۔ مگر گاؤں والے آج بھی اسے اس کے برسوں پرانے نام سے ہی پکارتے تھے۔ جس میں یہاں کے سر کردہ خاندان کی عظمت کا ذکر تھا۔ ہندو راجپوتوں کے خاندان کا‘ جو کئی برس سے اس گاؤں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ بیلی راجپوتاں دراصل اس ریاست کا حصہ تھا‘ جو کسی زمانے میں اس راجپوت خاندان کی ملکیت تھی اور وہ یہاں کے حقیقتاً ”بادشاہ تھے“ پھر بعد میں ریاستیں ٹوٹ گئیں تو یہ محض ایک گاؤں رہ گیا‘ مگر راجپوت آج بھی یہاں کے مہاراجے تھے اور ان کی عورتیں خود کو مہارانیاں کہلوانا پسند کرتی تھیں۔

گاؤں کی آبادی میں ہندوؤں کا تناسب مسلمانوں سے چند شرح فیصد زیادہ تھا‘ اور سوائے ایک مسلم خاندان کے (جس کی مضبوط حیثیت کی وجہ دولت کی کثرت اور ملکی سیاست میں اثر و رسوخ کے سوا کوئی نہ تھی۔) ہندو راجپوت پورے گاؤں پہ چھائے ہوئے تھے۔ گاؤں کے وسط میں راجپوتوں کی عظیم الشان حویلی تھی‘ جس کے میناروں کے کنگرے دور سے دکھائی دیتے تھے‘ مگر ہماری اس برسوں پرانی داستان کا مرکز راجپوتوں کی حویلی نہیں جو اس وقت سوگ میں ڈوبی تھی۔ بلکہ اس سے کہیں دور وہ کچا راستہ ہے جو راجپوتوں کی زمینوں سے ہو کر مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی جانب جاتا تھا۔

رات دوسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی‘ گاؤں کے مکین جانے کب سے اپنے اپنے گھروں میں دبکے سو رہے تھے۔ سرما دم توڑ رہا تھا‘ بہار کی آمد تھی۔ فضا میں خنکی ابھی تک موجود تھی۔ اونچے بوڑھے درخت خاموشی سے شاخوں کا بوجھ لیے سو رہے تھے‘ کبھی کبھی ہوا کا کوئی جھونکا تیزی سے چلتے ہوئے پتوں کو جھنجوڑ

دیتا اور ان کی سنسناہٹ سے اندھیرے میں ڈوبا گاؤں ہڑبڑا سا جاتا' مگر پھر چند لمحوں بعد وہی پرسکون خاموشی چھا جاتی اور آسمان پہ بکھرے تارے اس کے گواہ بن جاتے۔ ایسے میں جب پورا بیلی راجپوتاں سو رہا تھا' مسلمانوں کے پرانے قبرستان میں کوئی جاگ رہا تھا۔

یہ قبرستان آبادی سے ہٹ کر گاؤں کے آخری سرے پہ واقع تھا۔ یہ ایک دفعہ مکمل طور پہ آباد ہونے کے بعد کئی برس ہوئے اب تو کھنڈر بھی بن چکا تھا۔ اب اس قبرستان میں کوئی مردے نہیں دفناتا تھا' بلکہ اس کی جگہ ایک نئے قبرستان نے لے لی تھی' جو گاؤں کے دوسری طرف تھا۔

پرانے قبرستان کی چار دیواری کچی اور چھوٹی تھی۔ داخلے کے لیے نصب لکڑی کا خستہ حال' قدیم پھاٹک رات کے اس پہر کھلا پڑا تھا۔

چار دیواری کے ایک کونے میں برگد کا گھنا بوڑھا درخت جھکا جھکا سا کھڑا تھا۔ اس کی چھایا تلے کوئی سایہ سا نظر آرہا تھا۔

اس کی درخت کی جانب کمر تھی' اندھیرے میں وہ کوئی ہیولا سا دکھتا تھا۔ جس نے پاؤں تک آتا سیاہ چغہ پہن رکھا تھا' سر پہ چغے کے ساتھ ننھی ٹوپی (hood) ایسے لے رکھی تھی کہ چہرہ واضح نہ تھا۔

وہ سایہ رکوع کے بل جھکا' مسلسل ایک ہی جگہ پہ ہاتھ میں پکڑی کدال مار رہا تھا۔ وہاں دو قبروں کے درمیان ایک گڑھا سا کھد گیا تھا اور چغہ پوش کی کدال اس گڑھے کو مزید گہرا کر رہی تھی۔

دفعتاً" گھوڑے کے بھاگتے ٹاپوں کی آواز نے بیلی راجپوتاں کی خاموش فضا کو لرزا دیا۔ چغہ پوش نے چونک کر کمر سیدھی کی۔ آواز دور کھیتوں سے آرہی تھی۔ اس نے جلدی سے کدال اپنے لبادے میں چھپائی اور بھاگ کر درخت کے تنے کی آڑ لے لی۔ دوڑتے قدموں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی' چغہ پوش نے سر اٹھا کر چھوٹی سی چار دیواری کے پار جھانکا۔ اسی لمحے دور کھیتوں سے دو گھوڑے برق رفتاری سے بھاگتے ہوئے آئے اور دیوار کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ شاید کوئی مسافر تھے۔

چغہ پوش نے آہستہ سے کھڑے ہو کر زمین پہ رکھی کدال اٹھائی اور واپس آکر گڑھے کے کنارے پہ لگے مٹی کے ڈھیر کو اندر ڈالنا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے زمین برابر کردی' پھر کدال کو اسی طرح لبادے میں چھپائے دھیرے دھیرے چلتے اس نے باہر کی راہ لی۔

پھاٹک پار کر کے اس نے آہستگی سے اسے بند کیا' چغے کی ہڈ درست کی اور ادھر ادھر محتاط طریقے سے دیکھتے اپنے قدم اس کچے دھول مٹی میں گم ہوتے راستے کی جانب بڑھا دیے۔

چند لمحے بعد اس کا سیاہ وجود بیلی راجپوتاں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔



وہ اس قد آور آئینے کے سامنے کھڑی بے تاثر نگاہوں سے اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔

دراز قد' شانوں پہ گرتے سنہری بال' ان کے بیچ پھسلتی موتیوں کی لڑی اور آنکھوں میں گہرا کاجل' آج اس نے کوئی زیور نہیں پہن رکھا تھا۔ بس سادہ سی سفید ساڑھی میں ملبوس تھی جس کا پلو فرش کو چھو رہا تھا۔

وہ آئینے سے ایک طرف ہٹ گئی۔ سامنے والی دیوار پہ ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔

وہ ساٹھ ستر کے سن کا بوڑھا' مگر بارعب چہرہ تھا' بڑی بڑی مونچھیں' تمکنت سے چمکتی آنکھیں' فہم و فراست سے لبریز نگاہیں' پگڑی میں موتیوں کی لڑیاں تھیں' ماتھے سے عین اوپر پگڑی میں چھوٹا سا مور بنا تھا' جس کے ساتھ ایک بڑا سا ہیرا جڑا تھا' اس ہیرے سے پھوٹتی شعاعیں اس چہرے کے رعب داب میں اضافہ کر رہی تھیں' نیچے ایک کونے میں لکھا تھا۔

"شبیہہ حقیقی' مہاراجہ بلدیو سنگھ۔"

وہ اب دوسری دیوار پہ موجود بڑے سے رنگین پورٹریٹ کے سامنے آگئی جو ایک سیاہ سفید تصویر کو سامنے رکھ کر کسی ماہر مصور نے بنایا تھا۔ یہ تصویر اس

کی اور شیکھر کی شادی پہ تین ماہ قبل لی گئی تھی۔
تصویر میں اس نے سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سنگھار کے نام پہ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا یا لبوں پہ سرخ رنگ کی لپ اسٹک' دائیں کلائی میں سونے کی چوڑیاں اور بائیں میں ہیرے کے دو جڑاؤ کنگن تھے۔
اس کے پہلو میں سیاہ تھری پیس' سفید شرٹ اور سرخ bow میں ملبوس سینتیس سالہ شیکھر مسکرا رہا تھا۔ وہ سانولی رنگت اور معمولی نقوش کا حامل معمولی صورت شخص تھا۔
اس کی بے تاثر نگاہیں شیکھر سے ہٹ کر اپنی سرخ ساڑھی پہ پھیلتی چلی گئیں۔ یہ ساڑھی اس نے شادی کے بعد پھر کب پہنی تھی؟ ہاں ڈھائی ماہ قبل اپنی سالگرہ کی شام میں۔
اس نے اپنی سنہری آنکھیں موند لیں' ذہن کے پردوں پہ ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔
دہلی میں موجود شیکھر کی اس عالی شان کوٹھی پہ سالگرہ کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بڑے سے لان میں برقی قمقموں اور روشنیوں سے چراغاں کیا گیا تھا۔ مہمان گھاس پہ بچھی کرسیوں سے اٹھ کر لان کے وسط میں رکھی گئی گول میز کے اردگرد جمع ہو چکے تھے۔
شیکھر ان کے ہمراہ تھا۔ اس کی منتظر نگاہیں بار بار برآمدے کے اس پار گھر کے داخلی دروازے کی سمت اٹھ رہی تھیں۔ کچھ مہمان کلائیوں پہ بندھی گھڑیاں دیکھنے لگے تھے۔ ان سب کو شیکھر کی بیوی کا انتظار تھا جس کے اعزاز میں رؤساء و امراء کی یہ محفل سجائی گئی تھی۔
دفعتاً" برآمدے کا دروازہ کھلا' سرخ ساڑھی کی ایک جھلک نظر آئی۔ تمام مہمانوں کی نگاہیں اس طرف اٹھیں' پورے لان میں سناٹا چھا گیا۔
دروازے کا پٹ دھکیلتی سرخ ساڑھی میں ملبوس دراز قد سیدھے اور سنہرے بالوں والی لڑکی باہر آئی۔ وہ کسی قدیم مندر میں پوجا کرانے والی حسن کی دیوی
وہ بہت نزاکت و تمکنت سے چلتی ہوئی برآمدے کے ستون تک آئی۔ شیکھر مسکرا کر آگے بڑھا۔ برآمدے کے آگے تین چھوٹے سے زینے بنے تھے' اوپر وہ ان کے آغاز پہ کھڑی تھی۔ شیکھر نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا' اس نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ بڑھا ہوا ہاتھ تھاما اور اسی نزاکت سے ایک ایک قدم نیچے رکھتی زینہ اتر کر لان کی گھاس پہ آ گئی۔ سرخ ساڑھی کا بے حد لمبا پلو اس کے پیچھے زینوں پہ پھسلتا ہوا گھاس پہ آن گرا۔
شیکھر ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامے بایاں بازو اس کے شانوں کے گرد حمائل کیے اسے ساتھ لے کر چلتا میز تک آیا۔
"مائی وائف' مایا فرینڈز" کیک کٹنے کے بعد وہ مایا کا ہاتھ تھامے اپنے کسی قریبی عزیز سے اس کا تعارف کرا رہا تھا اور مایا مسکراتے ہوئے شستہ انگریزی اور پھر مقامی زبان میں رسمی کلمات ادا کر رہی تھی۔
پوری تقریب میں ایک فرد سے دوسرے فرد تک جاتے بہت سے لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بھانت بھانت کی سرگوشیاں اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔
"تو یہ ہے ٹھاکر شیکھر کی انگریز بیوی جس سے اس نے انگلستان میں شادی کی تھی؟"
"ہاں' سنا ہے اس کا تعلق برطانیہ کے شاہی خاندان سے ہے' کیا واقعی؟"
"ہوگا' تب ہی تو شیکھر نے اس سے شادی کی ہے۔"
"مگر اردو اور ہندی تو اچھی بول لیتی ہے' بہت جلدی سیکھ لی۔"
"نہیں' میں نے سنا ہے اس کی نینی ہندوستانی تھی۔ اسی نے سکھائی ہے اسے۔"
وہ بہت اعتماد سے مسکراتے ہوئے شیکھر کے پہلو میں مہمانوں سے تعارف حاصل کر رہی تھی جن میں زیادہ تعداد دہلی کے امراء و رؤساء کی تھی' چند برطانوی بھی الگ سے کھڑے تھے۔

مایا نے آنکھیں کھول دیں۔
دہلی کی روشنیوں میں ڈوبی تقریب غائب ہو گئی۔ وہ بیلی راجپوتاں میں راجپوتوں کی حویلی کی بالائی منزل کے کمرے میں اپنے پورٹریٹ کے سامنے کھڑی تھی۔
اس نے بے اختیار موتیوں کی لڑی پہ انگلی پھیری' وہاں موتی تصویر کی نسبت کم تھے اور آخر میں گرہ سی لگی تھی۔ مایا کی انگلی گرہ پہ آکر تھم گئی۔ ایک مبہم مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔
"احمق..... گدھا۔" اس نے مسکرا کر سر جھٹکا جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اسی پل دروازہ بجا۔ اس نے ہاتھ سے لڑی چھوڑ دی۔
"کون؟"
"مایا دیوی' وکیل صاحب نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں' ٹھاکر صاحب نے آپ کو بلا بھیجا ہے۔"
"ہوں۔ ان کو بولو میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔" بے تاثر لہجے میں کہہ کر وہ بالوں میں پھر سے کنگھا پھیرنے لگی۔ نگاہیں آئینے میں موجود اپنے دلکش چہرے پہ جمی تھیں۔ بہت سپاٹ برف سا چہرہ تھا وہ۔
پھر بہت سے لمحے سرک گئے تو اس نے ساڑھی کا پلو ہاتھ سے چھوڑا اور باہر نکل آئی۔
سیڑھیوں کے آغاز پہ کھڑے ہو کر اس نے نیچے جھانکا۔ نیچے ہال کمرے میں لکڑی کے قیمتی صوفوں پہ سیاہ کوٹ میں ملبوس وکیل صاحب اور تایا رگھو ناتھ بیٹھے تھے۔
آہٹ تھی یا اس کی موجودگی کا کوئی فسوں' ان دونوں نے چونک کر سر اٹھا کے اسے دیکھا اور پھر بے اختیار کھڑے ہو گئے۔
وہ ہاتھ ریلنگ پہ رکھے پلکیں جھکائے ایک ایک زینہ نیچے اترنے لگی۔ سفید ساڑھی کا پلو چند زینے اوپر سے اس کے پیچھے پھسلتا آرہا تھا۔ لمبی ایڑی کی ٹک ٹک ایک ردھم سے خاموش فضا میں گونج رہی تھی اور وکیل صاحب دم سادھے اسے سیڑھیوں سے نیچے اترتے دیکھ رہے تھے۔
اس کے ملکوتی حسن اور سحر انگیز شخصیت کے جتنے قصے انہوں نے سنے تھے' بیلی راجپوتاں کی وہ مہارانی اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔
"گڈ مارننگ جنٹل مین۔" نہایت اعتماد سے گردن اٹھائے وہ ان کے مقابل مخملیں صوفے پہ بیٹھ گئی۔ وہ دیوان خانہ گاؤں کے ماحول کے برعکس فرنگی طرز سے آراستہ تھا۔
"بیٹھیے۔" ٹانگ پہ ٹانگ رکھے' کہنی صوفے کے بازو پہ ٹکائے وہ اسی پر تمکنت انداز میں بولی تو وکیل صاحب جیسے ہوش میں آکر بیٹھ گئے۔ تایا رگھو ناتھ پہلے ہی بیٹھ چکے تھے' وکیل صاحب کو "بیٹھیے" کہنا ان کا فرض تھا کہ یہ حویلی ان کی تھی' مگر شیکھر کی اس مہارانی کی موجودگی میں وہ ہمیشہ ایسے ہی کنفیوژڈ ہو جاتے تھے۔
"آپ کاغذات لے آئے وکیل صاحب؟" وہ سیدھا ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
"جی..... جی لیڈی شیکھر..... میں۔"
"لیڈی فرنینڈس" سنہری بال کندھے سے پیچھے کرتے اس نے تصحیح کی۔
"جی لیڈی فرنینڈس" وکیل صاحب جلدی سے بولے' پھر ایک نظر تایا رگھو ناتھ پہ ڈالی اور دوبارہ مایا کو دیکھا۔ وہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں اتنی مقناطیسیت اور کشش تھی کہ وکیل صاحب نگاہیں جھکا کر تیزی سے بریف کیس کھول کر کاغذات نکالنے لگے۔
"شروع کریں؟" ایک فائل کا مطلوبہ صفحہ کھول کر انہوں نے ایک سوالیہ نگاہ مایا پہ ڈالی' جس نے اپنے مخصوص انداز میں سر کو جنبش دی۔ وہ فوراً" سر جھکائے دوبارہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی غلطی دہرائے بغیر پیشہ ورانہ انداز میں پڑھنے لگے۔
"یہ وصیت ٹھاکر شیکھر راج نے اپنی موت سے چند ہفتے قبل لکھوائی تھی۔ اس کے مطابق انہوں نے اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد و اثاثوں کا نگران اور وارث اپنی بیوی مایا لیڈی مایا فرنینڈس کو قرار دیا ہے۔"

تایا رگھو ناتھ کے چہرے پہ ناپسندیدگی بکھر گئی۔

"جبکہ اس حویلی میں موجود اپنا پچاس فیصد حصہ بھی انہوں نے لیڈی مایا کے نام کردیا ہے' باقی پچاس فیصد حصہ پہلے سے ہی ٹھاکر شیکھر کے تایا ٹھاکر رگھو ناتھ کے نام ہے۔"

تایا رگھو ناتھ نے اب کے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"ہوں' اور کچھ؟" وہ اسی طرح ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھی عام سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"جی نہیں۔" وکیل صاحب نے فائل میز پہ رکھ دی۔

ہال کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ مایا کے چہرے پہ بلا کا اطمینان و سکون تھا' جیسے اس نے تمام فیصلے کرلیے ہوں۔

"مجھے شیکھر کی جائیداد نہیں چاہیے۔" اسی بے تاثر لہجے میں چند لمحے بعد وہ بولی تو دونوں اشخاص بری طرح چونکے۔

"میں حویلی میں اپنے نصف حصے کو ٹھاکر رگھو ناتھ کے نام کرنے پہ تیار ہوں' ٹھاکر صاحب آپ کاغذی کارروائی کرلیں جبکہ باقی جائیداد......" وہ سانس لینے کو رکی' ٹھاکر رگھو ناتھ دم سادھے اس کی بات کی تکمیل کے منتظر تھے۔ "باقی جائیداد میں کسی فلاحی ادارے کے نام کرنا چاہتی ہوں' شیکھر کی بہت خواہش تھی کہ ہم دونوں مل کر کوئی ٹرسٹ یا خیراتی ادارہ قائم کریں۔ شیکھر کو تو زندگی نے مہلت نہیں دی۔"

سنہری آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

"مگر میں اس کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں۔ ٹھاکر صاحب مجھے امید ہے کہ آپ یہ جائیداد بکوانے میں میری مدد کریں گے' شکریہ۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی' ایک آنسو ٹوٹ کر چہرے پہ پھسلتا گیا۔ "آپ بیٹھیے' میں چلتی ہوں۔"

ساڑھی کا پلو دائیں ہاتھ میں سنبھالتی وہ ان کے سامنے سے گزر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی' ریلنگ پہ ہاتھ دھرے پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ایک ثانیے کو اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"میں امید کرتی ہوں یہ سب کچھ جلد ہوجائے گا۔ میں اس مہینے واپس انگلستان جانا چاہتی ہوں۔ اب اس ملک میں شیکھر کی یادوں کے ساتھ رہنا میرے لیے کٹھن ہوگیا ہے۔ امید ہے آپ میری ذہنی حالت سمجھ سکیں گے۔"

پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ ان دونوں کی نگاہوں نے اس کا اوپر تک تعاقب کیا' یہاں تک کہ وہ اپنے کمرے کے دروازے کے پیچھے غائب ہوگئی۔

"شیکھر اور فلاحی ادارہ......" ٹھاکر رگھو ناتھ نے گہرا سانس بھرا۔ "تھا تو میرا بھتیجا مگر اس سے یہ توقع ناممکن سی لگتی ہے۔ وہ عیاش سا شخص تھا۔ پتا نہیں۔" انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

وکیل صاحب خاموشی سے کاغذات سمیٹنے لگے' جیسے ٹھاکر کی بے زاری کی وجہ سمجھ رہے ہوں۔

"بے چاری مایا۔" فائلیں بریف کیس میں رکھتے ہوئے انہوں نے ترحم سے سوچا۔ "اتنی خوب صورت عورت' محبت کی شادی اور محبت بھی ایسی کہ برطانوی شہزادی نے محل چھوڑ دیے' اس قبول صورت ٹھاکر شیکھر کے پیچھے اور بھرپور بھری جوانی میں بیوگی اور دل ایسا خالص کہ اتنی بڑی جائیداد سے ایک ٹکا لینے کا لالچ نہیں۔ اتنی آسانی سے سب چھوڑ دیا' مگر جانے یہ ٹھاکر اس کو اتنی ہی آسانی سے چھوڑیں گے یا نہیں' بے چاری انگریز لڑکی کدھر پھنس گئی ہے ان راجپوتوں میں۔"

ٹھاکر رگھو ناتھ اور وکیل صاحب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

رات کی کالی چادر میں غبار کی تہہ لگی تھی۔ شام میں ہلکے ہلکے جھکڑ چلے تھے اور پھر ہوا ساکن ہوگئی تھی۔ مگر معمولی سا گرد اب بھی فضا میں ٹھہرا تھا۔

آج مسلمانوں کا کھنڈر ہوا پرانا قبرستان بھی معمول سے زیادہ گرد آلود تھا۔ برگد کا بوڑھا درخت دکھ سے سارے میں چھائی ویرانی دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر رسیدہ کمزور شاخیں زمین کی جانب جھکی جھکی سی تھیں

جہاں موجود ایک سیاہ لبادے میں ملبوس ذی نفس کی کدال کچی زمین کھود رہی تھی۔

مٹی اڑ کر اوپر آتی‘ چغہ پوش کا لباس مٹی سے اَٹ چکا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ تیزی سے کام کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو رک کر اس نے کمر سیدھی کی اور چہرے پہ آیا پسینہ صاف کیا۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا‘ انداز میں تھکان سی تھی۔ برگد کا بوڑھا درخت گواہ تھا کہ اس کا جسم پچھلے کئی گھنٹوں سے یہ مشقت اٹھا رہا تھا۔ اب شاید اسے تھکاوٹ ہونے لگی تھی۔

چند لمحے سستا کر اس نے پھر سے جھک کر کھودنا شروع کر دیا۔ تین‘ چار دفعہ کدال ہی ماری تھی کہ دور کسی کے بولنے کی آواز سناٹے کو چیرنے لگی۔

چغہ پوش نے چونک کر سر اٹھایا‘ قبرستان کے کھلے پھاٹک کے اس پار دو اشخاص باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے قدموں تلے کچے راستے کی دھول اٹھ رہی تھی۔ ایک ان میں کرم دین تھا اور دوسرا اس کا چچا زاد حاجی بشیر۔

کریم دین نفی میں سر ہلاتے ہوئے کسی بات پر بحث کر رہا تھا کہ یکایک کھلا پھاٹک دیکھ کر ٹھٹکا۔

"حاجی! اتنی رات گئے پھاٹک کیوں کھلا ہے۔"

بات حیرت کی تھی‘ قبرستان کا یہ پھاٹک عموماً" بند ہی ہوتا تھا اور اس پر ایک موٹی زنجیر اور تالا چڑھا ہوتا تھا۔

"معلوم نہیں۔" حاجی بشیر ہچکچایا۔ "گاؤں والے کہتے ہیں کہ عرصہ ہوا یہاں سایہ ہو گیا ہے‘ رات کو ادھر سے آوازیں آتی ہیں۔" جانے کتنا سچ ہے‘ کتنا جھوٹ تالا تو عرصہ ہوا ٹوٹ چکا ہے۔

دونوں کھلے پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے۔

"چل او حاجی! چل کر ایک دفعہ دیکھیں تو اندر ہے کیا؟"

"رہنے دو کرم دین!" حاجی بشیر بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔

"ڈرتے کیوں ہو؟ گاؤں والے تو پر کا پرندہ بنا ڈالتے ہیں‘ ایک دفعہ دیکھیے تو سہی کہ ہے کیا۔ آواز تو ابھی مجھے بھی آ رہی ہے۔"

کرم دین نے پہل کی اور پھاٹک پار کیا۔ حاجی بشیر ہچکچاتا ہوا چند قدم پیچھے تھا۔

سامنے چند قبروں کے ایک طرف بڑا سا گڑھا تھا اور اردگرد مٹی کی ڈھیریاں تھیں۔

"اس گڑھے میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" کرم دین سوچتا بڑبڑاتا قریب آیا‘ رات کی وحشت یا قبرستان کی ہیبت اسے تھوڑا تھوڑا خوف محسوس ہوا‘ جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے گڑھے کے قریب آئے۔

کرم دین نے آیتہ الکرسی پڑھتے ہوئے اندر جھانکا۔

گڑھا تاریک اور خاموش تھا‘ بہت گہرا نہیں تھا‘ اندر ایک سیاہ سی گٹھڑی پڑی تھی‘ جیسے کپڑے کی گٹھڑی ہو۔

اس سے پہلے کہ کوئی جھکتا‘ گٹھڑی آن کی آن میں کھڑی ہو گئی اور دھول کا ایک طوفان ان کی طرف آیا۔

گرد ان کی آنکھوں میں پڑی اور وہ بے اختیار آنکھیں ملتے چیختے چلاتے پیچھے ہٹے۔ چغہ پوش نے انہیں دھکیلا اور جست لگا کر پھاٹک پار کر گیا۔

کچھ دیر بعد ہر رات کی طرح چھائے اندھیرے نے اسے نگل لیا۔



"مایا دیوی!" روپا اسے تلاش کرتی زنان خانے کے دالان تک آئی تھی۔ حویلی کے پچھواڑے اونچے ستونوں کا برآمدہ تھا‘ برآمدے کے آگے تین سیڑھیاں بنی تھیں‘ وہ سب سے اونچی سیڑھی پہ بیٹھی سامنے فضا میں جانے کیا کھوج رہی تھی‘ روپا کی آواز پہ آہستہ سے سر اٹھایا۔

وہ بہت اطمینان اور تحمل سے ہر کام کرتی تھی‘ شاید ہی کبھی روپا نے اسے چونکتے دیکھا ہو۔

"مایا دیوی! بڑے ٹھاکر آپ کو ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں‘ داروغہ صاحب آئے ہیں جی۔"

وہ ایک لفظ کہے بنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آج بھی سادہ سفید ساڑھی پہن رکھی تھی‘ بال فرانسیسی

طرز کی چوٹی میں مقید تھے' چوٹی کے بلوں میں کہیں کہیں سے موتی جھلک رہے تھے۔ پاؤں میں پتلی اونچی ایڑی والی نازک سی جوتی تھی جس پہ سفید نگینے جڑے تھے۔

دیوان خانے میں اس روز جہاں وکیل صاحب بیٹھے تھے' آج ادھر وردی میں ملبوس تھانے دار تھا' اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ مایا کو دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔

تایا رگھوناتھ سامنے اسی صوفے پہ بیٹھے تھے' حقے کی نے منہ سے لگا رکھی تھی اور مسلسل گڑگڑا رہے تھے۔

سامنے کرسیوں پہ تھانے دار کا عملہ بیٹھا تھا' ان کے پاس قلم اور کاغذ تھے' غالباً" بیانات قلمبند کرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

وہ سب کو جیسے نظر انداز کرتی اسی اعتماد اور بے نیازی سے چلتی تھانے دار کے مقابل صوفے پہ بیٹھ گئی۔ ٹانگ پہ ٹانگ یوں چڑھائی کہ جوتی کی نوک اوپر تھی' شاید یہ مقابل کو بتانے کا اشارہ تھا کہ وہ اس کی جوتی کی نوک پہ ہے۔

کمرے کے ایک کونے میں ایک عمر رسیدہ دیہاتی بیٹھا خاموشی سے سب کو دیکھ رہا تھا' چہرے مہرے سے وہ تھانے کے عملے کا حصہ ہرگز نہ لگتا تھا' جانے کون تھا۔

"میم صاحب! آپ کو زحمت اس لیے دی کہ جیسا کہ آپ جانتی ہیں۔" تھانے دار بیٹھ گیا تھا۔ "ٹھاکر شیکھر راج کی موت آگ لگنے سے ہوئی ہے۔ پولیس کو کچھ کارروائی مکمل کرنا ہوتی ہے سو آپ لوگوں کے بیانات درکار ہوں گے' کچھ سوال پوچھے جائیں۔"

"تمہید کو چھوڑ کر سوالات شروع کریں۔"

مایا کے لہجے کا سرد پن محسوس کرکے اس نے سر ہلایا اور ٹھاکر رگھوناتھ کی جانب متوجہ ہوا۔

"مرحوم سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟"

ٹھاکر رگھوناتھ نے حقے کی نے منہ سے ہٹائی۔ "اتنا تو تم جانتے ہو انسپکٹر شاہ کہ وہ میرا بھتیجا تھا۔" انداز میں ہلکی سی ناگواری تھی۔

"ٹھاکر صاحب! میرے ساتھ تعاون کیجیے۔" وہ [illegible] لیے بغیر ٹھنڈے انداز میں بولا۔ "مرحوم شیکھر کے سرپرست کی ذمہ داری آپ نے کب سنبھالی تھی۔"

"یہ ہی کوئی پندرہ برس ہوئے جاتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا' اس کی پتنی پہلے ہی داغ مفارقت دے چکی تھی' شیکھر اس وقت غالباً" بائیس برس کا تھا۔"

"یعنی موت کے وقت ٹھاکر شیکھر راج کی عمر لگ بھگ سینتیس برس ہوگی۔" انسپکٹر شاہ کا ایک اپنا انداز تھا۔ تیکھا سا' پے در پے سوالات کرنے کا' بات کاٹنے کا' جانے کیوں مایا کو لگا وہ پہلے اس سے مل چکی ہے۔

"درست۔ وہ اس وقت بچہ تو تھا نہیں کہ میں اس کی نگرانی کرتا' کچھ عرصے بعد تعلیم کے لیے انگلستان چلا گیا' پیچھے سے اس کی زمین' جائیداد میں سنبھالتا تھا' اس نے گویا مجھے اپنی زمینوں کا نگراں مقرر کر رکھا تھا۔"

"اگر اسے آپ پہ اتنا اعتماد تھا تو اس نے چند سال بیشتر زمین کا بٹوارہ کیوں کرایا تھا؟ اور کچھ لوگوں سے یہ بھی کہا تھا کہ شاید اس کے ساتھ بددیانتی ہوئی ہے؟"

ٹھاکر رگھوناتھ گڑبڑا سے گئے۔ "نہیں ایسی بات نہیں تھی' پہلے شیکھر اور ہماری زمینیں مشترکہ تھیں' پھر اس نے بٹوارہ کرالیا۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

مایا خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"شیکھر انگلستان سے کب واپس آیا؟"

"وہ آتا جاتا رہتا تھا' اب آخری دفعہ شادی کرکے آیا تھا۔" ٹھاکر رگھوناتھ نے ذرا کی ذرا نظر مایا پہ ڈالی' وہ اسی طرح سپاٹ سا چہرہ لیے بیٹھی تھی۔

"یہاں میں آپ کو کچھ زحمت دوں گا میم صاحب!" انسپکٹر شاہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ "شیکھر سے آپ کی شادی کب ہوئی؟"

"چھ ماہ قبل۔"
"انگلستان میں؟"
مایا نے سر کو معمولی سی جنبش دی۔
"آپ نے اس سے شادی کیوں کی؟ آپ کی عمروں میں تقریباً سترہ سال کا فرق تو ہوگا۔"
"تیرہ سال کا۔" اس نے تصحیح کی۔ "شیکھر ایک رئیس تھا مگر دیسی رئیس۔ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ میرا تعلق برطانیہ کے شاہی خاندان سے ہے۔" کہتے ہوئے گردن قدرے تفاخر سے بلند ہوئی۔
"سو ظاہر سی بات ہے، میں ایک native cheiftain سے شادی دولت کی بنا تو کرنے سے رہی۔ ہم میں بس ایک قدر مشترک تھی اور وہ تھی محبت، سو ہم نے شادی کرلی۔"
"شادی انگلستان میں ہوئی؟"
"جی۔"
"آپ شادی کے کتنے عرصے بعد ہندوستان آئیں؟"
"تقریباً" دو ماہ بعد میں دہلی پہنچی تھی، کچھ عرصہ ادھر رہی، پھر ڈلہوزی چلے گئے۔ تقریباً" تین ماہ قبل شیکھر مجھے بیلی راجپوتاں لایا تھا۔"
"آپ کی اردو بہت صاف ہے۔" انسپکٹر شاہ مسکرایا۔
"میری فارسی بھی بہت صاف ہے۔"
وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد سے بات کرتی تھی، یہ انداز ایسا تھا کہ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔
"سنا تھا اہل فرنگ بے باک ہوتے ہیں، آج یقین بھی آگیا، ورنہ۔
برعظیم میں نگاہیں ملانے کو بے ادبی تسلیم کیا جاتا ہے۔"
"اور ہمارے یہاں نگاہیں جھکانے یا چرانے کو بددیانتی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ راست گو انسان میں اتنی ہمت ہونی چاہیے کہ دوٹوک بلاخوف و خطر کر سکے۔"
"بجا فرمایا۔ شیکھر سے آپ کے تعلقات کیسے تھے؟ میرا مطلب ہے خوش گوار یا درمیانے؟"
"ویسے جیسے ہر خوش و خرم میاں، بیوی کے ہوتے ہیں۔"
"مثلاً" کیسے؟"
"جیسے ہفتے بھر میں ایک لڑائی، دو، چار بار تلخ کلامی۔ کیوں؟ کیا آپ نے کوئی ایسا جوڑا دیکھا ہے، جس کی آپس میں لڑائی نہ ہوتی ہو؟"
"آخری بار آپ کی تلخ کلامی کس بات پر ہوئی تھی؟"
"یہ ہی کوئی پانچ روز پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ ہندوستان میں خاصی گندگی ہے، یہاں کے لوگ صفائی کا خیال نہیں رکھتے۔" وہ آرام سے کہے جارہی تھی۔
"تو اس نے آگے سے کیا کہا؟"
"اس نے کہا کہ کم از کم وہ فرنگیوں سے تو بہتر ہیں، جو مہینے میں بس ایک بار غسل کرتے ہیں اور یہ کہ وہ کمپنی بہادر کے جتنے افسروں کو جانتا تھا وہ ایسے ہی تھے۔"
"یہ تو معمولی بات ہے، کبھی کوئی غیر معمولی تلخ کلامی ہوئی؟"
"جو عورت ایک شخص کی محبت میں محل چھوڑ دے اور اس گاؤں میں آن کر بس جائے، وہ کیوں غیر معمولی تلخ کلامی کرے گی؟"
انسپکٹر شاہ لاجواب سا ہو کر خاموش ہوگیا، پھر ٹھا کر رکھو ناتھ کی جانب مڑا۔
"وقوعہ کے روز شیکھر کو آخری بار آپ نے کب دیکھا تھا؟"
"صبح ناشتے پہ۔ میں ناشتے کے بعد زمینوں پہ چلا گیا، تھوڑی دیر بعد ہی نوکر بھاگتا ہوا آیا کہ مہمان خانے میں آگ لگ گئی ہے، جب تک میں پہنچا سب کچھ جل چکا تھا۔ آگ کے بجھنے تک اس کی کوئلہ صورت لاش ملی۔ اس کے قدبت اور گھڑی اور دیگر چیزوں سے اس کی شناخت ہوئی۔ میں نے فوراً" ایک ملازم کو امرتسر مایا دیوی کو لینے بھیجا۔"
"وہ بھی ایک سست رفتار بگھی پہ اور میرے پہنچنے

سے قبل ہی شیکھر کی چتا جلا دی گئی۔" اتنے سرد و پُرجھتے ہوئے انداز میں بولی کہ انسپکٹر بُری طرح چونکا تو ٹھاکروں کے مابین اختلاف ابھی تک موجود تھے؟

"موٹر خراب کھڑی تھی اور کوئی حل نہیں تھا، ہم نے رات تک آپ کا انتظار کیا، مگر لاش کی حالت اتنی خراب تھی کہ چتا جلانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"مگر مجھے رام ناتھ نے یہ نہیں بتایا کہ شیکھر مر گیا ہے، مجھے صرف یہ ہی بتایا کہ شدید ایمرجنسی ہے، شیکھر نے بلوایا ہے۔ میں دو روز پہلے امرتسر کچھ کام سے گئی تھی، پیغام سن کر جلد از جلد پہنچ گئی، مگر تب تک شیکھر کی راکھ بھی بہائی جا چکی تھی۔"

"اس ساری بات سے آپ کا کیا مطلب ہے مایا دیوی؟" انسپکٹر نے سوچتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"مطلب صاف ہے، میرے پتی کو قتل کیا گیا ہے۔"

ٹھاکر رگھوناتھ بری طرح چونکے، حقہ ایک طرف ہٹا دیا گیا۔

"شک تو مجھے بھی یہ ہی ہے، بہرحال میم صاحب! آپ کو کسی پہ کوئی شک ہے؟"

انسپکٹر کی بات پہ وہ پل بھر کو خاموش ہو گئی، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، لیکن میں تفتیش کا مطالبہ کرتی ہوں۔"

ٹھاکر رگھوناتھ نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ مایا نے چہرہ ان کی طرف موڑا۔

"آپ کو کوئی اعتراض بڑے ٹھاکر؟" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے اور نفی میں گردن کو جنبش دی۔

"یہ آگ نہایت پراسرار طریقے سے لگی ہے، لاش کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہو سکا، لیکن ان شاء اللہ کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔ اسی لیے میں فضل الٰہی کو ساتھ لایا ہوں۔"

اس نے کونے میں بیٹھے عمر رسیدہ دیہاتی کی جانب اشارہ کیا۔ مایا نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ کون ہے؟"

"یہ کھوجی ہے۔" انسپکٹر شاہ اٹھ کھڑا ہوا، عملے نے پیروی کی۔ "میں شیکھر اور کسی ایسے شخص کے کھرے تلاشنا چاہتا ہوں، جو پرسوں صبح مہمان خانے میں آیا ہو۔"

"اب تک تو کھرے تباہ ہو چکے ہوں گے۔"

"جی نہیں، بڑے ٹھاکر نے یہ عقل مندی کی کہ لوگوں کو جائے واردات سے دور رکھا۔ کسی نہ کسی حد تک کھرے تباہ ضرور ہوئے ہوں گے مگر مجھے امید بہرحال ہے۔"

مایا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں یہ کارروائی آپ کے ہمراہ دیکھنا چاہوں گی۔"

چند لمحے بعد وہ انسپکٹر شاہ اور کھوجی کے ساتھ کوئلہ ہوئے مہمان خانے کے سامنے کھڑی تھی۔

مہمان خانہ حویلی سے ہٹ کر بنا تھا۔ اس کی چوکھٹ کے آگے باغیچے کی گھاس تھی، وہاں کھروں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مہمان خانے کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔

"میرا قیاس ہے کہ اس روز شیکھر پچھلے دروازے سے مہمان خانے میں داخل ہوا تھا۔"

"یہ کمرہ دراصل شیکھر کی لائبریری تھا، یہاں اس کی ڈھیروں کتابیں رکھی تھیں اور وہ فرصت میں ادھر وقت گزارتا تھا۔" وہ سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی بتا رہی تھی۔ اس کا رویہ نسبتاً بہتر تھا۔

وہ چلتے ہوئے کمرے کے اندر سے ہو کر پچھلے دروازے تک آئے۔

کھوجی دروازے کی چوکھٹ پہ جھک کر دیکھنے لگا۔

"کھرے موجود ہیں، آگے سارا کچا ہے، یقیناً کھرے مل جائیں گے۔" پھر وہ جھک کر دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔

وہ دونوں پیروی کرتے باہر آئے۔ مایا کو کچی زمین پہ مدھم سے بجھے بجھے نشانات دکھائی دیے۔

"چھوٹے ٹھاکر کا کھرا میں پہچانتا ہوں، مگر اس کے دو کھرے ہیں، شیکھر پہلے دروازے تک آیا تھا، پھر پلٹ گیا تھا، پھر دوبارہ اندر آیا، مگر وہ پلٹ کر کدھر گیا، ٹھہریں، شروع سے دیکھتے ہیں۔" کھوجی آگے بڑھ گیا۔

وہ دونوں کھروں سے بچتے اس کے پیچھے آئے۔
"یہ دیکھیں' یہ شیکھر ٹھا کر چلتا ہوا آرہا ہے' انداز میں سستی ہے' تھکاوٹ سے آہستہ آہستہ چل رہا ہے' شاید کسی گہری سوچ میں ہے۔"
کھوجی زمین پہ بیٹھا مٹے مٹے نشان دیکھ کر بول رہا تھا' اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے سامنے پوری فلم چل رہی ہو۔
مایا نے ان نشانوں کو دیکھا' اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔
"یہ دیکھئے' اب چوکھٹ سے چند قدم دور ٹھا کر رکا ہے' اور کچھ دیر جیسے سوچ کر اس طرف پیچھے کو مڑا ہے' پہلے وہ حویلی کے اندر کے راستے سے ادھر آیا تھا' اب اس طرف باہر کو جارہا ہے' تیز تیز چل رہا ہے' غصے میں ہے۔"
وہ بولتے بولتے کھروں کا پیچھا کررہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی روح گھس گئی ہو اور وہ وقت میں پیچھے جا کر لمحے امر کررہا ہو۔
"اب وہ حویلی کے پچھلے پھاٹک تک پہنچا ہے' یہاں رک کر اس نے اپنا جوتا جھاڑا ہے۔"
"مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا' آپ کو کیسے علم کہ اس نے ادھر رک کر جوتا جھاڑا ہے؟" مایا بے زاری سے بولی۔
کھوجی نے سر اٹھایا' اس کے خزاں رسیدہ چہرے پہ تجربے کی لکیریں تھیں۔
"عمر گزری ہے اس کام میں بٹیا رانی' بچپن میں جو کھرے اپنے باپ کے ساتھ دیکھتا تھا وہ آج تک ذہن میں نقش ہیں۔ تمہاری انگریز سرکار کھوجیوں کی نشاندہی کو بطور ثبوت نہیں مانتی' مگر گاؤں کے ہر داروغے کو ہمارے کام کا پتا ہے' تب ہی تو آج بھی تھانے دار صاحب ہمیں بلا لیتے ہیں۔"
پھر وہ جھک کر مٹی کو غور سے دیکھنے لگا۔
"یہ اپنے کام میں پراسرار حد تک ماہر ہوتے ہیں میم صاحب!"
اس نے شانے اچکا دیے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

"اب ادھر وہ جوتا جھاڑ کر پھر سے چل پڑا ہے۔ حویلی کے پھاٹک کے قریب اسے کوئی ملا ہے' غالباً ملازم ہے کہ یہ نوکیلی جوتی کا کھرا میں نے پچھلی طرف بھی دیکھا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر ملازم سے بات کی ہے' پھر شاید غصے میں اسے جھاڑا ہے' ملازم سہم کر پیچھے ہو گیا ہے۔ چھوٹا ٹھا کر اب پھاٹک پار کرکے باہر نکل آیا ہے۔"
وہ حویلی سے باہر نکل آئے تھے' کھوجی کمر پہ ہاتھ رکھے سوچتی نگاہوں سے سامنے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔
"کھیتوں کے اندر سے تو شاید کھرا نہ ملے' مگر نہیں' وہ پگڈنڈی سے ادھر جارہا ہے۔ یہاں بہت سے کھرے ایک دوسرے پہ چڑھے ہوئے ہیں۔ لوگ ادھر سے گزرتے رہتے ہیں' مگر مجھے دیکھنے دیجیے۔"
وہ دونوں کھیتوں کے کنارے کھڑے ہو گئے' جبکہ کھوجی پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا مٹی کی زبان پڑھنے لگا۔
اور پھر جب وہ یہ ہی زبان پڑھتے پڑھتے کھیتوں کے اختتام تک پہنچ گیا تو اشارے سے انہیں اپنی طرف بلایا۔
"وہ پگڈنڈی سے گزر کر اس طرف آیا ہے۔ یہاں سے آگے کھرے واضح ہیں' مگر اس کے کھروں پہ اس کا اپنا ہی کھر چڑھا ہے' مطلب چھوٹا ٹھا کر بعد میں ان ہی قدموں واپس بھی آئے گا۔"
وہ انہیں اپنے پیچھے لیے جھک کر مٹی کو دیکھتا آگے بڑھتا رہا' پھر ایک دم رک گیا۔
"داروغہ صاحب! وہ کچے راستے کی طرف مڑ گیا ہے۔"
"گاؤں کے تو سارے راستے کچے ہیں۔" مایا حیرانی سے بولی۔
"نہیں بٹیا رانی! ہم اس راستے کو بولتے ہی کچا راستہ ہیں' یہ مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف سے جاتا ہے۔ آگے چلنا ہے داروغہ جی؟" کھوجی کشمکش و پیچ میں مبتلا پوچھ رہا تھا۔
"ہاں چلنا ہے۔"

"ایسا کیا ہے کہ آپ کو سوچنا پڑ رہا ہے؟" مگر دونوں نے مایا کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"وہ کچے راستے پہ چلتا پرانے قبرستان کی طرف جارہا ہے۔ ادھر اس سے کوئی آکر ملا ہے۔" اب کھوجی بیٹھ کر بغور نشانات کو دیکھنے لگا۔ "آنے والا اونچے قد کا مرد ہے' ڈیل ڈول اچھا ہے' اس نے ٹھاکر **شیکھر** سے **مصافحے** کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے' مگر ٹھاکر پلٹ گیا ہے' پھر چند قدم واپس جاکر پھر دوبارہ نووارد کی جانب آیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے نووارد کافی دیر ہوئی' اس کے انتظار میں ٹہلتا رہا ہے۔ اب ٹھاکر نے اس سے ہاتھ ملا لیا ہے یا گلے ملا ہے یا نووارد نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا ہے۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ادھر تک آئے ہیں۔"

سامنے پرانے قبرستان کا لکڑی کا خستہ حال پھاٹک تھا۔ اس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔

"وہ یہاں کھڑے کافی دیر باتیں کرتے رہے ہیں' پھر دونوں میں لڑائی ہوگئی ہے' شاید ہاتھاپائی بھی ہوئی ہے۔ اب **شیکھر** نے مقابل کو ادھر دھکا دیا ہے اور تیز تیز چلتا واپس آیا ہے۔ انداز میں غصہ ہے۔"

یہ کہہ کر کھوجی کھڑا ہوگیا اور کپڑوں سے مٹی جھاڑی' "اس کے بعد تو آپ کو علم ہے کہ ٹھاکر واپس مہمان خانے میں چلا گیا تھا۔"

"ایک آخری بات فضل الٰہی! کیا یہ شخص جو اس سے ملا ہے' اس کے پیچھے مہمان خانے تک آیا ہے؟"

"کچے راستے پہ کچھ ایسے نشان ہیں جیسے کسی نے کھرے مٹا ڈالے ہوں' ہو سکتا ہے وہ پیچھے آیا ہو' مگر راستہ بدل کر۔"

"شکریہ فضل الٰہی۔"

"دلچسپ کارروائی تھی انسپکٹر صاحب! آپ اس نووارد کے کھرے کا مولڈ تیار کروالیں' اور کسی بھی قسم کی پیش رفت سے مجھے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ میں **شیکھر** کے قاتلوں کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ کہہ کر جانے لگی۔

"میم صاحب! آپ کو کسی پہ شک ہے تو بتا دیجیے۔"

"نہیں ہے۔" پھر ٹھہر کر بولی۔ "ٹھاکر رگھوناتھ کا بیٹا گوپال آج کل گاؤں سے باہر شکار پر گیا ہوا ہے' واپس آئے تو اس کا بیان ضرور لیجیے گا۔" کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے کھیتوں کی جانب بڑھ گئی۔

انسپکٹر شاہ اس کی پشت پہ گرتی ساڑھی کے پلو کو دیکھتا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔



کرم دین نے صدمہ سہار لیا تھا' مگر حاجی بشیر اگلے کئی روز تک بخار میں پھنکتا رہا تھا۔ گاؤں والے اس کی عیادت کے لیے آتے تو اپنے ہمراہ کئی کہانیاں دوسرے کو سنانے کے لیے لے کر پلٹتے۔

"کوئی کہتا ان کے دیکھتے ہی دیکھتے قبر شق ہوئی اور اندر سے وہ بھوت نکلا۔"

"اس کا قد دس فٹ تھا' اس نے منتر پھونک کر حاجی بشیر کو بے بس کردیا۔"

"نہیں چت کرکے وہ خوف ناک قہقہے لگاتا آسمان پہ اڑتا چلا گیا۔"

"اس کی آنکھوں اور منہ سے لہو بہہ رہا تھا۔"

بات اپنے حجم سے کئی گنا بڑھ کر بیلی راجپوتاں کے چپے چپے تک پھیل گئی۔ حاجی بشیر کو اس کی بیوی' بچوں نے مولوی سے کئی بار دم کروایا' تب وہ جاکر سنبھلا' لیکن پھر گاؤں والوں نے پرانے قبرستان کے قریب سے گزرنا بھی چھوڑ دیا' جو بات پہلے لوگ دبی دبی زبان سے کہتے تھے' اب اس کا ثبوت بھی انہیں مل چکا تھا۔



اس نے بالکونی کی جانب کھلنے والے دروازے کو دھکیلا۔ لکڑی کے دونوں پٹ چرچراہٹ کے ساتھ کھلتے چلے گئے۔ چمکیلی تیز دھوپ اس سے لپٹنے لگی۔ وہ ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنائے' پلکیں سکوڑ کر ادھر ادھر کا جائزہ لیتی باہر بالکونی میں آگئی۔

بیلی راجپوتاں پہ جاتی سرما کی چمکیلی دوپہر اتری

تھی۔ بالکونی سے دور دور تک پھیلا گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔

ایسے منڈیر پہ ترچھی بیٹھی' زرد دیوار سے سر ٹکائے وہ کسی مصور کا خوب صورت پورٹریٹ لگ رہی تھی۔ چہرہ اب بھی برف سا تھا' بالکل بے تاثر اور بھوری آنکھوں میں چمکیلی دھوپ کا عکس اتر آیا تھا۔ بال اکٹھے کر کے گردن کے دائیں جانب آگے کو ڈال لیے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے دور پھیلے کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔

تب ہی ملازمہ روپ وتی اس کے لیے چاندی کی طشتری میں تازہ پھلوں کے رس سے بھرا گلاس لے آئی۔

وہ گلاس تھامے گھونٹ گھونٹ رس پیتی رہی۔ نگاہیں دور کھیتوں پہ تھیں۔

"جانے کس نے جادو ٹونا کر دیا ہے اس حویلی پہ۔" اس کو خاموش پا کر روپ وتی وہیں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی کہنے لگی۔ "چند ماہ پہلے کی ہی تو بات ہے' جب چھوٹے ٹھاکر آپ کو لے کر پہلی دفعہ حویلی آئے تھے' کتنا جشن منایا تھا' کیسا چراغاں کیا تھا بڑے ٹھاکر نے' پورا گاؤں سج گیا تھا' کتنی دعوتیں کی تھیں ٹھاکروں نے' پر ہائے بھگوان..... بس ایک دن کے لیے آپ امرتسر گئیں اور پیچھے سے مہمان خانے میں آگ لگ گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کی تو لاش پہچانی بھی نہیں جا رہی تھی۔ بس انگوٹھی اور گھڑی سے پہچانا' ورنہ چہرہ تو بالکل ہی۔"

"شیکھر صبح اس مہمان خانے میں کیوں گیا تھا؟" اس کی بات کاٹ کر مایا نے پوچھا' وہ ابھی تک باہر دیکھ رہی تھی۔ "مجھے کسی نے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دیا۔"

"مجھے تو علم بھی نہیں تھا کہ وہ ادھر گئے ہیں' جانے کس وقت گئے تھے۔ میں نے تو انہیں شام میں آخری بار دیکھا تھا' کچے راستے پہ۔"

"کچا راستہ؟ کون سا کچا راستہ؟" مایا نے گردن پھیر کر استعجاب سے اسے دیکھا۔ یہ معلومات اس کے لیے نئی تھی۔

"وہ جو مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف جاتا ہے' وہ والا راستہ میم صاحب!"

"مسلمانوں کے پرانے قبرستان کی طرف؟" مایا نے حیرت سے دہرایا۔ "شیکھر کا مسلمانوں کے قبرستان میں کیا کام تھا۔"

"بھگوان جانے میم صاحب! میں نے تو آخری دفعہ انہیں ادھر ہی دیکھا تھا' جب میں اپنی موسی کے گھر سے واپس آ رہی تھی۔"

"کیسے اتنی اچانک سے ہو گیا یہ سب کچھ۔" مایا زیر لب بڑبڑائی۔ "میں بس ایک روز کے لیے امرتسر گئی اور واپس آئی تو شیکھر کی چتا تیار رکھی تھی۔ مجھے تو کسی نے اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھنے دیا۔ بس ایک روز میں اتنا کچھ جیسے موت اس کے تعاقب میں بیٹھی تھی۔"

مایا کو بے اختیار یاد آگیا' وہ دن جب وہ پہلی دفعہ حویلی میں آئی تھی۔

روشنیوں اور دیوں سے چراغاں کیا گیا تھا' پوری حویلی کسی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ جب وہ اور شیکھر اپنی مورس سے اترے تو ٹھاکر رگھوناتھ ان کے استقبال کے لیے دروازے پہ کھڑے تھے۔

"مایا ڈارلنگ! یہ میرے تایا ٹھاکر رگھوناتھ ہیں' میری تائی کا کئی برس ہوئے انتقال ہو چکا ہے' ان کا ایک ہی بیٹا ہے گوپال جو کہ....." اس کا تعارف کراتے کراتے شیکھر نے رک کر سوالیہ نگاہوں سے ٹھاکر رگھوناتھ کا چہرہ دیکھا' جنہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

"وہ دوستوں کے ساتھ شکار پہ نکلا ہے' صبح تک آجائے گا۔"

"اوکے۔ بہرحال مایا ڈیئر! تایا ہی میری کل فیملی ہیں' انہوں نے مجھے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے۔"

اور رات کو اپنے کمرے میں' اس کے قریب بیڈ پہ بیٹھے شیکھر نے اسے بتایا تھا۔

"یہ خبیث بڈھا شروع سے ہی میری جائیداد کے پیچھے ہے اور اس کا وہ کمینہ بیٹا ان دونوں کا بس چلے تو **شیکھر** کو گولی مار کر اس کی ساری پراپرٹی ہتھیا لیں۔"
اور مایا نے جھٹ سے اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا اور **شیکھر** نے وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

اس نے سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ روپ وتی ابھی تک اس کے سر پہ سوار کچھ کہے جا رہی تھی۔ مایا پھر سے دور فصلوں کو دیکھنے لگی جہاں کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پہ ایک لڑکی چلتی آرہی تھی۔

بالوں کا جھولتا پراندہ گردن میں لاپروائی سے پڑا دوپٹہ اور ہاتھ میں پکڑا بھٹہ جسے وہ چلتے ہوئے ساتھ ساتھ کھاتی جا رہی تھی۔

پگڈنڈی سے اتر کر اب وہ حویلی کے سامنے والے راستے سے گزر رہی تھی۔ فاصلہ کم ہونے کے باعث مایا اس کا چہرہ بغیر کسی دقت کے دیکھ سکتی تھی۔

گندمی رنگت، تیکھے نقوش، مغرور سی بڑی بڑی آنکھیں، وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی، اتنی جتنی پنجاب کے کسی گاؤں کی کوئی الھڑ مٹیار ہو سکتی تھی۔

"یہ زہرہ ہے، ملکوں کی دھی۔" روپ وتی نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "سارے گاؤں میں اس جیسی سندر لڑکی کوئی نہیں ہے۔"

وہ بلا ارادہ اس لڑکی کو دیکھے گئی۔ وہ خوب صورت بھی تھی اور کم سن بھی، تقریباً "سترہ، اٹھارہ برس کی۔ اب وہ لاپروائی سے **بھٹہ** کھاتی حویلی کے بالکل قریب سے گزر رہی تھی۔

دفعتاً کچی سڑک پر سے دھول اڑاتی جیپ راستہ بدل کر اس کے سامنے آئی۔ لڑکی ہڑبڑا کر پیچھے ہوئی۔

جیپ رک چکی تھی۔ اس میں چار افراد بیٹھے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے شخص کو وہ جیپ کی کھلی چھت کے باعث بخوبی پہچان گئی تھی۔

وہ ٹھاکر رگھوناتھ کا بیٹا گوپال تھا۔ **شیکھر** کا تایا زاد بھائی۔

"اے..... راستہ کیوں روکا ہے؟" لڑکی بھٹہ یک طرف پھینک کر ماتھے پہ تیوری ڈالے غصے سے **پوچھ** رہی تھی۔

جواب میں گوپال اور اس کے دوست ایک ساتھ اس پہ فقرے کسنے لگے۔ ان کا لہجہ دیہی پن سے بھرا تھا، مایا کو الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

"میرے ساتھ زبان سنبھال کر بات کرو۔" لڑکی ہاتھ کمر پہ رکھے تیزی سے بولی۔ "میں بدر غازان کی منگ ہوں، میرے ساتھ بدتمیزی کی تو لاش بھی نہیں ملے گی تمہاری۔"

آن کی آن میں گوپال کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔

اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے موڑ کر آگے لے گیا۔ لڑکی نے فاتحانہ انداز میں دھول اڑاتی دور جاتی جیپ کو دیکھا اور استہزائیہ سر جھٹک کر کچھ زیر لب بڑبڑائی۔

"روپا دیوی، جاؤ اس کو میرے پاس لے کر آؤ۔" مایا نے تحکم سے کہا اور چند لمحوں بعد وہ لڑکی روپ وتی کے عقب میں اس کے کمرے سے ہو کر بالکونی میں داخل ہوئی۔

مایا ابھی تک منڈیر پہ ترچھی بیٹھی کھیتوں کو دیکھ رہی تھی، آہٹ پہ اپنی راج ہنس سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس کے لہجے میں ٹھاکرانیوں کی سی رعونت در آئی تھی۔

"زہرہ جی، زہرہ بتول۔" وہ ویسی ہی لاپروائی سے کھڑی تھی، مگر نگاہوں میں راجپوتوں کی گوری بہو کے لیے بے پناہ ستائش تھی۔ "آپ ٹھاکر **شیکھر** کی بیوہ ہو؟"

مایا نے اثبات میں سر ہلایا، اور ایک بے نیاز سی نگاہ سے زہرہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"بڑا افسوس ہوا جی ٹھاکر **شیکھر** کی موت کا کچھ پتا چلا، آگ کیسے لگی تھی؟" زہرہ منہ زور اور نڈر ہونے کے ساتھ ساتھ پر اعتماد بھی تھی۔

"تم بتاؤ آگ کیسے لگی تھی؟ تمہیں کچھ پتا چلا؟" مایا

خاموشی سے اس کی بات سننے کے بعد ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

"میں.....جی.....وہ.....پتا نہیں جی۔" پٹر پٹر بولنے والی زہرہ گڑبڑا کر خاموش ہو گئی۔

منڈیر پہ بیٹھی اس مہارانی کے سامنے بولنا اب اسے قدرے مشکل لگ رہا تھا۔

"یہ گوپال تم سے کیا کہہ رہا تھا؟" وہی بے تاثر بغیر دلچسپی و تجسس لیے لہجہ۔

"کہنا وہنا کیا ہے جی۔" زہرہ کے ماتھے پہ بل پڑ گیا۔ "جہاں اکیلی لڑکی دیکھی، کتوں کی طرح بھونکنے آجاتے ہیں ٹھاکروں کی لڑکے۔"

روپ وتی نے گھبرا کر زہرہ کو دیکھا جو ٹھاکروں کی حویلی میں ہی شروع ہو چکی تھی۔

"تو کتوں کو خاموش کرانے کا گر کہاں سے سیکھا، اس اکیلی لڑکی نے؟" اس کا لہجہ ابھی تک کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

"میں نے بھی کہہ دیا کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا میں بدر غازان کی منگ ہوں۔ بس بدر کے نام سے تو جان جاتی ہے ٹھاکروں کے لڑکوں کی۔" اس کے لہجے میں فخر تھا۔

"ہوں۔" ماہا گہری سانس بھر کر گردن موڑے پھر سے کھیتوں کو دیکھنے لگی، جیسے پیچھے موجود ان دو نفوس سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ "میں جاؤں جی؟"

ماہا نے گردن پھیرے بغیر "ہاں" کہہ دیا تو زہرہ چلی گئی۔ جاتے سمے وہ کچھ کنفیوزڈ سی تھی، شاید اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ٹھاکرانی نے اسے کیوں بلوایا تھا۔

ان کے جانے کے کتنی ہی دیر بعد گوپال کی جیپ حویلی کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ وہ ابھی تک منڈیر پہ بیٹھی کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ گوپال کو دیکھ کر اسے چند روز پرانی وہ شام یاد آگئی، جب وہ اس سے پہلی دفعہ حویلی میں ملی تھی۔

یہ اس کا بیلی راجپوتاں میں دوسرا روز تھا۔

وہ شیکھر کے ساتھ برآمدے میں بیٹھی شام کی چائے پی رہی تھی، جب اس نے ایک اونچے لمبے تیس پینتیس برس کے شخص کو جیپ سے نکل کر سامنے کمروں کی جانب جاتے دیکھا۔ اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی جیسے وہ نشے میں ہو۔

"یہ کون ہے؟" ماہا نے شیکھر کا ہاتھ ہلایا۔ وہ بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا، متوجہ کرنے پہ گردن موڑ کر ایک نظر پیچھے دیکھا۔

"مائی کزن! گوپال راج۔" شیکھر نے سر جھٹکتے ہوئے پھر سے فائل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"شاید نشے میں ہے۔" ماہا نے چائے کی پیالی میز پہ رکھ دی۔ گوپال اب اندر جا چکا تھا۔ اس نے اگر شیکھر کو دیکھا بھی تھا تو ملنے کی یا بات کرنے کی سعی نہیں کی تھی۔

ماہا گھونٹ بھرتی اس تناؤ کو محسوس کرتی رہی جو شیکھر اور تایا رگھوناتھ کے درمیان ہمیشہ سے موجود تھا۔

شام کی سرد ہوا کا تیز جھونکا آیا تو وہ چونکی اور منڈیر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا، سورج جانے کب کا ڈوب چکا تھا۔ وہ ساڑھی کا پلو ہاتھ سے سنبھالے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔



چاچی باورچی خانے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی، زہرہ ادھر ادھر سے اسے آوازیں دیتی باورچی خانے کے دروازے تک آئی۔

"چاچی، بدر کہاں ہے؟"

"کل سے شہر گیا ہوا ہے، کیوں خیریت میری دھی؟" چاچی ہاتھ روک کر پوچھنے لگی۔ زہرہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے لہجے میں پیار سمٹ آتا تھا۔

"خیریت نہیں ہے۔" وہ نروٹھی سی دھپ سے چوکی کھینچ کر اس کے ساتھ آن بیٹھی۔

"کسی نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟"

"تایہ ٹھاکروں کے لڑکوں کو مسئلہ کیا ہے؟" وہ کچی سبزی اٹھا کر کھانے لگی۔

چاچی نے چھری رکھ دی۔ ”کسی نے کچھ کہا ہے تجھے؟“

”آہو۔ ٹھاکر گوپال ہے نا‘ اس نے اپنی موٹر سے میرا راستہ روکا۔“

”پھر؟“ چاچی پریشان ہو گئی۔

”میں نے بھی بدر کے نام کی دھمکی دے دی‘ ایسے بھاگا کہ بس!“ وہ مزہ لے کر کھلکھلائی‘ پھر کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی ”ویسے بدر کب آئے گا؟ بتاؤں تو سہی اسے‘ وہ خود ہی نمٹ لے گا۔“

”پاگل مت بن زہرہ! گوپال دبک گیا بس اتنا ٹھیک ہے‘ اب بدر کو نہ بتانا میری دھی‘ تجھے اس کے غصے کا پتا تو ہے‘ خوامخواہ بات بڑھے گی۔“

”پر چاچی‘ بدر ایک دفعہ اس کی طبیعت تو ٹھیک کرے نا۔“ وہ منمنائی۔

”ارے جھلی‘ ہر بات گھر کے مردوں کو بتانے کی نہیں ہوتی‘ ورنہ خون خرابا ہو جائے گا اور تجھے کتنی دفعہ کہا ہے یوں اکیلی نہ لور لور پھرا کر‘ اب تو بڑی ہو گئی ہے۔ خیال کیا کر۔“ چاچی نے ڈپٹ دیا۔

”اچھا۔“ وہ خفا سی ہو گئی‘ پھر ایک دم جوش سے بولی۔ ”چاچی‘ تو نے ٹھاکر شیکھر کی گوری میم دیکھی ہے؟ راجپوتوں کی نئی ٹھاکرانی؟“

”ٹھاکر شیکھر کی بیوہ؟ نہیں‘ ان سے کون سا ایسے تعلقات ہیں جب.....“ چاچی سر جھٹک کر سبزی کاٹنے لگی۔

”مجھے روپ وتی نے آج کہا کہ تمہیں مہارانی بلا رہی ہے‘ تو میں راجپوتوں کی حویلی چلی گئی۔“

”زہرہ!“ چاچی دنگ رہ گئی۔ ”تو راجپوتوں کی حویلی چلی گئی؟ بدر کو علم ہوا تو جانتی ہے کیا ہو گا؟“

”اور بدر کو کیسے علم ہو گا؟“ وہ ہنس دی۔ ”پر چاچی‘ وہ بہت شان والی ہے۔“

”شیکھر کی بیوہ؟ کیا بہت حسین ہے؟“

”حسین تو پتا نہیں‘ مگر..... مگر.....“ زہرہ کو جیسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ”بس میں تجھے کیا بتاؤں چاچی‘ وہ بہت شان والی ہے‘ بالکل جیسے مہارانیاں ہوتی ہیں۔ اتنی خوب صورت نہیں ہے‘ مگر بالکل مہارانی لگتی ہے‘ آنکھ نہیں ملائی جاتی اس سے۔“

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چاچی بدر آئے تو مجھے بتانا‘ مجھے کام ہے اس سے۔“

”ہاں پتا ہے مجھے‘ کیا کام ہے تجھے؟“ چاچی ہنس دی تو وہ جھینپ کر وہاں سے بھاگ گئی‘ مگر بھاگنے سے پہلے چاچی نے زہرہ کے چہرے پہ بکھرے دھنک رنگ دیکھ لیے تھے۔



گھاس شبنم کے قطروں سے لدی تھی۔ وہ ان قطروں پہ اپنے سپید پاؤں رکھتی کیاری کی طرف چلی آئی جہاں بڑے بڑے تازہ سرخ گلاب لگے تھے۔ سامنے گھاس پہ سرخ پتیاں بکھری تھیں۔

شاید کوئی باسی گلاب ٹوٹ کر گرا تھا اور ہوا نے اس کی پتیاں بکھیر دی تھیں۔

مایا وہیں کیاری کے قریب جھک کر پتیاں چننے لگی۔

دور باغیچے کے آغاز پہ کوئی تیزی سے چلتا برآمدے کی جانب بڑھ رہا تھا‘ اسے دیکھ کر جیسے ٹھٹک کر رک گیا۔

تازہ سرخ گلابوں کے قریب گھاس پہ ننگے پاؤں بیٹھی لڑکی سر جھکائے پتیاں چن کر اپنی گود میں بھر رہی تھی۔ وہ گلابی رنگ کی پاؤں تک آتی نائٹی میں ملبوس تھی اور شہد رنگ بالوں شانوں پہ بکھرے تھے۔

ٹھاکر گوپال راج اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے گھاس پہ آ گیا۔ بھاری جوتوں تلے نرم گھاس دبتی‘ کچلتی گئی مگر مایا اسی طرح مگن کیاری سے پھول توڑ کر گود میں ڈال رہی تھی۔

وہ اس کے بالکل سامنے آ گیا۔

”گلاب پسند ہیں آپ کو‘ مایا دیوی؟“

”سب کو ہوتے ہیں۔“ وہ بغیر چونکے‘ اسی اطمینان سے گود میں رکھے پھولوں کی ٹہنیاں برابر کرتی رہی‘ سر اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔

جانے کیسی بے نیازی اور غرور تھا اس چند قدم کے

فاصلے پہ بیٹھی لڑکی کے اندر کہ گوپال کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ حسین تھی مگر گوپال نے اس سے کہیں زیادہ حسین عورتیں دیکھی تھیں۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ گوری میم تھی گوپال نے بہت سی میمیں پھیکے شلجم جیسی گوریاں دیکھ رکھی تھیں۔ یہ حسن نہیں تھا جو اس عورت کو دوسروں سے بالکل ممتاز بناتا تھا' یہ ایک سحر کشش اور تمکنت تھی جو گوپال راج نے زندگی میں پہلی دفعہ کسی عورت میں دیکھی تھی۔

"آپ..... آپ انگلستان واپس جارہی ہیں؟"

"نہ جاؤں؟" اس نے گلدستہ بناتے بناتے رک کر سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں تو..... ہاں مگر۔"

وہ کوئی وضاحت سنے بغیر سر جھکائے گلدستے کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔

"آپ..... شیکھر کی تمام جائیداد بیچنا چاہتی ہیں؟" گفتگو شروع کرنے کی ایک اور کوشش۔

"ہاں۔"

"اس سلسلے میں پتا جی آپ کی مدد کرسکتے ہیں۔"

"وہ کر رہے ہیں۔" ایک لمبی ٹہنی کو مروڑ کر گلدستے کے گرد باندھا۔

"اوہ اچھا۔" وہ شرمندگی چھپانے کو کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔ "آپ کی اور شیکھر کی پسند کی شادی تھی؟"

"ہوں۔"

"آپ دونوں ساتھ بہت خوش تھے' کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہو جائے گا۔"

وہ گلدستہ بنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گود سے بہت سی پتیاں گھاس پہ آن گریں۔ وہ کیاری سے کھڑے کھڑے جھک کر کچھ پتے توڑنے لگی۔

"آپ واپس انگلستان جا کر کیا کریں گی؟"

"یہ بدر غازان کون ہے؟" پتے توڑ کر گلدستے کو سجاتے اس نے پوچھا۔

گوپال اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا' یہ سوال اس کے لیے قطعاً" غیر متوقع تھا۔

"جی..... بدر غازان؟ آپ کو کس نے بتایا؟"

"کل جس لڑکی کو آپ حویلی کے باہر چھیڑ رہے تھے اس نے بدر غازان کے نام کی ہی دھمکی دی تھی نا آپ کو۔"

گوپال کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"کون ہے یہ بدر غازان؟" وہ نگاہیں گلدستے پہ جمائے اسے بڑے بڑے سبز پتوں سے سجا رہی تھی۔

"مُسلا ہے' اور کچھ نہیں۔" کوئی موٹی گالی لبوں پہ روک کر' بس اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔

مایا نے اطمینان سے گلدستہ مکمل کیا' گھاس پہ گری پتیاں چن کر کیاری میں ڈالیں اور شبنم کے نرم قطروں پہ پاؤں رکھتی باغ سے باہر آئی۔ کنارے پہ رکھی اپنی نازک جوتی پہنی اور ہاتھ سے بال سنوارتے ہوئے حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔

روپ وتی کو اس وقت یقیناً" رسوئی میں ہونا چاہیے تھا' وہ کچھ سوچ کر ہال کمرے سے دائیں جانب ہولی۔ چند راہداریاں عبور کر کے وہ رسوئی کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

"روپا دیوی۔" اس نے ہلکا سا دروازہ بجایا۔

ناشتہ بناتی روپ وتی چونک کر پیچھے مڑی۔ بیچ چوکھٹ میں گلابی نائٹی پہنے' ہاتھ میں گلدستہ لیے مایا کھڑی تھی۔

"مہارانی جی' آپ؟ خیریت؟" روپا ہاتھ دھو کر' ساڑھی کے پلو سے خشک کرتی اس تک آئی۔

"مجھے باہر جانا ہے' میرے ساتھ چلو۔"

"ناشتہ کر کے یا.....؟"

"نہیں میں بس....." مایا نے ایک نظر اپنے شب خوابی کے لباس کو دیکھا۔ "لباس تبدیل کرلوں۔"

"جانا کدھر ہے' جی؟"

"زہرہ کے گھر' جو کل آئی تھی۔" کہہ کر وہ گلدستہ ہاتھ میں لیے واپس راہداری میں مڑ گئی۔

"ایں؟ زہرہ کے گھر؟" روپا حیران پریشان کھڑی رہی۔ یہ نئی مہارانی بھی ایک معمہ تھی۔

چند منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے پھر سے رسوئی کے دروازے پہ کھڑی تھی۔

"چلو۔" تحکم سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

سفید لانگ اسکرٹ ہلکا گلابی بلاؤز اور شانوں پہ سفید رنگ کی چھوٹی سی اسٹول پھیلائے 'وہ بہت بے نیازی سے چل رہی تھی۔

زہرہ کے گھر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ وہیں ان کو کھیتوں کے اس طرف اپنی کسی سہیلی کے ہمراہ ٹہلتی مل گئی۔

اس کا تعلق اونچے گھرانے سے تھا' گاؤں میں مسلمانوں کے اونچے گھرانوں کی جوان بیٹیاں یوں نہیں پھرا کرتی تھیں 'مگر زہرہ کو اس کی کم سنی اور غالباً "لاڈلی ہونے کے باعث خاصی رعایت مل جاتی تھی۔

"مایا دیوی ..... آپ۔" وہ سہیلی کو بھگا کر ان کی طرف آگئی۔

"ہاں زہرہ! مہارانی جی تم سے ہی ملنے آرہی تھیں۔"

"یہ تمہارے لیے۔" مایا نے گلدستہ اس کی جانب بڑھایا۔ "کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی' سو تم سے ٹھیک سے بات نہیں کر سکی۔"

کل کی نسبت آج مایا کے چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ تھی 'مگر پھر بھی انداز میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اپنی عادت کے برعکس اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر سکی۔

"شکریہ ٹھاکرنی جی۔" اس نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ گلدستہ قبول کیا۔

"تم اچھی بہادر لڑکی ہو۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ روپا ان سے چند قدم پیچھے تھے۔

"بننا پڑتا ہے جی! ٹھاکروں کے لڑکے ورنہ جینے نہیں دیتے۔"

سورج نکل چکا تھا اور نرم گرم دھوپ سے اس کے سنہرے مائل شہد رنگ بال چمکنے لگے تھے۔

"شیکھر کیسا لگتا تھا تمہیں؟"

"ان کے بارے میں گاؤں والے زیادہ جانتے نہیں ہیں۔ وہ بچپن سے ہی تعلیم کے لیے دہلی چلے گئے تھے پھر کاروبار کے بعد یا تو دہلی ہوتے یا ولایت 'گاؤں تو کبھی کبھار ہی آتے تھے۔"

"اور یہ بدر غازان کون ہے؟"

زہرہ کے چہرے پہ دھنک کے سارے رنگ بکھر گئے۔ مایا نے بہت غور سے انہیں دیکھا تھا۔

"میرے چچا کا بیٹا 'میرے ماں باپ کے بعد میرے چچا' چاچی نے ہی مجھے پالا ہے۔" وہ سر جھکائے مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے کچے راستے پہ دور نکل آئی تھیں۔

"کرتا کیا ہے؟"

"وہ باہر سے پڑھ کر آیا ہے 'اب تو باپ دادا کی زمینیں سنبھالتا ہے۔"

"کیا بلی راجپوتاں کے سارے زمین داروں سے ٹھاکر گوپال اسی طرح ڈرتا ہے؟" مایا کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔

"ہمارا خاندان گاؤں کا واحد مسلم خاندان ہے' ہماری زمینیں راجپوتوں سے زیادہ نہیں ہیں تو کم بھی نہیں ہوں گی۔ پہلے یہ لوگ بات بات پہ ہندو مسلم فسادات بھڑکا دیتے تھے 'مگر اب کئی برس سے کوئی فساد نہیں ہوا۔ یہ بدر سے ڈرتے ہیں' جانتے ہیں اس کے پاس طاقت بھی ہے اور اثر و رسوخ بھی۔"

"بس اسی لیے ڈرتے ہیں؟"

"تو آخر ہے کوئی اس پورے گاؤں میں بدر جیسا؟" اپنے پراندے سے کھیلتی وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی 'ایک دم رک گئی۔ "ادھر نہ جائیں مایا دیوی۔"

وہ جوان کے ساتھ چلتے چلتے اس کچے راستے پہ کافی آگے تک آگئی تھی' ٹھٹک کر رک گئی۔

"مگر کیوں؟ ادھر کیا ہے؟" اس نے حیرت سے کچے راستے کو دیکھا اور پھر روپ وتی اور زہرہ کے چہروں پہ چھائے خوف کو۔

"مہارانی جی' یہ راستے پرانے قبرستان کو جاتا ہے' وہاں ..... وہاں سایہ ہے جی۔" روپ وتی کی آواز میں خوف در آیا تھا۔

"سایہ؟ کس چیز کا سایہ؟"

"بھوت کا سایہ 'کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہے جی۔"

"کیا بات کر رہی ہو روپا!" مایا نے ناگواری سے سر جھٹکا۔
"روپا دیوی ٹھیک کہہ رہی ہے ٹھاکرنی جی! پرانے قبرستان میں سایہ ہے۔ لوگ اب اس کے قریب سے بھی نہیں گزرتے۔"
"بلکہ اس دن تو اچھو کمہار نے خود اس بھوت کو دیکھا ہے' سیاہ چغہ پہن رکھا تھا اور قبرستان کے آس پاس چکر کاٹ رہا تھا۔ تین روز تک اچھو کمہار کو بخار رہا۔"
"اور گاؤں والے کہتے ہیں کہ روز رات کو سیاہ چغے میں ملبوس ایک لمبا سا بھوت پرانے قبرستان میں آتا ہے اور پھر ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے وہ کچھ کھود رہا ہو۔"
"گاؤں والوں نے کبھی اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی؟" مایا کو ابھی تک یقین نہ تھا۔
"نہ جی' توبہ کریں۔ ہوائی چیزوں کا بھی پیچھا کیا جاتا ہے کیا؟" روپا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"اور ٹھاکرنی جی! کسی نے آج تک اسے آتے جاتے نہیں دیکھا' کسی قبر سے اٹھتا ہے وہ شاید۔"
"شاید!" اس نے طنزاً" دہرایا۔ "ہوگا کوئی عامل بابا' کوئی چلہ وغیرہ کر رہا ہوگا' تم گاؤں والے بھی نا۔"
"بدر بھی یہی کہتا ہے۔" زہرہ نے تاسف سے سر جھٹکا جیسے مایا اور بدر' دونوں کی عقل پہ ماتم کر رہی ہو۔
"کیا کہتا ہے وہ؟" بلا ارادہ بھی وہ متوجہ ہوگئی۔
"یہی کہ یہ گاؤں کا ہی کوئی بندہ ہے جو کسی واردات میں ملوث' یقیناً" کسی کو قتل کر کے دبایا ہوگا اور اب لاش ڈھونڈ رہا ہے۔"
"بہت معقول آدمی ہے تمہارا تایا زاد ملوانا مجھے کبھی اس سے ابھی تو چلو تمہارا وہ قبرستان دیکھتے ہیں۔"
روپ وتی اور زہرہ روکتی رہ گئیں مگر بیلی راجپوتاں کی وہ مہارانی کہاں کسی کی سنا کرتی تھی۔
قبرستان کی چار فٹ اونچی چار دیواری کچی تھی۔ داخلے کے لیے ایک لکڑی کا خستہ حال پھاٹک تھا۔
وہ پھاٹک کھول کر اندر چلی آئی۔

قبرستان بہت قدیم تھا جیسے کوئی صدیوں پرانا کھنڈر ہو۔ اس کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ کونے میں برگد کا ایک بوڑھا درخت کھڑا تھا' جس کی جھکی شاخیں اور قبرستان کی پراسرار فضائیں اس بیلی راجپوتاں کے بھوت کی گواہ تھیں' جس نے پورے گاؤں کو متوحش کر رکھا تھا۔
وہاں کی خاموش فضا بہت پراسرار تھی' اپنے اندر بہت سے صدیوں پرانے راز دفن کیے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہاں سفید لبادے اوڑھے ان دیکھی روحیں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ بالکل' ان کے آس پاس۔
"تو ادھر آتا ہے وہ بھوت؟" سینے پہ ہاتھ باندھے وہ طائرانہ نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔
"چلیئے مہارانی جی! مجھے تو وحشت ہو رہی ہے۔"
وہ دونوں مارے باندھے اس کے پیچھے آئی تھیں اور اب خوف سے روپ وتی کا برا حال تھا۔
"کیا خیال ہے' رات تک انتظار نہ کریں؟ میں اس سورما کو دیکھنا چاہتی ہوں جو معصوم لوگوں کو جانے کتنے عرصے سے ڈرا رہا ہے۔"
"بھگوان نہ کرے جو ہم رات ادھر بسر کریں۔ چلیے مہارانی جی' بڑے ٹھاکر کو علم ہوا تو بہت خفا ہوں گے۔"
"کیوں؟" مایا تیزی سے پلٹی۔ "تمہارے بڑے ٹھاکر کو میرے گاؤں میں چلنے پھرنے پر بھی اعتراض ہے؟ میرا گھر برباد ہو گیا' میرا پتی مجھ سے چھن گیا' اس کا آخری بار منہ نہیں دیکھنے دیا' مجھے کیا یہ ظلم کم تھا جو اب مجھے حویلی میں قید کرنا چاہتے ہیں؟"
روپ وتی اور زہرہ ششدر رہ گئیں۔
"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مہارانی جی؟"
"کیا غلط کہا میں نے؟ کیوں پڑے ہیں یہ شیکھر کی جائیداد کے پیچھے؟ کیا انہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ اس کو مرے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟" بہت دن کا لاوا جیسے اس کے اندر سے نکلا تھا۔
"ٹھاکروں کو بھی چھوٹے ٹھاکر کی موت کا اتنا ہی دکھ ہے مہارانی جی' آپ یوں دل برا نہ کریں۔"

"جانے بھی دے' روپا۔" وہ سر جھٹک کر تیز تیز قدموں سے چلتی کھلے پھاٹک سے باہر چلی گئی۔
روپ وتی اور زہرہ بتول ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔



زہرہ پرانده جھلاتی ہمیشہ کی طرح بھاگتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئی اور پھر ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔
سامنے چارپائی پہ بدر بیٹھا تھا' اس کی زہرہ کی طرف کمر تھی اور وہ چاچی کی کوئی بات خاموشی سے سن رہا تھا۔

ایک دم سے برآمدے میں جیسے دھنک اتر آئی تھی' زہرہ کو ہر شے خوب صورت لگنے لگی' وہ دھڑکتے دل کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آئی اور سلام کیا۔
وہ ماں کی کسی بات پہ الجھا بیٹھا تھا' چونک کر سر اٹھایا اور سلام کا جواب دیا پھر دوبارہ ماں سے بات کرنے لگا۔
وہ وہیں خاموشی سے چارپائی کی پائنتی پہ ٹک گئی۔
"زہرہ! صبح صبح کدھر چلی گئی تھی' میں تجھے ڈھونڈ رہی تھی۔" چاچی بات ادھوری چھوڑ کر زہرہ سے کہنے لگی۔

زہرہ نے سر اٹھایا اور ایک چور نگاہ اس پہ ڈالی جو کچھ سوچتا ہوا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا اس کی نگاہیں سامنے دیوار پہ جمی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں الجھا تھا۔

"بس نسیمہ کے ساتھ کنویں تک گئی تھی۔" وہ پلکیں جھکائے کہنے لگی۔ بدر کے سامنے اس کی پلکیں خود بخود جھک جاتی تھیں۔
"اتنی دیر کر دی کنویں پہ۔ بدر تمہارا پوچھ رہا تھا۔"
زہرہ کا چہرہ کھل اٹھا' اس نے بے اختیار نگاہیں اٹھا کر بدر کو دیکھا۔ وہ اسی مغرور بے نیاز انداز میں چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ گیلے سیاہ بال ماتھے پہ بکھرے تھے اور آستینیں کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں' شاید وہ ابھی نہا کر آیا تھا۔

پتا نہیں وہ اس کا پوچھتا بھی تھا' یا چاچی ایسے ہی اس کا دل رکھنے کو کہتی تھی۔
"بس چاچی' وہ ٹھاکر شیکھر کی بیوی مل گئی تھی راستے میں' وہ پرانے قبرستان لے گئی تو وہیں دیر ہو گئی۔"

بدر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم پرانے قبرستان کیوں گئیں؟"
"میں نہیں گئی' ٹھاکر شیکھر کی بیوی لے گئی تھی۔ وہ گوری ٹھاکرنی۔" وہ نظریں جھکائے بدر کے تنو مند ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔
"ٹھاکر شیکھر کی بیوی؟" بدر ایک دم چونکا۔ "وہ جو انگلستان سے آئی ہے؟"
"ہاں۔" زہرہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا' وہ اتنا وجیہہ و خوبرو تھا کہ وہ زیادہ دیر اسے دیکھ نہ سکی۔
"وہ واپس نہیں گئی ابھی تک؟"
"نہیں' ابھی تک تو ادھر ہی ہے مگر خوش نہیں لگتی۔"

"ظاہر ہے اس کا شوہر مرا ہے۔" وہ بظاہر لاپروائی سے کہہ کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔
"تم نے اس انگریز لڑکی کو دیکھا ہے بدر؟"
"لڑکی؟" بدر کو بس اس لفظ پہ حیرت ہوئی تھی۔ "ٹھاکر شیکھر کی ٹھاکرانی لڑکی ہے؟"
"ہاں۔" زہرہ ہنس دی۔ "اور اتنی حسین کہ تم دیکھتے رہ جاؤ۔"
"میں کیوں دیکھتا رہ جاؤں؟" وہ ناگواری سے شانے جھٹک کر رہ گیا۔
"نہیں بدر! اس کا واقعی شیکھر سے کوئی جوڑ نہیں تھا۔ شیکھر تو چالیس کے قریب تھا' سانولا سا' معمولی قد کا اور وہ تو مہارانی ہے' لوگ کہتے ہیں برطانیہ کی شہزادی ہے۔"
"ہو گی۔" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"مگر وہ خوش نہیں لگتی۔ وہ کہتی ہے اسے ٹھاکروں نے قید کر رکھا ہے اور اسے واپس انگلستان نہیں

جانے دے رہے۔"

"تو کس نے کہا تھا اسے راجپوتوں میں شادی کرے؟ کیا برطانیہ میں لڑکے ختم ہو گئے تھے؟ اب خود بھگتے۔" بدر نے اکھڑے اکھڑے انداز میں کہہ کر پیالی خالی کر کے رکھ دی۔ اس کے مغرور چہرے پہ تناؤ سا آ گیا تھا۔

"ہاں پتا نہیں اس نے شیکھر سے شادی کیوں کی۔"

"اور یہ پرانے قبرستان کا کیا قصہ ہے؟ تم کیوں گئیں ادھر؟" وہ ماتھے پہ بل ڈالے پوچھ رہا تھا۔ یہ حق جتاتا، رعب جماتا انداز زہرہ کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔

"مایا دیوی لے گئی تھی، کہتی تھی یہ کوئی انسان ہے جو بھوت کا ڈھونگ رچا رہا ہے اور ہم سب ایسے ہی ڈر رہے ہیں۔ وہ قبرستان دیکھنا چاہتی تھی۔ بس اسی کے ساتھ میں چلی گئی۔"

"زیادہ میل جول نہ رکھا کرو راجپوتوں کی عورتوں سے، یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

وہ خفگی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ زہرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس سے خاصا اونچا تھا، لمبا چوڑا وجیہہ مرد، جس کے ساتھ وہ خود کو ہمیشہ محفوظ تصور کرتی تھی، مگر جانے وہ واقعی اس کا پوچھتا تھا، یا چاچی خود ہی....؟ وہ سوچتے ہوئے اس کو لمبے ڈگ بھر کر دور جاتے دیکھتی رہی۔



روپ وتی بہت خاموشی سے برتن دھو رہی تھی۔ اس کا ذہن کہیں دور الجھا تھا۔

"روپا دیوی کدھر گم ہو؟" رتن بوا رسوئی میں آئی تو اسے یوں گم صم پانی میں ہاتھ ڈالے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"ہوں؟" روپا چونکی، پھر بے دلی سے سر نفی میں ہلا دیا۔ "کچھ نہیں رتن بوا۔"

"کسی نے کچھ کہا ہے؟" رتن بوا اس کے قریب آئی اور بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"بس بوا، مجھے مایا دیوی کی حالت پہ ترس آتا ہے۔"

"اے کیا ہوا مایا دیوی کو؟" رتن بوا آخری عمر میں بھی اپنی متجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی، مارے تجسس کے وہیں بیٹھ گئی کیونکہ روپا کا انداز اسے کچھ اور بتا رہا تھا۔

"بڑے ٹھاکر کی نظر ٹھاکر شیکھر کی جائیداد پہ ہے، اور وہ مایا دیوی کو حویلی میں محصور کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔"

رتن بوا ہکا بکا رہ گئی۔

"تجھے کس نے کہا؟"

"خود مایا دیوی کہتی ہے۔ شاید ٹھاکر اس کی زمین ہتھیانا چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ مایا دیوی کو واپس انگلستان نہیں جانے دے رہے۔"

"ہائے بھگوان! ایسے نہ بول روپا، ٹھاکر جیسے بھی ہیں ٹھاکرائی کو عزت دیتے ہیں، آخر وہ شیکھر کی دلہن تھی۔"

"تجھے بھی پتا ہے کہ ٹھاکر کیسے ہیں اور مجھے بھی پتہ ہے۔ اب تو دیکھنا بوا، یہ مایا دیوی کو کسی بہانے حویلی میں محصور کرنے کی کوشش کریں گے۔" روپ وتی دل کا بوجھ ہلکا کر کے مطمئن سی برتن دھونے لگی، جبکہ رتن بوا کو تو ہول اٹھ رہے تھے۔

انکشاف چھوٹا نہ تھا، گاؤں والے تو بس اتنا جانتے تھے کہ ٹھاکروں کے آپس کے تعلقات بہترین ہیں، مگر اب یہ نیا انکشاف خاصا خطرناک تھا۔ اگر ٹھاکر اپنی حویلی میں مایا دیوی کے خلاف کوئی سازش کر رہے تھے، تو یہ خبر ان کی برسوں کی ساکھ کو توڑنے کے لیے کافی تھی۔

رتن بوا کو اب جلد از جلد اپنے دل کا یہ بوجھ ہلکا کرنا تھا، سو اس نے فوراً ہی گھر جا کر اپنی بیٹی کو بتا دیا۔ جس نے چار مزید لوگوں کو اور یوں۔

شام تک آدھے بیلی راجپوتاں کو خبر مل چکی تھی کہ راجپوت اپنی انگریز بہو کی جان کے درپے ہیں اور اس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔



دروازے پہ مدھم دستک ہوئی۔
مایا نے بال سنوارتے ہوئے "آجاؤ" کہا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی ڈھیلی سی چوٹی گوندھ رہی تھی۔
دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔
روپ وتی نے چوکھٹ پہ کھڑے کھڑے اندر جھانکا

"مہارانی جی، بڑے ٹھاکر شام کی چائے پہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" چوٹی گوندھتے اس نے مصروف انداز میں محض سر کو جنبش دینے پہ اکتفا کیا۔
روپ وتی سر جھکائے دروازہ بند کرتی واپس پلٹ گئی۔
لمبی سنہری چوٹی اس نے گردن کے دائیں آگے کو ڈال دی، سفید ساڑھی کا پلو درست کیا، اور آئینے میں خود پہ ایک آخری نگاہ ڈال کر باہر آگئی۔
اپنی ازلی نزاکت سے زینے اتر کر وہ نیچے آئی تو ہال کمرہ خالی پڑا تھا، یقیناً ٹھاکر رگھوناتھ باہر برآمدے میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔
وہ سیڑھیوں سے اتر کر آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ سیڑھیوں کے اس طرف ایک بڑا سا پیانو رکھا تھا۔
مایا کسی معمول کی طرح اٹھتی پیانو تک آئی۔ اس کا کیس سیاہ لکڑی کا بنا تھا، اور اوپر دیوار پہ ہم رنگ لکڑی کا بنا بیضوی آئینہ نصب تھا۔
اس نے ہاتھ سے پیانو کی کیز کو ہلکا سا چھوا، پھر ایک ہی رو میں انگلی تمام کیز سے گزاری۔
خاموش فضا میں انوکھا سا راگ گونج اٹھا۔
مایا نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے آئینے میں اس کا عکس نمایاں تھا۔ بالوں میں پروئی موتیوں کی لڑی کے عین وسط میں لگی ایک بدصورت گرہ۔۔۔ اس کی انگلی خود بخود اس گرہ پہ جا ٹھہری۔
سامنے لگا آئینہ یک دم جیسے اسکرین بن گیا، ماضی کی ایک یاد فلم کی طرح اس پہ چلنے لگی تھی۔ اسے اس اسکرین میں ایک منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اونچی نیچی سی چڑھائی، سرسبز پہاڑی اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ اوپر چڑھتے دو نفوس اور پیچھے ڈلہوزی کا ڈوبتا سورج۔۔۔
"شام ہو رہی ہے، واپس چلنا چاہیے۔" وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس سرسبز پہاڑی پہ اوپر چڑھتے جا رہے تھے، جب **شیکھر** نے رک کر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔
"میں سورج ڈوبتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ آج ہماری ڈلہوزی میں آخری رات ہے، یہ ہمارے ہنی مون کا آخری غروب آفتاب ہے۔"
اس نے ہلکا پنک سوئیٹر پہن رکھا تھا، شہد رنگ بال شانوں پہ بکھرے تھے۔
"تمہیں ڈلہوزی اتنا پسند آیا کیا؟"
"نہیں، مجھے تم پسند آئے۔" اور دونوں ہنس پڑے۔
"ہم اگلی دفعہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔ اسے لگا اس نے کسی کی کراہ سنی ہے۔
شیکھر ہنستے ہوئے کچھ کہتے کہتے چند قدم آگے بڑھ گیا تھا، اسے ساتھ نہ پا کر پیچھے دیکھا۔ وہ وہیں کچھ کنفیوز سی کھڑی تھی۔
"آؤ نا ڈارلنگ! رک کیوں گئیں؟"
"ایسے ہی۔" وہ سنبھل کر مسکراتی دو قدم آگے بڑھی اور پھر سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
وہ دونوں ہنستے ہوئے، باتیں کرتے آگے بڑھتے رہے۔ اسی دوران مایا نے دوسرے ہاتھ سے سوئٹر کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر غیر محسوس انداز میں زمین پہ گرا دیا۔
سڑک عبور کر کے وہ دونوں اپنے بنگلے کے گیٹ کی طرف آگئے۔ وہاں قطار میں چند بنگلے بنے تھے جو دہلی، امرتسر اور بمبئی کے امراء کی ملکیت تھے جہاں وہ ہر سال چھٹیاں منانے آتے تھے۔
چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ **شیکھر** اندر داخل ہوا۔ مایا نے اس کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے جیب

میں ہاتھ ڈالا اور رک گئی۔
"میری الماری کی چابیاں' شیکھر!" اس نے پاکٹ الٹ دی۔ وہ خالی تھی۔
"کدھر گئیں؟" وہ بھی رک گیا۔
"اوہ۔ جس پتھر پہ ہم بیٹھے تھے' وہیں میں نے نکالی تھیں' ادھر ہی رہ گئی ہوں گی۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔"
وہ جانے کو پلٹی تو اس نے روکا۔ "میں بھی چلتا ہوں' اکیلی نہ جاؤ۔"
"اوہ ڈارلنگ! دو منٹ ہی تو لگیں گے۔ تم اندر جا کر فریش ہو لو' میں بس ابھی آئی۔" پھر جاتے جاتے مڑی۔ "اور اگر دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔"
"دیر ہو جائے گی کیا؟"
"بتایا تھا نا' میں ڈلہوزی کا ڈوبتا سورج دیکھنا چاہتی ہوں۔" مسکرا کر اس کا شانہ تھپتھپا کر وہ آگے سڑک پہ چلی گئی۔ شیکھر کشمکش میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا' پھر اندر کو ہو لیا۔
مایا تیز قدموں سے اس جگہ واپس آئی' جہاں اس نے چابیاں گرائی تھیں' جھک کر گچھا اٹھایا اور جیب میں ڈالتی نیچے اتر گئی۔
شام کی روشنی ابھی باقی تھی۔ سورج کی کرنیں ابھی تک درختوں سے لپٹی تھیں۔ وہ بغیر دقت کے دور دور تک دیکھ سکتی تھی۔
اب وہ سڑک سے اتر کر پہاڑی کی ڈھلان اترنے لگی۔ اسی جگہ کے آس پاس اسے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی تھی۔
وہ احتیاط سے سنبھل سنبھل کر پتھروں پہ قدم رکھتی' ادھر ادھر دیکھتی اتر رہی تھی۔ وہ جو بھی تھا' اسے ادھر ہی آس پاس ہونا چاہیے تھا۔
اور پھر وہ اسے نظر آ ہی گیا۔
چند درختوں کے بیچ گرا ایک نڈھال وجود۔
مایا آہستہ آہستہ درختوں کا سہارا لیے' خشک پتوں پہ قدم رکھتی اس تک آئی۔
وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ نڈھال سا گرا کراہ رہا تھا۔
وہ اس کے سامنے والے درخت کی اوٹ میں سے سر نکالے اسے دیکھنے لگی۔
پہلی نظر میں تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے ہوا کیا ہے۔ وہ ستائیس اٹھائیس برس کا خوش شکل مرد تھا۔ چہرے پہ ہلکی ہلکی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ بالکل زرد سا پڑ رہا تھا اور وہ مسلسل درد سے کراہ رہا تھا۔
"اے۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ اب درخت کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ زخمی نے شاید سنا نہیں تھا' وہ آنکھیں تکلیف کی شدت سے بند کیے کراہ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی' اور اس کا شانہ ہلایا۔
اس نے آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔
سنسان درختوں کے درمیان ایک دراز قد' سنہری چوٹی والی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔
"مسٹر! کیا ہوا ہے؟ کیوں بچوں کی طرح رو رہے ہو؟" وہ چہرے پہ ناگواری لیے پوچھ رہی تھی۔
وہ کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر شاید اس میں لمبی بات کرنے کا دم نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر مایا کو دیکھا اور دوسری نظر اپنے اوپر درخت کی لٹکتی شاخ پہ ڈالی۔
مایا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں سر اٹھایا۔
شاخ پہ ایک سیاہ رنگ کا سانپ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔
"اوہ۔" سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ بہت آرام سے جھکی اور ایک وزنی پتھر اٹھایا' پھر شاخ کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ سانپ نیچے آن گرا دوسرے ہی لمحے وہ بہت اطمینان سے وزنی پتھر سے اس کا سر کچل چکی تھی۔
"اب بتاؤ' کدھر کاٹا ہے تمہیں سانپ نے؟" وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گئی اور زخمی کا ہاتھ اس کی پنڈلی سے ہٹایا۔
وہاں ٹخنے کے قریب۔ سانپ کے کاٹے کا نشان تھا زخم بالکل تازہ تھا۔
"پہلی بات تو یہ کہ تمام سانپ زہریلے نہیں

ہوتے' سوڈرومت۔" اس نے رومال نکال کر زخم سے کچھ اوپر کس کر باندھ دیا' اور پھر زخم پہ اپنا چہرہ جھکایا۔

"کیا کر رہی ہو؟" زخمی گھبرا کر پیچھے ہونے لگا۔

"چپ رہو۔" وہ ناگواری سے جھڑک کر دوبارہ زخم پہ جھکی اور قدیم ویدوں کے سے انداز میں چوس کر زہر نکال لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے زخم کو صاف کر رہی تھی۔

"میں کسی کو بھیج کر تمہیں ہسپتال پہنچا دیتی ہوں' مگر تمہیں سونا نہیں ہے' سو گئے تو مر جاؤ گے۔ ویسے کس نے کہا تھا اس سمے ڈلہوزی کے جنگلوں میں بھٹکتے رہو۔" اس کے زخم کا آخری جائزہ لیتی وہ کہہ رہی تھی۔ زخمی کچھ کرب سے مسکرا دیا۔

"آپ بھی تو اسی سمے ادھر بھٹک رہی تھیں۔"

"مگر مجھے یہ سانپ نہیں کاٹتے۔"

"اچھا؟ وہ کیوں؟" وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا۔

"یہ جس نسل کا سانپ ہے' اس کے بارے میں جانتے ہو؟" اس نے سر کچلے سانپ کے جانب اشارہ کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا' نگاہیں مسلسل مایا کے چہرے پہ تھیں۔

"یہ ڈلہوزی اور شملہ میں پائے جانے والے خاص نسل کے سانپ ہوتے ہیں' اصل نام مجھے یاد نہیں' مگر ان کے بارے میں ایک صدیوں پرانا لیجنڈ مشہور ہے کہ یہ مہارانیوں اور مہاراجوں کو نہیں ڈستے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ میں بیلی راجپوتاں کی مہارانی ہوں' مجھے یہ نہیں ڈس سکتا تھا۔" وہ فخر سے مسکراتے ہوئے ہاتھ جھاڑتی اٹھنے لگی۔ "چلتی ہوں۔"

"نہیں رکو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر مایا کو روکنا چاہا' مگر وہ کھڑی ہو رہی تھی' اس کے ہاتھ میں موتیوں کی لڑی آ گئی۔ مایا اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

"میرا شوہر میرا انتظار کر رہا ہو گا' مجھے جانا ہے۔" اس نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

"میری جان بچانے کا شکریہ۔" لڑی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی' وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں ڈوب رہا تھا۔

"مگر مجھے روک کر تم میری جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے جیسے اس کی حالت سے محظوظ ہو رہی تھی۔ زخمی نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔"

"مجبوری ہے' مگر..." مایا نے اس کا ہاتھ لڑی سے ہٹایا' اور پھر جہاں اس شخص نے ہاتھ رکھا تھا' وہاں سے اس نے کھینچ کر ایک جھٹکے سے لڑی کو توڑ دیا۔ چمکتے دمکتے موتی نیچے گرنے لگے۔

جب چند موتی گر گئے تو اس نے وہاں پھر سے گرہ لگا دی۔ وہ نیم غنودگی اور نقاہت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جن پہ تم نے ہاتھ رکھا' وہ تمہارے ہوئے۔ یہ شاہی خاندانوں کا دستور ہوتا ہے۔" مٹی میں گرے وہ سارے موتی اس نے مٹھی بھر کر اٹھائے' بہت سی مٹی بھی ان کے ساتھ اس کے ہاتھ میں بھر گئی۔ ریت مٹی میں لتھڑے موتی اس نے اس شخص کی جیب میں ڈال دیے اور ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے جنگلوں میں بھٹک کر لوگوں کی جان بچانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے' نہ ہی مجھے تم سے کوئی ہمدردی ہے۔ مجھے ڈلہوزی کا ڈوبتا سورج دیکھنا تھا' جس کے لیے قدرت نے یہ بہانا بنا دیا۔ ہاں اوپر جا کر کسی کو نیچے بھیج دوں گی' اگر یاد رہا تو۔" وہ اسی بے نیازی سے کہہ کر مڑی اور واپس اوپر چڑھنے لگی۔

"سنو۔" اس نے پیچھے سے پکارا۔

مایا جیسے بادل نخواستہ رکی۔

"تم کون ہو؟" غنودگی میں ڈوبنے سے پہلے وہ بمشکل بول پا رہا تھا۔

درخت کی لکڑی پہ ہاتھ رکھے' مایا نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا "میں بیلی راجپوتاں کی ملکہ ہوں' اور کچھ نہیں۔" اس کی سنہری آنکھوں میں ڈوبتے سورج کا عکس جھلملا رہا تھا۔

وہ ابھی تک ایسے ہی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ

رہا تھا۔

"ویسے.... تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے غنودگی میں جانے سے قبل بس آخری دفعہ لب کھولے۔

"بدر.... بدر غازان۔" اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

مایا نے لاپروائی سے شانے اچکائے اور اپنے جوگرز کی مدد سے واپس اوپر چڑھنے لگی۔

بے دھیانی میں پھر سے اس کی انگلیوں نے پیانو کی کیز کو چھیڑا تھا۔ خاموش فضا میں پھر سے راگ گونج اٹھا' وہ جیسے چونک کر حال میں واپس آئی۔

قد آور آئینے میں اس کا عکس اب بھی وہیں تھا' جیسے کوئی خوب صورت تصویر ہمیشہ کے لیے امر کر دی گئی ہو۔

اس نے سر جھٹکا' ساڑھی کا پلو درست کیا اور اسی پر تمکنت انداز میں گردن اونچی اٹھائے باہر چلی آئی۔

برآمدے میں کرسیاں میز کے گرد بچھی تھیں' وہاں ٹھاکر رگھوناتھ اور گوپال بیٹھے تھے۔ مایا کو آتا دیکھ کر وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آئیے مایا دیوی۔"

وہ اسی سپاٹ چہرے کے ساتھ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ "چائے لیجیے۔" گوپال نے ایک پیالی اس کے سامنے کی۔ یہ وہ واحد عورت تھی جس کے لیے گوپال یہ سب کر سکتا تھا۔

"شکریہ۔" مایا نے پیالی اٹھالی۔

"مایا دیوی! آپ نے جائیداد بکوانے کی بات کی تھی۔" ٹھاکر رگھوناتھ نے گلا کھنکار کر گفتگو کا آغاز کیا۔ ان کا کپ ان کے سامنے ان چھوا رکھا تھا۔ "میں نے ایک دو فریقوں سے بات کی ہے۔ اس میں کچھ عرصہ لگ جائے گا۔"

وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی گرم چائے کے گھونٹ حلق میں اتارتی رہی۔

"نہر والی زمین خریدنے میں دو فریق دلچسپی رکھتے ہیں' میں ابھی ان سے معاملات طے کر رہا ہوں۔ کاغذات وغیرہ بھی تیار ہو رہے ہیں' پٹواری سے بھی بات کر لی ہے۔"

اس نے کپ خالی کر کے میز پہ رکھ دیا۔ اب وہ بہت توجہ سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"کچھ عدالتی کارروائی مزید ہوگی' جس کے لیے آپ کو واپس برطانیہ جانے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ مگر میری کوشش ہوگی کہ زیادہ تاخیر نہ ہو اور جیسے آپ چاہتی ہیں' ویسے ہی ہو۔ باقی جب تک آپ کی مرضی آپ حویلی میں رہیں' گاؤں میں گھومیں پھریں' زمین کے معاملات میں خود دیکھ لوں گا' آپ کو محض دستخط کرنے ہوں گے' کیا خیال ہے آپ کا؟"

"یہ بیلی راجپوتاں کے بھوت کا کیا قصہ ہے؟"

سوال ان دونوں کی توقع کے اس قدر برعکس تھا کہ ٹھاکر رگھوناتھ نے حیرت سے دیکھا۔

"بیلی راجپوتاں کا بھوت؟" وہ کیا پوچھ رہے تھے اور وہ کیا پوچھ رہی تھی۔

"جی' بیلی راجپوتاں کا وہ بھوت جو روز رات کو مسلمانوں کے پرانے قبرستان میں گھومتا پھرتا ہے۔"

"مسلمانوں کے پرانے قبرستان پہ سایہ ہے جی۔" گوپال ٹھاکر صاحب سے پہلے ہی بول اٹھا' کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہے' کافی عرصے سے رات کو گاؤں میں بھٹکتی پھرتی ہے' اب تو گاؤں والوں نے اس طرف جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"مگر میں نے سنا کہ بدر غازان کہتا ہے' وہ کوئی کرمنل ہے جو اپنے کسی جرم کا ثبوت مٹانے کے لیے بھوت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔"

"بدر غازان تو خود بھی...." کوئی موٹی گالی اس کے لبوں تک آتے آتے رکی' شاید اسے مایا کی وہاں موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ "وہ سایہ ہے جی' آپ مسلوں کی باتوں پہ مت جائیں۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ وہ سایہ ہے۔"

"انٹرسٹنگ۔" مایا گردن موڑ کر باغیچے کو دیکھنے لگی۔

"بہار کا موسم آ ہی گیا ہے' آپ کے بیلی راجپوتاں میں پھول بہت پیارے لگتے ہیں۔" وہ دلچسپی سے

پھولوں کو سراہتی کہہ رہی تھی۔ جائیداد کے معاملات اس کی معمولی سی توجہ کے بھی حامل نہیں تھے۔

ٹھاکر رگھوناتھ گہری سانس بھر کر پیچھے کو ہوگئے۔ کبھی کبھی مایا فرینڈس انہیں اسی طرح بہت بے عزت کردیا کرتی تھی۔



"بال بنادوں' مہارانی جی؟" روپا اسے بالکونی میں دیکھ کر اس طرف آگئی۔

وہ بالکونی میں کرسی ڈالے کتاب پڑھ رہی تھی۔ رخ سامنے کو تھا جہاں سنہری گندم کی تیار فصل کے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔

روپا کی آواز پہ اس نے سر اٹھایا۔ وہ ہاتھ میں کنگھا لیے منتظر کھڑی تھی۔ "ہاں' چوٹی بنادو۔" اس نے نگاہیں کتاب پہ جھکادیں اور ایک ہاتھ سے ڈھیلے سے جوڑے کی گرہ کھول دی۔ سارے بال کسی آبشار کی طرح کمر پہ گرتے چلے گئے۔

روپا بہت نرمی سے اس کے سنہری بال سمیٹنے لگی۔

مایا پھر سے کتاب میں منہمک ہوگئی تھی۔

"کل سویرے بڑے میدان میں ہمارا میلہ لگ رہا ہے۔" اس کے بال اکٹھے کرتے روپا کو اچانک جیسے یاد آیا۔

"اچھا۔" وہ کتاب پڑھتی رہی۔

"نیزہ بازی کا مقابلہ بھی ہوگا۔"

"ہوں۔" اس نے صفحہ پلٹایا۔

"پورے گاؤں کو اس مقابلے کا انتظار ہے' سال بھر سے۔ بڑا کانٹے دار مقابلہ ہوگا جی اس دفعہ۔" روپا اس کے بالوں میں کنگھا اوپر سے نیچے لارہی تھی۔ اس دفعہ مایا نے جواب بھی نہیں دیا۔

"چھوٹے ٹھاکر گوپال راج بھی حصہ لے رہے ہیں' اب تو اس مقابلے کی ہار جیت پہ بڑی بڑی شرطیں لگ چکی ہیں۔" وہ اب چوٹی گوندھ رہی تھی۔

"گوپال کی جیت پہ؟" بغیر دلچسپی سے محض روپا کا دل رکھنے کو مایا نے پوچھا۔

"نہیں دیوی جی' بدر غازان کی جیت پہ' گوپال تو اس سے پچھلے چار برس سے ہار رہے ہیں۔"

وہ کتاب بند کرکے ایک جھٹکے سے مڑی' چوٹی روپا کے ہاتھ سے پھسل گئی' سارے بل کھلتے چلے گئے۔

"بدر غازان گوپال کو ہراتا ہے؟" بے اختیار وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ہاں جی' پچھلے چار برسوں سے۔ چھوٹے ٹھاکر کو بہت غصہ ہے اس بات کا' اس دفعہ انہوں نے پوری تیاری کی ہے' بھری پنچائیت میں دعوا بھی کیا ہے کہ اس دفعہ وہ بدر غازان کو ایسی شکست دیں گے کہ اس کی اگلی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔"

"پھر؟"

"پھر بدر نے ایک محفل میں کہا' اس دفعہ جو شکست ٹھاکر گوپال رام کو ملے گی' اس کی اگلی کیا' پچھلی بھی سات نسلوں کو خبر مل جائے گی۔" روپا کہہ کر کھلکھلائی' پھر ایک دم سر جھکا کر خاموش ہوگئی۔

"میں جانتی ہوں تمہاری ہمدردی زہرہ کے چچازاد کے ساتھ ہے' اچھی بات ہے۔ میں یہ مقابلہ دیکھنا چاہوں گی۔ کب ہے؟"

"کل سویرے۔" روپا شہ پاکر جوش سے اسے تفصیلات بتارہی تھی مگر وہ کسی اور ہی سوچ میں ڈوبی کھڑی رہی۔



گاؤں کے بڑے میدان میں رنگ وبو کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ روایتی انداز میں سجا میلہ اور خوشی اور جوش چہروں پہ لیے سجے سنورے دیہاتی... وہ واقعی ان کا سب سے حسین تہوار تھا۔

مایا روپ وتی کے ساتھ بصد اصرار مقابلہ دیکھنے آہی گئی تھی۔

"یہ نیزہ بازی کیا ہوتی ہے روپا؟" وہ مقابلے میں دلچسپی لیے بغیر ساتھ موجود روپ وتی سے پوچھنے لگی۔

"وہ جی..." روپا ہچکچائی "وہ دیکھیں نا' ابھی آپ کو خود میں سمجھ آجائے گا۔"

اور اسی پل ایک طرف سے الہڑسی زہرہ نکل کر ان کے قریب آئی۔

"ٹھاکرائن' آپ بھی آئی ہیں مقابلہ دیکھنے؟" وہ اسے دیکھ کر حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

مایا نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔

اس نے آج بھی بے داغ اجلی سفید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آنکھوں کے گرد بہت گہرا کاجل ڈالا تھا' جیسے کالی رات میں چمکتا سورج۔۔۔

"بڑا کانٹے دار مقابلہ ہوگا جی آج۔" بڑے سے میدان میں بھاگتے گھوڑوں کو دیکھ کر زہرہ کہہ رہی تھی۔ آج تو اس کے چہرے پہ اور ہی رنگ بکھرے تھے۔

مایا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گھوڑے بھگاتے' نیزوں سے میخیں اکھاڑتے گھڑسواروں کو دیکھا اور پھر گہری سانس بھری۔

"یہ تو tent pegging ہے۔"

روپا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ "آپ کو اس کھیل کا علم ہے جی؟"

"ہاں' مگر میری نینی نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ tent pegging نیزہ بازی کو کہتے ہیں۔"

سامنے دو گھوڑے' ایک سفید اور ایک سیاہ بھاگتے آرہے تھے۔ سیاہ گھوڑا گوپال راج کا تھا وہ پہچان گئی تھی۔

"نیزہ بازی کا اوریجن مسلم فوجوں کی شب خون کی ٹیکنک تھی۔" جب وہ موڈ میں ہوتی تو بہت بولا کرتی تھی۔ "اس کھیل میں تو صرف میخیں گاڑی جاتی ہیں' پورے پورے خیمے نہیں لگائے جاتے' مگر در حقیقت "شب خون" میں مسلمان فوجیں رات کو دشمن کے سو جانے پہ اپنے تیز ترین گھڑسوار دشمن کی کمین گاہ میں بھیجا کرتی تھیں جو اپنے نیزوں کی مدد سے ان کے خیموں کے میخیں اکھاڑ دیتے تھے' پھر خیموں کو اکھٹا کر کے آگ لگادی جاتی تھی اور سویا ہوا دشمن۔۔۔"

بولتے بولتے وہ رک گئی۔ گوپال کے ساتھ والا سفید گھوڑا ابھی اس کے سامنے سے گزر کر گیا تھا۔ یہ چہرہ۔ اسے ڈلہوزی کے جنگل میں گرا زخمی یاد آیا۔

"یہ سفید گھوڑے پہ کون ہے؟"

"بدر ہے' میرے چچا کا بیٹا۔" زہرہ بہت مسرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

مایا کی نگاہیں دور تک سفید گھوڑے کے پیچھے گئی تھیں' گھڑسوار بہت مہارت سے اسے دوڑاتا اب میخیں اکھاڑتا جا رہا تھا۔

پھر جب نیزہ بازی کا مقابلہ ختم ہوگیا اور پانچویں برس بھی ٹھاکروں کے لڑکے کو مسلمانوں کے لڑکے نے شکست دے دی' اور تالیوں اور نعروں کا شور قدرے تھما تو کتنی ہی دیر بعد اس نے سفید گھوڑے کی لگام تھامے اس اونچے لمبے مغرور دکھنے والے نیزہ باز کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ شاید زہرہ کو دیکھ کر ادھر آگیا تھا۔

ان کے قریب آتے اس کے قدم سست پڑ گئے' وہ حیرت زدہ سا مایا کو دیکھ رہا تھا' پھر گھوڑے کی لگام تھامے آہستہ آہستہ چلتا ان تک آیا۔

"آپ؟" مغرور تنے ہوئے نقوش دھیمے پڑ گئے تھے' وہ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم سانپ کے کاٹے سے بچ گئے؟" مایا مسکرائی' وہی محظوظ سی مسکراہٹ۔۔۔

بہت چپکے سے ڈلہوزی کی ڈوبتی شام دونوں کے آس پاس اتر آئی تھی۔

"آپ۔۔۔ ادھر؟"

"تم نے مجھے پہچان لیا؟" وہ اس کی حیرت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"میں بیلی راجپوتاں کی ملکہ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟" وہ دھیما سا مسکرایا۔ شاید روپا ٹھیک کہتی تھی' وہ گاؤں کا سب سے وجیہہ مرد تھا۔

"بھولنا بھی نہیں چاہیے تھا۔"

"مگر آپ۔۔۔ ادھر؟" وہ چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس میں واحد گوری لڑکی ٹھاکر شیکھر راج کی بیوہ تھی' بظاہر وہ جیسے کڑیاں ملا رہا تھا۔ "آپ شیکھر کی۔"

"ہاں' میں مایا فرینڈس ہوں اور تم مجھے اچھی

طرح جانتے ہو۔"

"شیکھر راج اچھا آدمی تھا' گاؤں کے ساتھ مخلص تھا' اس کی موت کا افسوس ہوا۔" اس نے مایا کا آخری فقرہ نظر انداز کیا تھا۔

"شکریہ۔ مگر کیا دوسرے ٹھاکر مخلص نہیں جو تم نے آج گوپال کو پانچویں دفعہ ہرایا ہے؟"

"شکریہ۔" وہ بس ہنس دیا' پھر سفید گھوڑے کی پشت پہ ہاتھ پھیرا۔ "یہ ایک وفادار جانور ہے' اس نے بہت وفا نبھائی ہے میرے ساتھ۔"

"کبھی راجپوتوں کی حویلی آؤ' میں تمہیں گوپال کے ایسے تین گھوڑے دکھاؤں گی۔"

"آپ کبھی ملکوں کی حویلی آیئے' میں آپ کو اپنا پورا اصطبل دکھاؤں گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "ملکوں کی حویلی کس طرف ہے؟"

"آپ کی خادمہ آپ کو لے آئے گی۔"

"مگر میں نے تو نہیں کہا کہ میں آؤں گی۔"

بدر بے ساختہ مسکرا دیا۔ "آپ کوشش کیجئے گا' میں انتظار کروں گا۔"

"تم انتظار کرنا' مگر میں نہ وعدہ کرتی ہوں' نہ کوشش کروں گی۔" اعتماد سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر وہ جانے کے لیے پلٹی۔ "چلو روپا۔"

"سنئے۔"

مایا نے مڑے بغیر' محض گردن ترچھی کر کے عقب میں دیکھا۔

"میں انتظار کروں گا۔"

"ضرور کرنا۔" واپس جاتے ہوئے اس نے ایک نظر زہرہ کے تاریک پڑتے چہرے کو دیکھا' جو کتنی ہی دیر سے خاموش کھڑی تھی۔ آج پہلی دفعہ بدر نے گاؤں کی سب سے سندر لڑکی کو یوں نظر انداز کیا تھا۔

مایا اثر لیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ روپ وتی اس کے پیچھے تھی۔

وہ گھوڑے کی لگام ہاتھ میں تھامے اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

ڈی سوزا کی ڈوبتی شام کا فسوں ابھی تک باقی تھا۔



چوہدری منگل سنگھ کا تعلق گاؤں کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ وہ ذات کے راجپوت تھے۔ مگر امارت کے لحاظ سے ٹھاکروں سے کہیں کم۔ بہرحال گاؤں کے متوسط طبقے کے زمینداروں میں چوہدری منگل سنگھ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

منگل سنگھ کا پچھلے آٹھ ماہ سے ایک سکھ زمیندار سے جائیداد کا تنازعہ چل رہا تھا۔ یہ تنازعہ بیری کے ایک درخت کی ملکیت سے شروع ہوا تھا اور بڑھتے بڑھتے جانی دشمنی تک پہنچ گیا تھا۔ اس درخت کے دوسرے دعوے دار شوبھا سنگھ نے جس کی زمین منگل سنگھ کی زمین کے ساتھ ملی ہوئی تھی' بھری پنچائیت میں منگل سنگھ کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی۔

1939ء میں انگریز کے قانون کی عملداری کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ پے در پے سیاسی محاذوں پہ شکست کھا کر سرکار خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ ڈکیتی اور قتل کی وارداتیں عام سی بات بنتی جا رہی تھیں۔ ایک مہینے میں جائیداد کے تنازعے پہ دو' چار قتل ہو جانا تو اب معمول بن چکا تھا۔

اس رات شوبھا سنگھ کا ارادہ اسی معمول کو دہرانے کا تھا' معاملہ اب بیری کے درخت کا نہیں رہا تھا۔ شوبھا سنگھ نے سنا تھا کہ منگل سنگھ یار دوستوں میں بیٹھ کر کہتا ہے کہ "اگر شوبھا سنگھ نے درخت والی جگہ میرے حوالے نہ کی تو میں اس کی بہن کو اٹھا لوں گا۔"

شوبھا سنگھ کی بہن نرملتا جوان' خوب صورت عورت تھی۔ جب بات نرملتا پہ آئی تو شوبھا سنگھ کی غیرت نے جوش مارا اور اس نے بھری پنچائیت میں دعوا کیا کہ اگر منگل سنگھ باز نہ آیا تو وہ اس کا خون کر دے گا۔

مگر منگل سنگھ باز نہ آیا اور اس رات شوبھا سنگھ نہر کے کنارے گھات لگا کر منگل سنگھ کی تاک میں بیٹھ گیا۔ اسے علم تھا کہ منگل سنگھ آج اپنے بھائی کے گھر ہے' اور وہاں محفل جمی ہوگی' جسے چھوڑ کر وہ رات گئے

گھر واپس لوٹے گا۔ اسے ٹھکانے لگانے کا یہ وقت بہترین تھا۔

رات گہری ہو گئی تو منگل سنگھ اپنے بھائی کے گھر سے نکلا۔

پورا گاؤں خاموشی اور اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ گھروں کی بتیاں گل ہو چکی تھیں اور گاؤں کے مکین بستروں میں دبکے بے خبر سو رہے تھے۔

منگل سنگھ کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ مگر راستے میں کھیت پڑتے تھے اور آگے نہر تھی۔ نہر کے ایک طرف کچا راستہ تھا جو پرانے قبرستان سے ہو کر دوسرے گاؤں جاتا تھا' جبکہ دوسری جانب منگل سنگھ کے گھر کا راستہ تھا۔

وہ خاموشی سے کھیتوں کے درمیان بنی کچی پگڈنڈی پہ چل رہا تھا۔ سامنے نہر تھی اور اس طرف کچا راستہ جس کے ساتھ ساتھ درختوں کی باڑ لگی تھی۔

چلتے چلتے یونہی منگل سنگھ نے سر اٹھایا تو ایک دم اسے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ وہیں اپنے قدموں پہ رک گیا۔

درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ساتھ کوئی دبے قدموں کچے راستے پہ چل رہا تھا۔ منگل سنگھ شاید کبھی توجہ نہ دیتا' مگر اس شخص کا رخ پرانے قبرستان کی جانب تھا۔ اگر وہ کوئی دوسرے گاؤں جانے والا مسافر ہوتا تو اسے کسی سواری یا گھوڑے وغیرہ پہ ہونا چاہیے تھا' مگر وہ پیدل چل رہا تھا۔

"رات کے اس پہر کوئی شخص کیوں پرانے قبرستان جائے گا؟"

اس کے ذہن میں گاؤں والوں کی باتیں گونجنے لگیں۔

بیلی راجپوتاں کا بھوت۔

ایک چغہ پوش جو رات کو پرانے قبرستان کے آس پاس منڈلاتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہے اور روز رات کو کسی قبر کو پھاڑ کر نکلتی ہے اور پھر صبح ہونے سے قبل دوبارہ کوئی قبر کھود کر اندر خود کو دفن کر لیتی ہے۔ قبرستان میں کھدائی کے آثار تھے'

جس سے لوگوں نے شروع میں ہی قیاس ملا... کیا اور جیسے جیسے بات پھیلی گاؤں والوں نے راستہ تو اپنا دن میں بھی ادھر جانا چھوڑ دیا۔

وہ چغہ پوش کون تھا' کہاں سے آیا تھا اور پرانے قبرستان میں وہ روز رات کو کیا کرتا تھا' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

چوہدری منگل سنگھ کے ذہن میں انسان کا فطری تجسس بیدار ہوا۔ گھر جانے کا ارادہ ترک کر کے کچے راستے کی جانب بڑھ گیا۔

اس رات چاند نہیں نکلا تھا' تاروں کی روشنی میں منگل سنگھ کو وہ سیاہ ہیولہ یا سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں کے بیچ فاصلہ بہت زیادہ تھا۔

سایہ درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر دیکھتے احتیاط سے چل رہا تھا۔ منگل سنگھ دبے قدموں اس کے پیچھے چل دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کا تعاقب بھی اسی طرح کچھ فاصلے سے ہو رہا ہے۔

تاریک سایہ پرانے قبرستان کے قریب جا کر رکا' ادھر ادھر دیکھا اور لکڑی کا پھاٹک دھکیلا۔ وہ بھاری چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔

سایا اندر داخل ہو گیا۔ شاید ابھی تک وہ اپنے تعاقب میں آتے منگل سنگھ سے بے خبر تھا۔

منگل سنگھ پھاٹک کے اس طرف کھڑا چند لمحے سوچتا رہا۔

قبرستان میں اس وقت ہُو کا عالم تھا۔ دور دور تک پھیلی قبریں اور فطری خوف' ایک لمحے کو تو منگل سنگھ کے دل نے کہا کہ لعنت بھیجو اس پہ اور بھاگ چلو۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جی کڑا کر اس چغہ پوش کو بے نقاب کرنے کا تہیہ کر لیا۔ دور سے اس کو ٹھیک سے تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر ایک بات کا اسے چند منٹوں میں ہی یقین ہو گیا تھا کہ وہ سایہ کوئی انسان تھا' بھوت نہیں۔

سایا اب برگد کے گھنے بوڑھے درخت کے نیچے پہنچ چکا تھا' اس کے ہاتھ میں کدال تھی' اور اس کا ارادہ زمین کھودنے کا تھا۔

منگل سنگھ نے خود کو تسلی دی' واہ گرو کا نام لیا اور قبرستان میں قدم رکھ دیے۔

سایہ اب زمین پہ جھکا' لکیر کھینچ رہا تھا۔ اس کا سیاہ چغہ کافی کھلا سا تھا اور اس میں اس کی جسامت کا اندازہ نہیں ہو تا تھا۔ سر پہ چغے کی ٹوپی تھی اور اس کی منگل سنگھ کی جانب کمر تھی۔

منگل سنگھ آہستہ آہستہ چلتا چغہ پوش کے سر پہ پہنچ گیا۔ آہٹ تھی یا کوئی اور احساس' چغہ پوش نے بوکھلا کر پیچھے دیکھا۔

ٹوپی اس کے سر پہ تھی اور تاروں کی روشنی میں اس کا چہرہ واضح تھا۔ منگل سنگھ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

چغہ پوش نے ایک دم کدال چھوڑ دی اور بھاگ کر درخت کی اوٹ لی۔ ایک لمحے کو تو منگل سنگھ کو اس حرکت کی وجہ سمجھ میں نہ آئی' وہ بمشکل ہی اس شاک سے نکل پا رہا تھا کہ ایک دم وہ سایہ یوں غائب بھی ہو گیا تھا۔ منگل سنگھ بے اختیار درخت کی جانب لپکا' مگر اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ پاتا' کسی نے پیچھے سے کرپان کا وار کیا۔

پے در پے چند وار کر کے حملہ آور باہر کو بھاگ گیا' یہ یقینی تھا کہ حملہ آور نے وہ "بھوت" نہیں دیکھا تھا۔

دبے قدموں وہ سایہ درخت کی اوٹ سے نکلا اور قریب آ کر منگل سنگھ کا چہرہ دیکھا۔ وہ چند منٹ کا مہمان تھا' یہ اس کی حالت سے ظاہر تھا۔

"معاف کرنا مجھے تمہاری موت کا افسوس ہوا ہے' اگر تمہیں کوئی بچانے آ جائے تو اسے کہنا کہ آئندہ جو بیلی راجپوتاں کے بھوت کا پیچھا کرے گا اس کا انجام یہ ہی ہو گا۔"

چند لمحے بعد سایہ کچے راستے پہ گم ہو چکا تھا۔
منگل سنگھ ابھی تک پڑا کراہ رہا تھا۔



"مایا دیوی.... مایا دیوی۔" روپ وتی بھاگتی ہوئی بدحواس سی اس کے کمرے تک آئی۔

وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی بالوں کی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ شاید گاؤں میں مایا کے پاس کرنے کو اور کوئی کام نہیں تھا۔

"کیا ہو گیا روپا؟" چوٹی کے بل ڈالتے ہوئے اس نے تنقیدی نگاہوں سے خود کو آئینے میں دیکھا۔

"مایا دیوی.... وہ۔" بھاگنے کے باعث روپ وتی کی سانس چڑھ گئی تھی۔ "وہ چوہدری ہری سنگھ کا بیٹا.... وہ۔"

"وہ کیا؟" اس نے ہاتھ بالوں میں روک کر گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

"وہ چوہدری ہری سنگھ کے بیٹے کو بھوت نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی لاش پرانے قبرستان سے ملی ہے۔"

"کیا؟" وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بھوت نے قتل کر دیا؟ مگر کب' کیسے؟" وہ حیران پریشان سی کھڑی تھی۔

"رات کو کسی وقت جی۔"

"مائی گڈنیس۔" وہ حیرت سے کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ "دس از ٹیریبل۔ میں تو سمجھی تھی' وہ کوئی چور اچکا ہو گا' مگر....."

"وہ بھٹکی ہوئی آتما ہے جی۔ اب تو آ گیا نا آپ کو یقین؟"

"مگر روپا' قتل کیسے ہوا ہے؟ کیا گولی ماری ہے؟"

"پتا نہیں جی' پولیس کا کہنا ہے کہ کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا ہے۔ ابھی لاش کا وہ نہیں ہوا۔" وہ جیسے لفظ یاد کرنے لگی۔

"پوسٹ مارٹم؟" مایا نے فوراً کہا۔ روپ وتی سر ہلانے لگی۔

"مگر اس کا کیا ثبوت ہے یا تم لوگ کیسے یہ کہہ رہے ہو کہ قتل بھوت نے ہی کیا ہے؟"

"بدر غازان نے خود سنا ہے' مرتے سمے چوہدری منگل سنگھ نے بھوت کا ہی ذکر کیا ہے۔"

"بدر غازان؟" وہ بری طرح چونکی۔

"جی' ملکوں کا بیٹا' بدر غازان۔"

"وہ ادھر کیا کر رہا تھا؟" وہ تیزی سے بولی۔
"وہ ساتھ والے گاؤں سے واپس آ رہا تھا اپنے گھوڑے پہ' پرانے قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے منگل سنگھ کی چیخوں کی آواز سنی۔ وہ پہنچا تو منگل سنگھ کا آخری سانس تھا۔"
"اور آخری سانس میں منگل سنگھ نے پورے صفحے کا بیان بھی دے دیا؟"
"پتا نہیں جی میں نے تو منشی کرم دین سے سنا ہے کہ منگل سنگھ نے بدر غازان کو بھوت کا بتایا ہے' بدر کسی سے ذکر کر رہا تھا۔"
مایا شش و پنج میں مبتلا کھڑی اسے دیکھتے رہی' پھر سر جھٹک کر کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
"عجیب سی بات ہے۔ آدھی رات کو قبرستان میں قتل ہو جاتا ہے جو بقول تم لوگوں کے' کوئی سو کالڈ بھوت کرتا ہے اور پھر اتنا اتفاق کہ عین موقع پہ بدر غازان پہنچ جاتا ہے اور مقتول سے نزعی بیان بھی لے لیتا ہے۔" وہ مشکوک سی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔
"او نہوں' کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔"
"کیا غلط ہے مہارانی جی۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا۔"
"سوال یہ ہے کہ روپا کہ اتنی رات کو بدر غازان قبرستان میں کیا کر رہا تھا۔"
"چھوٹا ملک دوسرے گاؤں سے آ رہا تھا۔"
"کون چھوٹا ملک؟"
"بدر بابو۔ وہ دوسرے گاؤں سے آ رہا تھا۔" روپ وتی نے دہرایا۔
"پتا نہیں روپا' مگر بار بار میرے ذہن میں ایک شک سا ابھر رہا ہے۔" وہ کھڑکی کے باہر نگاہیں جمائے سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بند شیشے کے اس پار گاؤں کی زندگی رواں دواں تھی۔
"کیسا شک مایا دیوی؟"
"کہیں نہ کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔ یہ بدر غازان مجھے کچھ..." پھر گردن پھیر کر اسے دیکھا اور کہتے کہتے رک گئی۔ "کچھ نہیں تم جاؤ۔"
اور روپ وتی اس کی ادھوری بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی الٹے قدموں واپس مڑی۔
"سنو۔"
روپا جاتے جاتے پلٹی۔
"جی' مہارانی جی؟"
"یہ ملکوں کی حویلی کس طرف ہے؟"
"قریب ہی ہے جی' کھیتوں سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔"
"اچھا... ٹھیک۔ چلنا پھر میرے ساتھ۔"
"ابھی؟" روپا حیران ہوئی۔
"او نہوں۔" وہ پھر سے کھڑکی کے پار دیکھنے لگی۔
"کچھ دن تک چلیں گے۔" روپ وتی سر جھکائے کمرے سے باہر نکل آئی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے مایا کی دھیمی بڑبڑاہٹ اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔
"میں بھی دیکھتی ہوں' آخر کون سورما ہے۔ جو بھوت بن کر لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔" روپ وتی نے دروازہ بند کر دیا۔

✡ ✡ ✡

"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی اجے۔" اس کا کھانا برتنوں میں نکالتے ہوئے روپ وتی غمگین سی بولی۔ اس کی آواز میں کسی حسین خواب کے ٹوٹنے کا غم تھا۔
اجے نے برتن اپنی طرف کرتے کرتے رک کر اسے دیکھا۔ وہ کنفیوژڈ سی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔
"کیا بات سمجھ میں نہیں آ رہی؟" اجے شاید کھانا کھانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ روپا پریشان ہوا اس سے یہ برداشت نہ ہوتا تھا۔ وہ کئی برس سے روپ وتی کے ہمراہ حویلی میں ملازم تھا اور اس کی فطرت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ وہ آج بہت غم زدہ لگ رہی تھی۔
"ایک بات تو بتاؤ۔" اس نے جیسے اجے کا سوال سنا ہی نہیں تھا۔ "تمہیں کس نے کہا کہ بدر بابو نے منگل سنگھ کے منہ سے بھوت کا ذکر سنا ہے۔"
"منشی کرم دین سے۔"
"تمہیں منشی کرم دین کی بات پہ کتنا اعتبار ہے؟"

"وہ راست گو انسان ہے' میں اسے عرصے سے جانتا ہوں۔ مگر۔۔۔"
"کیا منشی کرم دین کو بدر غازان نے خود یہ بات بتائی ہے؟"
"نہیں' وہ کسی سے کہہ رہا تھا' منشی نے سنا ہے۔"
"کیا منشی جھوٹ نہیں بول سکتا ہے؟"
"منشی کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟" روپا کے سوال اب اجے کو پریشان کر رہے تھے۔
"مگر ہو سکتا ہے بدر غازان نے مرتے سمے منگل سنگھ سے بات ہی نہ کی ہو۔"
"اس نے خود تھانے دار کو بتایا ہے کہ اس نے منگل سنگھ کے منہ سے کیا سنا ہے۔"
"کس نے؟"
"چھوٹے ملک نے۔" روپا ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔
"چھوٹے ملک نے خود یہ بیان دیا ہے' تھانے دار کو اجے؟"
"ہاں روپا' مگر ہوا کیا ہے؟"
"سوال یہ ہے کہ اجے کہ چھوٹا ملک اس وقت قبرستان میں کیا کر رہا تھا؟"
"مگر تم سے یہ سوال کس نے کیا ہے؟"
"کسی نے بھی کیا ہو' کچھ گڑبڑ تو ہے نا اجے۔"
"کیا گڑبڑ ہے اس میں۔ چھوٹا ملک سفر سے لوٹا تھا' دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔" روپ وتی نفی میں سر ہلاتی' گردن جھکائے برتن سمیٹنے لگی۔
"بس اجے! یہ بدر غازان اتنا اچھا آدمی ہے نہیں جتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔" اس کی آواز میں دکھ بھرا تھا۔
"وہ اچھا آدمی ہے روپا' تم راجپوتوں کی باتوں میں نہ آؤ۔"
"پر مایا دیوی راجپوت نہیں ہیں۔" وہ بے اختیار بولی۔
"تو یہ سب تم سے مایا دیوی نے کہا ہے؟"
وہ کہنا نہیں چاہتی تھیں' سو انہوں نے بات لبوں پہ روک لی۔"

"لیکن مایا دیوی ایسی بات کیوں کریں گی؟" اجے سوچ میں پڑ گیا۔

"کوئی تو بات ہو گی اجے۔"

"چھوڑو روپا' مایا دیوی کو گاؤں کے لوگوں کا کیا پتا۔ انہیں تو باہر دو قدم تک جانے کے لیے تمہارا سہارا چاہیے ہوتا ہے' انہیں حویلی سے باہر گاؤں کے رستے تک تو پتا نہیں' یہاں کے معاملوں کا کیا پتا ہو گا۔"

مگر روپا مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"کچھ تو ہے اجے۔" پھر سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔



"بدر غازان سے ملنا ہے۔" بس اسے اتنا کہنا پڑا اور ملکوں کے ملازم پورے پروٹوکول سے اسے اور روپا کو مہمان خانے میں لے آئے۔ یقیناً" بدر نے ٹھاکر شیکھر کی بیوہ کے لیے کوئی خصوصی ہدایت دے رکھی تھی۔

ملکوں کی حویلی مایا کی توقع سے بڑھ کر عالی شان اور خوب صورتی سے آراستہ تھی۔ اس کی آرائش و زیبائش میں جدید انگریزی طرز کی جھلک تھی۔ شاید اس لیے کہ بدر غازان انگلستان سے پڑھ کر آیا تھا اور اس نے ایک دیہی حویلی کو دہلی کے کسی انگریز اعلا افسر کے بنگلے کی طرز پہ آراستہ کر لیا تھا۔

"آپ اندر تشریف رکھیے' چھوٹے ملک ابھی آتے ہیں۔"

"وہ ہیں کدھر؟" مایا نے واپس مڑتی ملازمہ کو روک دیا۔

"اپنے اصطبل میں ان کا گھوڑا بیمار ہے' امرتسر سے ایک ڈاکٹر کو بلایا ہے' ابھی اسی کے ساتھ ہیں۔"

"روپا! تم یہیں ٹھہرو' میں وہیں چلی جاتی ہوں۔"

وہ ملازمہ کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر باہر نکل آئی۔ اصطبل حویلی کی پچھلی طرف تھا' اسے اچھا خاصا چلنا پڑا تھا۔

ملازمہ اسے اصطبل کے احاطے کے آغاز پہ چھوڑ کر چلی گئی۔

اصطبل خاصا وسیع تھا۔ تین اطراف میں گھوڑے قطاروں میں بندھے تھے۔ وہ چوکھٹ پہ کھڑی سامنے دیکھنے لگی' جہاں بدر مخالف سمت سے ایک ملازم کے ہمراہ چلتا آ رہا تھا۔

شاید وہ ابھی ابھی گھوڑے کا معائنہ کر کے ہٹا تھا۔ آستینیں فولڈ کر کے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں اور وہ مسلسل قدرے برہمی سے ملازم کو کچھ کہہ رہا تھا' تب ہی اچانک ۔۔۔ اس کی نگاہ چوکھٹ میں پاؤں تک آتا لمبا سا سفید فراک پہنے اس لڑکی پہ پڑی۔ وہ بولتے بولتے رک گیا۔ چہرے پہ خوش گوار حیرت اتر آئی تھی۔

ملازم کو جانے کا کہہ کر وہ ہاتھ جھاڑتا اس کی طرف آیا۔

"آپ؟" وہ ابھی تک حیران تھا۔

"ہاں' میں!" وہ کہہ کر بے نیازی سے ادھر ادھر بندھے گھوڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ اس کے فراک کی آستینیں کافی چھوٹی تھیں اور دودھیا سنہری بازو دھوپ میں مزید سنہری لگ رہے تھے۔

"مجھے خوشی ہوئی کہ آپ مجھ سے ملنے آئیں۔"

"مگر میں تو اصطبل دیکھنے آئی ہوں۔" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ مایا کی برجستگی اسے محظوظ کرتی تھی۔

"تو پھر میں آپ کو اصطبل دکھاتا ہوں۔ انہیں دیکھ کر راجپوتوں کے گھوڑے بھول جائیں گی آپ۔"

"بہت لگتی ہے تمہاری راجپوتوں کے ساتھ؟" وہ دونوں باڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

"معذرت کے ساتھ' مگر ٹھاکر رگھوناتھ کا خاندان اس گاؤں کے ماتھے پہ بہت بڑا کلنک ہے۔"

"مگر میں نے تو گاؤں میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔"

"آپ نے ابھی گاؤں دیکھا ہی کہاں ہے؟" وہ مسکرا کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ وہ شانے اچکا کر آگے بڑھ گئی۔

بدر وہیں کھڑا رخ پھیرے اسے دیکھنے لگا۔
"تمہارے اور ٹھاکروں کے درمیان جھگڑے کی وجہ کیا ہے؟" وہ جھک کر ایک گھوڑے کی پیشانی پہ نرمی سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔
"وہ ہندو ہیں مایا دیوی' اور ہم مسلمان۔ وہ dominant ہیں اور اسی ____ حاکمیت کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پہ ظلم کرتے ہیں' مگر پچھلے کافی عرصے سے ان کو یہ ہمت نہیں ہوئی۔"
"ہوئی تو نہیں' لیکن ____" گھوڑے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ "کیا ہو گی بھی نہیں؟"
"جب تک بیلی راجپوتاں کا بدر غازان زندہ ہے' انہیں یہ ہمت نہیں ہو گی۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔
"بیلی راجپوتاں کا بدر غازان! دلچسپ نام ہے' کیا مطلب ہوا اس کا؟" وہ قطار میں بندھے گھوڑوں کو دیکھتے آگے چلتی جا رہی تھی۔
"بیلی کا مطلب مجھے معلوم نہیں' راجپوتاں' البتہ یہاں کے سرکردہ راجپوت خاندان کے حوالے سے ہے جیسا کہ عموماً" پنجاب کے دیہاتوں کے نام ہوتے ہیں۔ انگریز سرکار نے اس کا نام بدل کر کچھ اور کر دیا ہے' مگر ہم اسے اسی پرانے نام سے پکارتے ہیں۔"
"مگر میں تو تمہارے نام کی بات کر رہی تھی۔" وہ بے اختیار ہنس دیا۔
"میں سمجھا اگر آپ یہاں محض اصطبل دیکھنے آئی ہیں تو نام میں دلچسپی بھی بس بیلی راجپوتاں تک محدود ہو گی۔"
"اصطبل بھی تو تمہارا ہے۔" وہ اب ایک گھوڑے کے نسواری بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی۔
"شکریہ۔ غازان میرے دادا کا نام تھا' ان کا انتقال میری پیدائش کے روز ہوا تھا' اسی لیے میرے ابا جی نے میرے نام کے ساتھ ان کا نام جوڑ دیا۔"
"اور اس کا مطلب؟"
"اگر مجھے علم ہوتا کہ بیلی راجپوتاں کی ملکہ کبھی مجھ سے یہ سوال کرے گی تو میں اس کا مطلب جاننے کی کوشش ضرور کرتا۔"
"تم اب بھی کر سکتے ہو۔" وہ نیچے بیٹھی جھک کر ایک مریل سے گھوڑے کو دیکھ رہی تھی۔ "یہ مجھے بیمار لگ رہا ہے۔"
"یہ بیمار ہے' اسی کے لیے ابھی ڈاکٹر بلایا تھا' ویسے سانپوں کے علاوہ گھوڑوں کو بھی بہت پہچانتی ہیں آپ۔" وہ چلتا ہوا اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔
"کافی چہرہ شناس ہیں آپ۔"
"چہرہ نہیں' یہ آنکھیں ہوتی ہیں جو دل کا حال بتاتی ہیں۔"
"انسانوں کی آنکھیں پڑھ لیتی ہیں' مادام؟"
وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"بہت اندر تک۔"
"اور اپنی آنکھیں؟"
"وہ میں پڑھنے نہیں دیتی۔"
اور بدر نے دیکھا' اس کی سنہری آنکھیں آج بھی بے تاثر تھیں۔ کوئی سوچ' کوئی خیال' کوئی نفرت' کوئی محبت' کوئی جذبہ نہیں تھا ان میں۔
"ایک بات تو بتاؤ۔" وہ پھر سے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔ "یہ چوہدری منگل سنگھ کا قتل کس نے کیا ہے؟"
"بیلی راجپوتاں کے بھوت نے۔"
"میں نے سنا ہے اس نے نزعی بیان تمہیں دیا ہے۔"
"آپ نے درست سنا ہے۔" وہ چلتے چلتے اصطبل کے کھلے دروازے تک آ گئے تھے۔
"تو کیا واقعی منگل سنگھ نے اعتراف کیا ہے کہ اسے مارنے والا بھوت تھا؟"
"نہیں۔" وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ "تو پھر؟"
"وہ بھوت نہیں ہے مایا دیوی' وہ انسان ہے' جو بھوت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ مجھے اس کا نام منگل سنگھ نے بتا دیا ہے۔" وہ دروازے کی چوکھٹ پہ ہاتھ رکھے اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

نادیہ جہانگیر

بھیگے موسم کی رُت نرالی

بھائی سے جھگڑ کر وہ بہت غصے کے عالم میں گھر سے نکلا تھا۔ تب موسم اتنا خراب نہیں تھا مگر حامد کے ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے محسوس کیا تھا کہ باہر بارش شروع ہو گئی ہے ہوٹل کے عقبی شیشے کی دیوار پہ پھسلتے بارش کے قطروں کو اس نے ایک ہی نظر دیکھا تھا اس پہ جھنجلاہٹ طاری ہو گئی پھر حامد کی طرف متوجہ ہوا۔ جس نے اس کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"بارش شروع ہو گئی ہے۔"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔" وہ کپ میں تیرتی چائے کو دیکھنے لگا تھا۔

"آج گھر جانے کا کیا موڈ نہیں ہے؟" ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے جگری یار حامد نے اس سے پوچھا تو وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

"بھابی کی باتیں میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہیں حامد......"

"تو تو ہی مان لے ان کی بات......"

"مان کیسے لوں یار...! نوکری حاصل کرنا کیا میرے اختیار میں ہے' کوئی خوشی سے میں فارغ نہیں پھر رہا' تجھے کیا لگتا ہے خالی جیب رہنے کا مجھے شوق ہے۔ بات بات کے لیے بھائی کے سامنے ہاتھ پھیلانا مجھے اچھا لگتا ہے کیا میں اتنا بے غیرت تجھے نظر آتا ہوں۔" حامد کی توقع کے عین مطابق وہ بھڑک ہی تو اٹھا تھا کہ حامد نے بے اختیار اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ڈونٹ بی ایموشنل یار...... ریلیکس۔"

"کیا کروں میں کیا کروں...... بھابی کی باتیں اور ان کے طعنے میری برداشت سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔"

بے حد مشتعل لگ رہا تھا وہ' بے حد بھڑکا ہوا مگر حامد نے اس کے ہاتھ سے ہاتھ نہ ہٹایا۔

"اس سب کے باوجود میں تمہیں ہمیشہ کی طرح ایک ہی نصیحت کروں گا سمیع حمزہ!" اس کا اتنا کہنا تھا کہ سمیع حمزہ نے فوراً "اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچ لیا۔

"تو اگر سب اچھا چاہتا ہے تو سنجیدہ ہو جا' سنجیدگی سے اپنا کیریئر بنا' سنجیدگی سے جاب ڈھونڈ یہ نہیں کہ تجھے اسٹاف پسند نہیں آیا' تو نے نوکری نہیں کرنی' باس اچھا نہیں تو نے ہاتھ میں آئی نوکری کو ٹھوکر مار دی آفس کی لڑکیاں غیر سنجیدہ سی ہیں تو وہاں سے غصے سے فائل اٹھا لایا۔ نہ میرے بھائی نہ..... ایسے نوکری نہیں ہوتی یہ۔"

"تو اپنی بکواس اپنے پاس ہی رکھ....." اس نے گھور کر حامد کو دیکھتے ہوئے ڈپٹا۔

"پھر ہو چکی تیری نوکری تو ہو چکا کامیاب۔" حامد نے تمسخر سے اسے دیکھا تب ہی اس کے موبائل کی بپ بج اٹھی..... اور اسکرین پر "انوشہ" کا نام جگمگانے لگا..... حامد کے لبوں پر اک پیاری سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بھابی یاد کر رہی ہیں..... اس نے اس کی مسکراہٹ سے اخذ کیا تو حامد نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور موبائل اٹھا کر اسے "دو منٹ" کہتا ایک طرف ہو گیا۔

"گھر بلا رہی ہیں؟" وہ جب فون سن کر واپس اس



کے پاس آکر بیٹھا تو اس نے پوچھا۔ حامد نے دلفریب سی مسکراہٹ کے ساتھ پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"کہتی ہے بارش تیز ہو جائے گی' جلدی سے گھر آجائیں۔" سمیع حمزہ نے حامد کے لہجے میں اپنی بیوی کے لیے گہری محبت محسوس کی تو گہرا سانس لے کر چائے کا کپ اٹھالیا۔

"یار سمیع! تیرا دل نہیں کرتا کہ تیرا بھی اک پیارا سا گھر ہو' اک پیاری سی بیوی ہو' جو تجھ سے محبت کرتی ہو' تیرا خیال خود سے بڑھ کر رکھتی ہو......"

"چھوڑ یار...... ایویں فضول......" اس نے سختی سے کہنا چاہا تھا مگر لہجہ کمزور ہو گیا۔

"سمیع! سنجیدہ ہو جا یار! کیوں اس طرح لاپروا سا بنتا ہے' میں جانتا ہوں تیری بھی خواہش ہو گی کہ تیرا بھی کوئی جیون ساتھی ہو' تجھے چاہنے والا' تجھ سے محبت کرنے والا' تیری فکر' تیرا خیال کرنے والا......"

"تو بھابی کا فون سن کر زیادہ ہی بہک رہا ہے......

چل اٹھ دفع ہو جا گھر..... وہ انتظار کر رہی ہوں گی تیرا
۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے چائے کا کپ وہیں
واپس رکھ دیا اور خود بھی اٹھ کر کھڑا ہوا۔
اس نے کرسی کی پشت پہ پڑی اپنی مردانہ چادر
اٹھائی اور کندھوں پہ ڈالنے لگا۔ حامد سر اٹھا کر اس کو
دیکھنے لگا۔
"کہاں جاؤ گے؟"
"فی الحال گھر نہیں۔" زخمی سی مسکراہٹ کے
ساتھ وہ مسکرایا۔
"تو پھر.....؟"
"رب جدھر لے گیا۔" وہ ہنسا۔
"میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"
"اس موسم میں، میں خوامخواہ کباب میں ہڈی نہیں
بننا چاہتا۔ جا تو بارش کا مزہ لوٹ، بھابھی کے پاس جا ان
کو رنگین بنا۔"
"بکواس نہ کر یار! تو چل میرے ساتھ۔" حامد نے
ڈپٹ کر اسے بازو سے پکڑا جو اس نے آہستگی سے چھڑا
لیا۔
"نہ یار تو جا، ہو سکتا ہے میں گھر ہی چلا جاؤں۔"
اس نے کہا تو تھا مگر حامد اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کم از کم
آج گھر نہیں جائے گا۔



تیز بارش کی وجہ سے اندھیرا اچھا خاصا ہو رہا تھا۔ وہ
یونہی بے مقصد سڑک پہ چلنے لگا، بارش تیز تھی ہوا کا
زور بھی ٹھیک ٹھاک تھا..... اس کے قدم ڈگمگانے
لگے۔ مگر پھر بھی اس نے گھر کی طرف جاتی سڑک کے
لیے قدم نہ موڑے اور بہت آگے نکل آیا۔
آج بھی بالکل عام سی بات پہ بھابی اس پہ بگڑی
تھیں وہ جاب کے لیے انٹرویو دے کر بہت لیٹ گھر آیا
تو بھوک سے برا حال تھا، عصر کی اذانیں ہو چکی تھیں مگر
بھابھی ابھی تک اپنے کمرے میں بند تھیں..... اس
نے کچھ دیر تو لاؤنج میں بیٹھ کر ان کے باہر نکلنے کا انتظار
کیا مگر پیٹ میں چوہے اتنی تیزی اور پھرتی سے دوڑ
رہے تھے کہ اس سے مزید انتظار کرنا محال ہونے لگا،
تبھی بہت غصے سے اس نے بھابی کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔
ایک بار کھٹکھٹایا..... دوسری بار کھٹکھٹایا..... مگر بھابی
نے کھولنے کا نام نہ لیا..... شدید بھوک تھی جس کی
وجہ سے خوامخواہ کا اشتعال آ گیا اور اس نے بہت غصے
سے دروازہ تقریباً "پیٹ ڈالا"..... اور اگلے ہی لمحے بھابی
باہر تھیں..... لال انگارہ، شرارے برساتی آنکھیں
لیے.....
"کیا تکلیف ہے کون مر گیا ہے تیرا؟" بے حد غصے
سے بھابی نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔
"بھوک لگی ہے مجھے۔" اس نے بھی ترش تیز
آواز میں کہا تھا۔
"تو زہر کھا لے..... میرا کیوں دروازہ پیٹ رہا ہے
۔"
"بدقسمتی سے آپ ہی اس گھر کی خاتون خانہ
ہیں، سو یہ چارج آپ کے ہاتھ میں ہے۔" اس
نے بھی انہی کے لہجے میں کہا تو بھابی کو آگ لگ گئی۔
"نا..... تو میرا کون سا سگا ہے جس کے لیے میں
سارا دن چولہا چکی کرتی پھروں پھر تیرے آنے کا انتظار
کروں..... اور تیرے منہ میں نوالے ٹھونسوں....."
دروازے میں ہی کھڑے کھڑے انہوں نے غصے سے
کہا تو اس نے جواب دینے کی بجائے بحث کو سمیٹنا چاہا
۔
"فضول باتیں چھوڑیں بھابی، مجھے کھانا دیں۔"
"کہاں سے کھانا دوں..... کون سی تنخواہیں تو
میرے ہاتھوں پہ لا کر رکھتا رہتا ہے کہ وقت بے وقت،
تیرے ٹھونسنے کا میں انتظام کرتی پھروں۔"
"بھابی پلیز..... مجھے بھوک لگ رہی ہے، جو بھی
ہے کھانے کو دیں۔" اسے واقعی شدید بھوک لگی ہوئی
تھی جو وہ لڑنے کے بجائے بحث سمیٹ رہا تھا۔
"کچھ بھی نہیں بنایا آج۔" وہ تیز لہجے میں بولیں۔
"نہیں دیتا کھانا.....؟" اس نے گرج کر انہیں ٹوکا
۔ وہ وہیں چپ ہو گئیں۔
"کچھ ہو تو دوں گی نا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ سیدھی طرح میری بات نہیں مانیں گی۔" آہستہ اور کافی نرم سے لہجے میں پوچھ کر وہ واپس پلٹا اور بجلی کی سی تیزی سے کچن میں گھستا چلا گیا۔

اس سے پہلے کہ بھابی اس کے پیچھے بھاگتیں اس کے ہاتھ جو کچھ لگا اس نے اٹھا اٹھا کر باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ سارا گھر برتنوں کی چھن چھن سے گونج اٹھا' کچھ برتن ٹوٹے کچھ دہرے ہوئے اور کچھ دائیں بائیں لڑھکتے چلے گئے۔

بھابی دروازے میں حیرت کا بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئیں اور وہ اپنا کام کر کے فارغ ہو کر باہر نکل آیا' تب بھابی نے اسے دیکھا اور پھر جو شروع ہوئیں وہ وہی جانتا تھا یا اس کا خدا۔

گھر سے سیدھا وہ حامد کے پاس آیا تھا اور اب وہاں سے اٹھ کر ان گیلی سڑکوں کی خاک چھان رہا تھا۔ آج کا دن بہت بے کیف تھا۔

اپنے ہی خیالوں میں مگن وہ چلتا آگے ہی آگے جا رہا تھا کہ ایک دم سے اس کی نظر سامنے سڑک پہ بیٹھے وجود پر پڑی ..... کوئی بوڑھا تھا۔ جو یقیناً" بارش میں پھسلنے کی وجہ سے گر گیا تھا۔

وہ تیز تیز ڈگ بھرتا اس شخص تک پہنچا اور اس کو سیدھا کھڑا کیا۔

باریش داڑھی والے شخص نے تشکر سے اسے دیکھا۔

"بابا کہاں جانا ہے آپ کو.....؟" اس نے نرمی سے اس نحیف و کمزور بوڑھے شخص سے پوچھا' جو سیدھا کھڑا ہونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کیونکہ ہوا تیز تھی اور بوڑھے کے قدم اکھڑ اکھڑ جا رہے تھے۔ اس نے انہیں سہارا دے کر گویا انہیں محفوظ ہونے کا احساس دلایا تھا۔

"بس بیٹا یہ سڑک پار۔" تیز بارش کی آواز میں بوڑھے شخص کی نحیف سی آواز وہیں دب کر رہ گئی۔

"آیئے..... میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔"

اتنے خراب موسم میں اس شخص کو یہ سہارا غنیمت محسوس ہوا تو وہ اس کے بازو کے سہارے چلنے لگا۔ راستے میں بتایا کہ ان کا نام سعید جمال ہے۔

بارش ہنوز جاری تھی' چھاجوں چھاج مینہ برس رہا تھا' تیز بارش میں چلتے چلتے کوئی آٹھ نو منٹ لگے ہوں گے کہ ان کا گھر آگیا..... انہوں نے دروازے پہ دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا' ان کے کہنے سے پہلے ہی اس نے دروازے کو زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔ اندر سے دوڑنے کی آئی تھی اور کوئی بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا۔

"با' با.....؟" نسوانی آواز نے تصدیق چاہی تھی۔ سمیع حمزہ کا دل اندر سے آئی' آواز کے سحر میں ڈوب کر ابھرا۔

"ہاں بیٹی کھولو دروازہ۔" اور کھٹ سے دروازہ کھل گیا۔ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ اک اجنبی مرد کو دیکھ کر تیزی سے پیچھے ہٹی۔

"ٹھیک ہے جی' آپ جائیں اندر' میں چلتا ہوں۔" وہ لڑکی کی جھجک محسوس کرتے ہی پیچھے ہو گیا مگر اس شخص نے سرعت سے اس کا بازو پکڑا۔

"بیٹا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ میرے گھر تک آکے یونہی بغیر کچھ کھائے پیئے واپس ہو جاؤ۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا' اس تکلف کی ضرورت نہیں۔" اس نے انکار کرنا چاہا مگر سعید جمال نے پُرشفقت انداز سے ساتھ لپٹا لیا۔

"بیٹا صرف ایک کپ چائے۔" اور وہ اتنی محبت سے کہے کو ٹال نہ سکا اور ان کے پیچھے قدم بڑھا دیے چھوٹا سا صحن تھا' بارش کے پانی سے تر بتر ہوا..... لڑکی دوڑ کر برآمدے تک پہنچ چکی تھی..... وہ دونوں بھی آہستہ آہستہ چلتے برآمدے تک پہنچے تو اسی نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا..... اندر اندھیرا تھا..... سعید جمال نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کرنا چاہی مگر لڑکی نے تیزی سے باپ کو پیچھے کیا۔

"بابا' کرنٹ لگ جائے گا....." کہنے کے ساتھ ہی لڑکی نے خود لائٹ آن کی' پیلی سی ملگجی سی لائٹ نے اندر کوئی خاص روشنی نہ کی۔ سمیع نے دانستہ لڑکی کی

طرف دیکھنے سے گریز کیا۔
"بابا آپ تو سارے کے سارے بھیگے ہوئے ہیں۔" لڑکی نے تفکر سے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ وہ چونک کر اس متفکر سی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ سیاہ کپڑوں میں نہاتی چاندنی..... اس کا دل دھڑک اٹھا۔
"بیٹا بارش تھی بھیگتا کیسے نا۔" ازراہ مذاق اس کے بابا نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا تو سمیع حمزہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ دائیں بائیں اپنے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے لگا کیونکہ اس کے کپڑے مکمل طور پر بھیگے ہوئے تھے یا شاید وہ لڑکی کو نظرانداز کرنے کی سعی کرنے لگا تھا۔
"بیٹا بیٹھ جاؤ۔"
وہ میرے کپڑے۔" وہ جھکا' لڑکی چونک کر اسے دیکھنے لگی' وہ خجل سا نظر آرہا تھا۔
"کوئی بات نہیں' آپ جہاں چاہیں بیٹھو۔" سعید جمال نے بہت اپنائیت سے کہا تو اس کو دروازے کے پاس پڑی کین کی کرسی نظر آئی..... تبھی اس لڑکی کی بھی نظر اسی کرسی پر پڑی تھی..... وہ تیزی سے آگے بڑھی اور کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس لے آئی۔ وہ تشکر سے اسے دیکھنے لگا' لڑکی نے سر جھکالیا۔
"عائشہ بیٹا' تم چائے تیار کرو۔" عائشہ کے بابا نے اسی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔
"جی بابا۔" لڑکی آہستہ سے کہتی باہر نکل گئی۔ وہ اس کے نکلتے ہی اپنی چادر اتار کر کرسی پہ ڈالتا وہیں براجمان ہوگیا۔ وہ اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگا' کیونکہ وہ ان لمحوں کے فسوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔
"بیٹا میں ذرا چینج کرلوں' تھوڑی دیر میں آیا۔"
سعید جمال کے کہنے پہ اس نے اثبات میں سرہلایا تو وہ باہر نکل گئے تنہا ہوتے ہی اسے اپنے گیلے کپڑوں کی جیب میں موجود والٹ کا خیال آیا..... جو یقیناً "بھیگ چکا تھا' اس نے تیزی سے والٹ نکالا' وہ افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا کہ جب تک وہ یہاں بیٹھا ہے' والٹ تھوڑا سا خشک ہوجائے۔ اس نے دانستہ اپنا دھیان والٹ کی طرف لگایا تھا کیونکہ وہ خیالوں سے بچنا چاہتا تھا۔
والٹ رکھ کر وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا' عام سا کمرا' عام سی چیزیں' عام سا ہار سنگھار.....
"لگتا ہے میری ہی طرح کے لوگ ہیں....." اس نے دل میں سوچا تب ہی دروازے پہ کھٹکا ہوا' وہ چونک کر ادھر دیکھنے لگا..... جاتے لمحوں کا فسوں ایک بار پھر سامنے آنے لگا۔
سیاہ کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی ہاتھ میں چائے ٹرے لیے اندر آرہی تھی..... سمیع حمزہ کو لگا اس لڑکی کے اندر داخل ہوتے ہی جیسے وہ ملگجی سی پیلی روشنی چاندنی میں نہا گئی ہو..... وہ چاند ہی کا تو ٹکڑا لگ رہی تھی..... سمیع حمزہ سے پلکیں جھکانا محال ہوگیا..... تبھی لڑکی کی بھی اس پہ نظر پڑی تھی' وہ یک ٹک اسے دیکھے جارہا تھا..... لڑکی سراسیمہ سی ہوگئی۔
"آہم....." اس کے پاس پہنچ کر وہ دانستہ ہلکا سا کھنکاری تو وہ چونک پڑا اور پھر اپنی اس حرکت پہ نادم سا ہوگیا۔ مگر اس کی ندامت پہ بھاری لمحوں کا سحر اور فسوں زیادہ طاقت رکھتا تھا۔
"با.....با۔"
"چینج کرنے گئے ہیں۔" حسن کی شہزادی کے منہ سے ابھی لفظ نکلے بھی نہ تھے کہ اس نے فقرہ مکمل کر دیا وہ آہستہ سے سرہلاتی بڑے ٹیبل پہ ٹرے رکھنے لگی' وہ چاہ کر بھی سیاہ بدلیوں میں چھپے چاند سے نظریں نہ چرا سکا۔ حالانکہ وہ کوشش تو پوری کررہا تھا۔
"آپ چینی کتنے چمچے لیں گے؟" ایسا میٹھا لہجہ اس کی سماعتوں کو تازگی بخشنے لگا لڑکی اس کا جواب نہ پا کر نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی' وہ آنکھوں میں اک حدت سی لیے اسے دیکھ رہا تھا لڑکی کا چہرہ دہک سا اٹھا۔
"مم..... میں بابا کو۔" وہ تیزی سے اٹھنے لگی۔
"دو چمچے....." بے ساختگی سے اس نے کہا تو لڑکی پھر وہیں پہ گر گئی' کیونکہ اب چائے بنا کر دیئے بغیر یہاں سے اٹھ جانا خلاف مہمان نوازی تھا اور اب تو اس نے اپنے منہ سے چینی کا کہہ دیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر اس کے لیے چائے بنانے لگی' اور بے حد تیزی سے چائے میں

چینی ڈال کر۔ اس کی طرف بڑھائی..... چائے۔" سمیع حمزہ جو نظریں چرانے کی بھرپور کوشش میں تھا..... ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

لڑکی کے چہرے پہ حیا کے گلابی رنگ یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے تھے۔ جھکی جھکی گھنیری پلکیں اور دہکتے گال سمیع حمزہ کو کے دل کو بے قرار کرنے لگے۔

"پلیز چائے۔" اچانک ہی عائشہ کی آواز میں لرزش سی آگئی..... اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا' وہ نظروں کو قابو میں کرنے کی پوری کوششوں میں تھا جبھی تو نادانستگی میں اس کی چار انگلیاں اس "نرم گداز ہاتھ سے ٹکرائیں تو اس کے اندر بجلی سی کوند گئی۔

عائشہ نے بھی اس کی آہنی انگلیوں کی حدت محسوس کرتے ہی تیزی سے ہاتھ واپس کھینچا تھا اس کا دل دھڑک اٹھا اور یہ دھڑکن کوئی بے نام نہیں تھی۔ سمیع حمزہ کی انگلیاں بھی ایک ہی لمحے کی جسارت پا کر اس کے اندر بھونچال لے آئی تھیں۔

"میں..... میں چلتا ہوں۔" اس نے تیزی سے اٹھنا چاہا تھا' کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لمحۂ کمزوری کی زد میں ایک دم سے آجائے مگر اسی وقت سعید جمال اندر آگئے اسے کھڑا دیکھا تو تنبیہی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگے۔

"عائشہ بیٹا! افسوس ہے تم پر' مہمان ابھی تک کھڑے ہیں کیا ہوا جوان کے کپڑے گیلے ہیں۔"

"نن نہیں وہ' وہ" وہ اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ کچھ بھی نہ بول سکا۔

"بابا یہ یہ" عائشہ بھی سٹپٹائی سی کرسی کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

"چلو بیٹا بیٹھو..... عائشہ تم چائے بناؤ۔" سامنے والی کرسی پر سعید جمال بیٹھے تو وہ گردن ہلاتی پھر سے چائے بنانے لگی' آہنی' مضبوط انگلیوں کے لمس سے دہکتے اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں چمچہ پکڑے وہ یہ بات بھول چکی تھی کہ وہ اس اجنبی کی چائے میں پہلے بھی دو چمچے چینی ڈال چکی ہے بے خیالی میں اس نے اسی کپ میں دو چمچے چینی اور ڈالی اور چائے ہلا کر اسے تیزی سے پکڑا دی جب وہ بغیر شکر کے بنی چائے کا کپ اپنے بابا کو پکڑا کر واپس پلٹی تو بے ساختہ ان دونوں کی نظریں ملیں۔

"دو چمچے چینی اور ڈال دیتیں۔" اس نے سرگوشی کی تھی مگر اس کے کانوں نے سن لیا وہ یاد آنے پہ خجل سی ہوگئی۔ سمیع کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"عائشہ بیٹا اپنے لیے بھی بنالو چائے۔" اس کے بابا نے کہا۔

مگر وہ اس پر فسوں سے ماحول سے دور ہٹ جانا چاہتی تھی' تیزی سے یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی جب ہی تو نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"بابا! ابھی کچھ دیر پہلے بنا کر پی تھی' اگر پھر پی لی تو رات کو نیند نہیں آئے گی۔" جواز معقول تھا اس کے بابا سر ہلا کر اپنے چائے کی طرف متوجہ ہوگئے..... وہ ان دونوں سے نظریں چراتی تیزی سے باہر نکلنے لگی مگر جانے کیوں اسے اپنے قدموں سے کسی کی بے تاب نظریں لپٹتی محسوس ہوئیں۔ اس کے قدم رک' رک کر چلنے لگے..... اور اس کے قدموں کی یہ سستی سمیع حمزہ سے چھپی نہ رہ سکی' اس کا دل بند ہونے لگا۔

کیسا ساتھ تھا یہ' کیسا رشتہ تھا کہ چند لمحے لگے تھے۔ اور یہ انجانے میں قائم ہوگیا نہ جان نہ پہچان بالکل اجنبی ہی تو تھے وہ..... مگر پھر بھی دل کیسے دھڑکنے لگا تھا' دھڑکنیں کیسے کسی اور نام پہ' سانسوں میں کیسے کسی دوسرے وجود کی خوشبو آن بسی تھی' چند لمحے ہی تو لگے تھے سمیع حمزہ کا اندر پورے کا پورا کسی اور کا ہوگیا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ ابھی کپ میں چائے ختم ہو..... ابھی کیا شاید وہ چاہتا تھا کہ یہ چائے کبھی ختم نہ ہو' مگر چائے تو چائے تھی' اس کی خواہش نہیں کہ ختم نہ ہوتی..... بہت ٹھہر ٹھہر کر گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے بھی چائے ختم ہوگئی اور اب وہاں اس کا بیٹھے رہنا بھی غیر ضروری سا ہوگیا نا چاہتے ہوئے بھی' اسے اٹھنا ہی

تھا مگر تب ہی سعید جمال کے ہاتھ سے چائے کا کپ اچانک چھوٹ گیا اور ان کی باقی ماندہ چائے ان کے کُرتے پر گر گئی۔ تب تک وہ اٹھ چکا تھا۔

"اوہ......" دونوں کے منہ سے بیک نکلا۔

"ابھی پہنا تھا..... اور پھر سے گندا ہو گیا۔" وہ اٹھ کر کرتا جھاڑنے لگے تھے۔

"تم ٹھہرو' میں یہ کُرتا بدل آؤں۔" وہ شرمندہ شرمندہ کُرتا جھاڑتے باہر نکل گئے' تب ہی برتن اٹھانے وہ ماہ رخ اندر آئی تھی سیاہ اندھیرے کو چیرتی ہوئی روشنی جیسی' اُسے کھڑا دیکھا تو چونک پڑی۔

"آپ جا رہے ہیں؟" سہمے سے لہجے نے اس کی دھڑکنیں بے قابو کیں۔

"ہاں جانا تو ہے۔" وہ افسردہ سا مسکرایا۔

"مگر ابھی بارش۔"

"آیا بھی تو بارش میں تھا۔"

وہ سر ہلانے لگی وہ دو قدم آگے بڑھا..... وہ برتن سمیٹنے لگی تیسرے قدم پہ وہ رکا' وہ دوسری سمت ہو کر کپ اٹھانے لگی بادل نہ خواستہ اسے کرسی پر سے چادر اٹھا کر تیسرا قدم بھی اٹھانا پڑا کپ اٹھاتے ہاتھ لرز گئے کپ سے کپ ٹکرایا تو وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا' وہ نچلا ہونٹ دانتوں سے چباتی پلکیں جھکائے کپوں کو گھور رہی تھی۔ اس نے ایک اور قدم اٹھا لیا اس کے دانتوں کے نیچے دبے ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ سمیع حمزہ نے تیزی سے اگلا قدم اٹھایا پھر اگلا پھر اگلا اور پھر۔

"رکیے۔" نس نس محو سماعت تھی جھٹکے سے رکا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ میں اس کا والٹ تھا..... اور ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔

"آپ کا والٹ۔" اس نے آہستہ سے کہا' اس کی ایک ساتھ کئی دھڑکنیں مس ہوئی تھیں۔

"یہیں رہنے دیں..... دوبارہ آنے کا جواز رہے گا۔" رک رک کر اس نے کہا تھا۔ اس کی طرف بڑھا والٹ والا ہاتھ ایک دم سے پیچھے کھنچ گیا گویا ادھر بھی یہی خواہش تھی۔ سمیع حمزہ کے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی عائشہ کے لبوں پہ بھی ویسی ہی انوکھی سی مسکان سجی تھی۔

اب کی بار بہت مطمئن ہو کر اس نے اگلا قدم اٹھایا تھا اور پھر قدم پہ قدم اٹھاتا چلا گیا کیونکہ اب اسے سنجیدگی سے آنے والی زندگی کے بارے میں سوچنا تھا۔

وہ بارش میں بھیگتے ہوئے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

اور ادھر سعید جمال کی بیٹھک میں جب وہ کُرتا بدل کر اندر آئے تھے اور اسے وہاں نہ پایا تھا تو حیرت سے عائشہ سے پوچھنے لگے۔

"وہ چلا گیا؟"

"جی۔"

"بہت نیک اور سعادت مند تھا' بہت اچھا بچہ' اتنی تیز بارش میں مجھے گھر تک چھوڑنے آگیا اپنی ذرا بھی پروا نہیں کی۔" تبھی ان کی نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑی۔

"اوہ! اس کا والٹ وہ اپنا والٹ یہیں بھول گیا۔" ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی پریشانی اور فکر تھی۔

"کوئی بات نہیں بابا! ہم کون سا اسے رکھ لیں گے۔"

"مگر بیٹا! جانے وہ کون تھا' میں تو یہ بھی نہیں جانتا۔" وہ حد درجہ فکرمند تھے۔

"ابو! آپ نہیں جانتے مگر وہ تو جانتا ہے نا۔ ہمارے پاس یہ امانت ہے اس کی اور مجھے یقین ہے وہ اپنی امانت لینے ضرور آئے گا۔"

عائشہ نے اطمینان سے کہتے ہوئے اپنے اندر جھانکا تھا اور اس کے دل نے زور زور سے دھڑک کر اس کے کہے کی تصدیق کر دی تھی۔ کیونکہ وہ یہاں اپنے والٹ سے بھی بڑی امانت چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ بھیگے موسم کی رت نرالی تھی اور وہ آنے والی رتوں کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی تھی۔



قانتہ رابعہ

اک دوست اچھی سی ہو

محسن! یہ گلی کی نکڑ پہ کون سی عمارت بن رہی ہے؟" شافعہ نے اپنے بیٹے محسن سے پوچھا۔

"مجھے تو نہیں علم۔ میرا دوست کہہ رہا تھا کہ بینک کی بلڈنگ بن رہی ہے۔" محسن نے کارٹون نیٹ ورک سے ایک لمحہ کے لیے ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"نہیں ماما! میں یہ بتاؤں دانیہ نے جلدی سے کہا۔" یہ ایک بہت بڑی دکان بن رہی ہے ٹافیوں' چیونگم اور ببلز کی۔ چھ سالہ دانیہ کی جان ان ہی چیزوں میں اٹکی رہتی تھی۔

"ہائیں! تمہیں کس نے بتایا؟" شافعہ نے پوچھا۔

"ہماری ٹیچر نے۔" دانیہ نے بے ساختہ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو تمہاری ٹیچر کو کیسے معلوم ہوا ہے؟" محسن اور دانیہ کی چوبیس گھنٹے کی لڑائی رہتی تھی۔ لٰہذا موقع نہ جانے دیا۔

"بھیا جی! یہ دکان ہماری ٹیچر کے ابو بنوا رہے ہیں۔" دانیہ نے کہا۔

"پھر تو ٹھیک ہی ہوگا۔ چلو سودا سلف لانے کا مسئلہ تو حل ہوا۔" دل ہی دل میں شافعہ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس کے میاں کی ملازمت دوسرے شہر میں ہونے کی وجہ سے چھوٹا موٹا سودا سلف لانے کا مسئلہ ہمیشہ سے درد سر بنا رہتا تھا۔ چونکہ گھر شہر سے ذرا دور تھا۔ لٰہذا بچے کو بھی بازار بھیجنا مشکل تھا۔

اور صحیح بات تو یہ ہے کہ حالات ہی نہ ہوتے بچے کو بازار بھیجنے کے۔ بس ہفتہ' دس دن بعد خود رکشہ پر بازار جاتی جوسز' کولڈ ڈرنک' پھل' بسکٹ' نمکو لے آتی۔ ایسا بھی کئی دفعہ اتفاق ہوا بچوں سے چھپ چھپا کر کولڈ ڈرنک کسی جگہ پر چھپا دی۔ مہمان آئے تو لاکھ ڈھونڈنے پر بھی نہ ملی۔

بہت تلاش کرتی تھی ذہن پر زور ڈالتی' پتا چلتا کہ دانیہ صاحبہ کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ یا پھر ایسا بھی ہوا' مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بسکٹ' نمکو کے پیکٹ نکالنے کے لیے کیبنٹ کھولی تو چیزیں غائب۔

"ارے کس نے لیں؟"

"کہاں رکھیں؟" کچھ پتا نہیں چلتا' مہمانوں کو سادہ چائے پانی پر ٹرخایا جاتا اور بعد میں بھی بھولے بسرے سے مہمان داری کے لوازمات کسی اور ٹھکانے سے دستیاب ہوتے۔

گھر پر بھی کباب' نگٹس بنا بنا کر رکھے' فریز کیے' مگر بارہ بارہ گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ' فریز کی ہوئی چیزوں کو مارے شرمندگی کے پانی پانی کر دیتی' دینے کے قابل ہی نہ رہتی اور اگر لوڈ شیڈنگ کا عذاب نہ ہوتا تو ایک کباب مہمان کے پیٹ میں اور سارے بچوں کی پلیٹ میں منتقل ہو چکے ہوتے۔

ایسے میں اگلی دفعہ وہی مہمان جو پہلی دفعہ دس چیزوں سے خاطر تواضع کیے جاتے تھے اور اب بھی اسی توقع میں ہوتے' کئی دفعہ مہمان آئے اور سادہ پانی ہی میسر ہوتا۔ اچانک پتا چلتا چینی ختم ہے۔ بسکٹ کہاں گئے؟ اور شربت تو چار دن بھی نہ چلتا' بوتل ختم ہو جاتی۔

"الٰہی! تیرا شکر ہے۔ دو قدم سے تو دانیہ بھی چیز



لاسکتی ہے۔"

باآوازبلند شافعہ نے اللہ کا شکرادا کیا۔

☼ ☼ ☼

"امی' امی۔ وہ جو' وہ جو۔۔۔۔" محسن کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" شافعہ بھاگ کر قریب آئی۔

"وہ دکان شروع ہو گئی ہے۔ بہت زیادہ چیزیں ہیں۔ بسکٹ' جوس' بریڈ' چاکلیٹ اور چیونگم' کینڈیز اور۔۔ اور۔۔۔۔"

"چلو بھاگ کر بسکٹ اور بریڈ تو لے آؤ۔ ہم گاہک بن کر ان کا افتتاح کرتے ہیں۔" اس نے کہا اور سو روپے کا نوٹ محسن کو دیا۔

"کیا کچھ لانا ہے؟" محسن نے دوبارہ پوچھا۔ "ایک بریڈ اور بسکٹ کوئی سے اچھے والے لے لینا ہیں' بیس روپے والے۔"

محسن بھاگتا ہوا گھر سے نکلا اور بوتل کے جن کی طرح چار' پانچ منٹ میں شاپر اٹھائے واپس بھی آگیا۔
"ارے اتنی جلدی۔ ماشاء اللہ..." حیرت سے شافعہ نے کہا۔
"تو اور کیا... یوں گئے اور یوں آئے۔" دس سالہ محسن نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔
"باقی پیسے؟" شافعہ نے ہاتھ آگے کیا۔ محسن نے دس روپے ماں کی ہتھیلی پر رکھے۔
"ہائیں صرف دس روپے بچے؟" شدید حیرت سے شافعہ نے پوچھا۔
"پچپن روپے کی بریڈ' بیس روپے کے بسکٹ اور یہ میں نے اپنے لیے پندرہ روپے کی چاکلیٹ لے لی ہے۔"
"مجھے بھی چاکلیٹ لینا ہے' مجھے بھی... مجھے بھی لا کردو۔" دانیہ چیختی چلاتی ہوئی کہنے لگی۔
بقایا دس روپے۔ شافعہ نے بیٹی کے ہاتھ پر رکھے اور حساب کتاب کرتے ہوئے بولیں۔
"یہ دکان تو سراسر گھاٹے کا سودا ہے' لو بھلا یہ کیا بات ہے' اس سے اچھا تو دور کا سودا تھا۔ بیس روپے کرایہ لگاؤ اور چالیس ہزار کی اشیاء سمیٹ لاؤ۔"
دونوں بچے اچھلتے کودتے چاکلیٹ لینے نئی دکان میں جاچکے تھے۔

☼ ☼ ☼

ڈور بیل پر ہاتھ رکھنے والا ہاتھ اٹھانا بھول گیا۔ شافعہ تولیے اور گیلے بالوں کے ساتھ دروازے کی طرف بھاگی۔
"کون؟ اوہ... منصور چچا... سارہ چچی۔"
"السلام علیکم۔ ہائے کتنے عرصہ کے بعد آئے ہیں؟"
سلام دعا اور گلے ملنے کے بعد اسے چائے پانی کی یاد آئی۔
"اوہو چائے کی پتی تو ختم ہے اور چائے کے ساتھ کیا دیا جائے؟"
"سردی بہت ہے ابلے انڈے۔ شامی کباب فریز کیے رکھے ہیں' ساتھ میں نمکو' بسکٹ... اگر رکنا ہوا تو کھانے کے لیے گوشت پڑا ہی ہے۔"
"محسن بیٹا! جلدی بات سنو' یہ لو دو سو روپے بھاگ کر چائے کی پتی' نمکو اور بسکٹ لے آؤ۔" انڈے ابلنے کے لیے رکھتے ہوئے اسے پیسے پکڑائے توے پر آئل ڈالا اور شامی کباب رکھ کر مہمانوں کے پاس جا بیٹھی۔
نہ نہ کرتے بھی سب نے چائے پی۔ کھانے پر وہ لوگ کہیں اور انوائٹ تھے۔
مہمانوں کے جانے کے بعد برتن سمیٹتے ہوئے اس نے محسن سے حساب مانگا۔
"محسن بیٹا! سودا کتنے کا آیا؟"
"ایک سو ستر روپے کا۔" محسن نے کہا۔
"باقی رقم؟" اس نے برتن دھو کر خشک کرتے ہوئے کہا۔
"وہ... تیس روپے کی میں نے آئس کریم لے لی تھی۔" بے نیازی سے محسن نے جواب دیا۔
شافعہ کو تو جیسے پتنگے لگ گئے۔
"کیا کہا؟ تیس روپے کی آئس کریم کھالی؟"
اور ایک تھپڑ محسن کے منہ پر مارا۔
"دو ماہ سے میں یہ تماشا دیکھ رہی ہوں' ایک دن ایسا نہیں ہوا کہ تم نے اپنا کمیشن نہ رکھا ہو۔ ہر دفعہ ڈنڈی مار جاتے ہو۔ مجھے نہیں پسند یہ چٹورا پن' ہر چکر پر تم یہی کرتے ہو۔ انسان بنو' یہی چسکہ چور' ڈاکو بناتا ہے' ہزار دفعہ منع کیا ہے یہ غلط حرکت ہے' مگر مجال ہے کہ سمجھ میں آئے' کیا پاکٹ منی کافی نہیں؟"
شافعہ غصے سے دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ محسن کمرے میں اوندھے منہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی! آپ نے بھیا سے چیزیں منگوانا کیوں چھوڑ دیں؟" دانیہ نے ماں کو ذرا فارغ دیکھا تو پوچھا۔
"ایسے ہی... ضرورت نہیں تھی سودا لانے کی۔"

شافعہ نے ٹالا۔

"پر مجھے تو ابھی اسکیل اور نئی کاپی چاہیے' ڈھیر سارا ہوم ورک کرنا ہے مجھے ابھی۔" ٹھنکتے ہوئے دانیہ بی بی نے فرمائش کی۔

بہت دیر تک شافعہ نے سوچا' مگر مناسب حل نہ ملا' جب دکان نہیں کھلی تھی' وہ اکثر و بیشتر مہینے بھر کا سودا اکٹھا ہی ڈالا کرتی تھی' مگر ہزار تدبیروں اور ترکیبوں کے باوجود دونوں بچے مہمان داری کے لیے رکھی گئی اشیاء اڑا لیا کرتے تھے۔

کئی دفعہ پیار سے ڈانٹ کر' مار سے سمجھایا' مگر بات نہ بنی' اب تو وہ تھک سی گئی تھی۔ نمکو' بسکٹ قسم کی چیزوں کے ٹھکانے بدل بدل کر بھی دیکھ لیے۔ مگر ڈرائی فروٹ کی ٹرے کی ٹرے خالی ہوتی۔ جار میں بادام رکھے تو' بمشکل دو' چار ہی ملے' سوچ سوچ کر دماغ جواب دے گیا۔

یا الٰہی تو ہی ان کو سمجھ' شعور عطا کرے۔۔۔ بات بات پر مار کٹائی تو ویسے ہی بچے کو خراب کر دیتی ہے۔"

* * *

"امی! میرا اسکیل' نئی کاپی اور لنچ میں' کل مجھے سینڈوچز دینا ہیں۔" دانیہ ابھی بھی سر پر سوار تھی۔

"چلو تمہیں ساتھ لے کر جاتی ہوں۔" اس نے دانیہ کا ہاتھ پکڑا۔ چلتے چلتے محسن کو بھی آواز دی۔

"آؤ۔۔۔ انکل رحیم بخش کی شاپ پر چلیں۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء' بچوں کے اسکول کی چند چیزیں لیں اور محسن سے کہا۔

"محسن بیٹا! ان انکل سے آپ چیزیں لیا کرو گے' لیکن پیسے ہم ہر ماہ کے اختتام پر دیں گے۔ انکل تاریخ ڈال کر ہماری خریدی ہوئی اشیاء لکھتے رہیں گے۔ ٹھیک؟"

محسن تو چپ رہا' لیکن دکان دار انکل سمجھ گئے اور بے حد جوش و خروش سے بولے۔

"کیوں نہیں بہن! یہ دیکھو آپ کے حساب کا صفحہ۔ چوہدری منور حسین ولد نذیر حسین مورخہ بیس مارچ۔۔۔ کاپی ۱ عدد' شیمپو ایک عدد۔۔۔"

آتے ہوئے محسن کی پھولی پھولی آنکھیں ماما سوچتی کچھ کھوجتی محسوس ہوئیں۔

دل ہی دل میں شافعہ اپنے آپ کو تھپکیاں دے رہی تھی۔

"حد ہو گئی۔ ایک نہ دو پورے نو سو روپے کی صاحبزادے نے اپنے کمیشن کے طور پر اتنے عرصہ میں چیزیں لیں' اب پتا چلے گا۔"

* * *

"فون پر نامعلوم نمبر تھا۔" شافعہ نے ریسیور اٹھایا۔

"جی باجی جی۔ میں سلطان بیکری سے بات کر رہا ہوں' آج بیس اپریل ہے' ایک ماہ ہو گیا ہے آپ کا' آج حساب کتاب کلیئر کر دیں۔ صاحب جی کہہ رہے تھے ایک ماہ سے زائد ہو تو پھر زیادہ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک' ٹھیک ہے کتنی رقم بنی ہے؟" اس نے سرسری سا پوچھا۔

"چھ ہزار دو سو گیارہ۔"

"مگر اتنا راشن تو میں نے نہیں لیا۔" اس کی آواز پھنس سی گئی گلے میں۔

"بی بی۔۔۔ بات سنیں' حساب ایک ایک پائی کا لکھا ہے' آپ خود آکر چیک کر لیں' ہزار بارہ سو کی تو آپ کے بچوں نے چپس' کوکیز' بسکٹ' چاکلیٹ لی ہیں۔" ملازم نے ناگواری سے کہا۔

"کوکیز تو میں نے نہیں منگوایا۔" شافعہ نے حیرت سے کہا۔

"ہمیں کیا معلوم۔ آپ کا بچہ ہی چاول' دال اور کوکیز' صابن' شیمپو کا ورد کرتا تھا۔" ملازم نے کہا اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

"اوہ میرے خدا!" چادر سر پر لی اور شافعہ محسن کو ساتھ لے کر پھر دکان پر پہنچی۔

"بھیا! ذرا میرا رجسٹر تو دکھائیں۔" پل بھر میں رجسٹر اس کے ہاتھ میں تھا۔

"اوہ خدایا۔۔۔" وہ صفحے پر نظر دوڑاتی جا رہی تھی اور

رنگ بدلتا جا رہا تھا۔
"دو عدد کولڈ ڈرنک پیپسی۔ میرے اللہ پیپسی تو میں نے پورے مہینے ہی نہیں منگوائی۔"
خاموشی سے بل کی ادائیگی کی اور دکان سے قدم باہر نکالا۔
پھر ایک دم پلٹ کر واپس آئی۔
"آج کے بعد' جو بھی سودا منگواؤں گی' اس پر سائن کر کے بھیجوں گی۔ یہ سائن ہیں میرے۔ میرے سائن کے بغیر کوئی سودا آپ نہیں دیں گے۔"
"ٹھیک ہے جی... جیسے آپ کی مرضی۔"
مالک دکان نے توجہ دوسرے گاہک کی طرف کی۔
غصے' شرمندگی' خواری کے علاوہ بھی ہزار رنگ تھے' جو شافعہ کے چہرے پر آ رہے تھے۔ سارا رستہ محسن جل تو جلال کا ورد کرتا رہا۔
چادر کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے پہلے تو سوچا جوتا لوں یا ڈنڈا۔ پھر ارادہ بدل دیا۔
آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہہ رہے تھے۔
"محسن بیٹا! آپ نے ایسے کیوں کیا؟"
"دانیہ بھی لیتی تھی چیزیں۔" محسن نے بے خوفی سے کہا۔
"دونوں لیتے تھے؟" حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔
"جھوٹ ماما... مجھے بھیا نے کہا تم بھی لے لو انکل مفت میں دیتے ہیں۔" تیز طرار دانیہ نے جواب دیا۔
"اور پتا ہے کتنی بری حرکت کی تم دونوں نے؟"
شافعہ نے دونوں سے سوال کیا۔
"چوری بھی کی' جھوٹ بھی بولا اور ماما کو دھوکہ بھی دیا۔" صدمے سے شافعہ کی آواز رندھی ہوئی تھی۔
دونوں ننھے منے مجرم سر جھکائے کھڑے تھے۔
"میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں بہت بڑی سزا دوں۔ کیا میں آپ کو روزانہ پاکٹ منی نہیں دیتی؟ کیا اسکول جاتے ہوئے روزانہ آپ کی پسند کی چیزیں نہیں دیتی؟ پھر آپ نے ایسے کیوں کیا؟"
شدت جذبات سے شافعہ کا دل چاہا رونے کا' مار مار کر دونوں کو سبق سکھانے کا۔
"سوری ماما!" دانیہ نے ہاتھ جوڑ کر سوری کی۔
"سوری ماما!" محسن بھی سر جھکائے کھڑا تھا۔
"وعدہ کرو' دونوں آئندہ ایسی حرکت نہیں کرو گے۔"
آنسو پونچھتے ہوئے شافعہ کے دل میں ممتا کا جذبہ انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔
"پرامس۔" پہلے دانیہ نے ہاتھ پکڑا۔ پھر محسن نے اللہ کا پکا وعدہ... کہا اور ماں کے گلے لگ کر رونے لگا۔



"محسن! میں نے چٹ پر سائن کر دیے ہیں' بھاگ کر سفید چنے اور املی تو لے آؤ۔" شافعہ نے چٹ محسن کو تھماتے ہوئے کہا۔
محسن اب ماشاء اللہ گیارہویں سال میں تھا۔ باپ کی طرح لمبا دبلا قد نکالتا۔
محسن نے چٹ پر نظر ڈالی اور نئی سائیکل کے شوق میں ایک لمحہ میں باہر چلا گیا۔
اب شافعہ پہلے کی طرح لاپروا نہیں تھی' دو چار دن کے بعد دکان پر فون کر کے پوچھ لیتی تھی' سودے کی لسٹ کیا کیا ہے۔ ابھی تک معاملہ ٹھیک ہی تھا۔ یہ اور بات ہے بار بار لوکل کال کرنے سے فون کے بل نے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔
تین' چار ماہ کے بعد جبکہ وہ اب نسبتاً" بے فکر ہو چکی تھی۔ وہ کمزور لمحہ آ گیا' ایک دفعہ پھر شیطان نے محسن پر قابو پا لیا۔
کچن میں دوپہر کا کھانا بناتے ہوئے فون کی گھنٹی کی آواز پر چولہا بند کر کے آئی فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف دکان سے ملازم تھا۔
"بی بی جی! صاحب جی کہہ رہے ہیں آج سودوں کی لسٹ میں چکن برگر' پزا اور چاکلیٹ کیک ہے۔ چاکلیٹ کیک تو جی ابھی تیار نہیں' پائن ایپل کیک ڈال دیں۔"
"کیا؟" شافعہ کو کرنٹ لگا۔
"میں نے تو یہ سودے... کوئی بات نہیں' آپ پائن

ایپل کیک بیک کردیں اور محسن کو دے دیں، بس جھٹ سنبھال کر رکھیں۔"

"اچھا جی۔" کہہ کر ملازم نے فون بند کردیا۔ چند منٹوں کے بعد شافعہ دکان پر موجود تھی۔ ملازم نے جھٹ اس کے سامنے رکھی۔

چاکلیٹ کیک، پزا، برگر، آئس کریم، سائن ہو بہو اسی کے تھے، لیکن یہ وہی جانتی تھی کہ یہ سائن اس کے نہیں تھے۔

بل کی ادائیگی کے بعد بڑی مشکل سے تھکے تھکے قدموں سے وہ دکان سے نکلی۔

ہر قدم من بھر کا تھا۔

ہر لمحہ اذیت کا۔

قطرہ قطرہ زہر غم پی رہی تھی۔

رات کو جب محسن اکیڈمی سے واپس آیا اس نے آہستہ سے اس کے سامنے چٹ رکھ دی اور اس کا رد عمل دیکھا، کچھ خاص رد عمل نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے بس اتنا ہی کہا۔

"پارٹی تھی اسکول میں، میری برتھ ڈے تھی۔"

"مجھے کہتے، کیا میں نے کبھی انکار کیا ہے؟"

"میرے دوست گھر کی بنی چیزیں نہیں کھاتے بیکری کی کھاتے ہیں۔"

"تو میں بیکری سے منگوا دیتی؟ تم کہتے تو سہی، اتنا بڑا جرم بغیر بتائے۔"

"مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں نے اس لیے آپ کو نہیں بتایا کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ اپنی پاکٹ منی بل میں شامل کردوں گا، آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

شافعہ مزید کچھ کہے بغیر اس کے کمرے سے نکل آئی۔ وہ ساری رات اس نے کانٹوں کے بستر پر گزاری۔

جو جل اٹھتا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے تھے

"الٰہی کوئی حل نہیں؟ کیا کیا کوشش میں نے نہیں کی؟" کبھی رونے لگ جاتی، کبھی ٹھنڈی آہیں، بچے اپنے کمرے میں سو رہے تھے اور بچوں کا باپ سینکڑوں میل دور تلاشِ روزگار میں۔

اپنا دکھ کہے تو کس سے کہے، ۲۶ ایف ایم اے ان بن جھماکا سا ہوا۔

"ارے اللہ سے تو کہہ سکتی ہوں۔"

ہائے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ اچھی طرح وضو کرکے جائے نماز بچھا کر اس نے دل لگا کر دو نفل پڑھے اور دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔

"اسماعیل کو آداب فرزندی سکھانے والے مالک! میری اولاد کو بھی اسی راستہ پر لے آ۔ اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنانے والے اب تو کوئی اور حیلہ طریقہ ہی نہیں تو ہی مدد کر تو ہی میرا مددگار بن جا، میں نہیں چاہتی کہ اولاد کو جہنم میں ڈلوا کر خود جنت کا راستہ لے لوں، اے اسماعیل کو آداب فرزندی سکھانے والے.... میرے اللہ.... اللہ...." روتے روتے وہ بے دم ہو چکی تھی اور سجدہ میں گر گئی۔

سجدہ سے سر اٹھایا تو اس کے دل میں سکون ہی سکون تھا۔ برسوں پہلے ابا کا کہا ہوا یاد آگیا۔

"بیٹا جو دعا شرف قبولیت پا جائے اس کی پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ دل میں سکون اطمینان ہو جاتا ہے۔" اس کے دل سے بے اختیار شکر کا کلمہ نکلا۔

"بھلا تیرے در سے بھی کوئی مایوس لوٹا ہے؟؟" فجر کی اذان میں پندرہ، بیس منٹ باقی تھے، اس نے سوچا اتنی دیر میں تھوڑا سا سپارہ پڑھ لے۔

قرآن لینے کے لیے وہ جاء نماز سے اٹھی۔ اور حق دق رہ گئی۔

اس کے پیچھے شرمندہ، شرمندہ، آنسو پونچھتا اس کا بیٹا محسن کھڑا تھا۔

"میری پیاری امی! جو چاہے سزا دے لیں، ان شاء اللہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی جو کہ آپ کو رنجیدہ کرے۔"

دونوں ہاتھ باندھے، سر جھکائے، نادم نادم محسن اسے اس وقت اس کی دعا کا جواب ہی لگا۔ رات بھر جاگنے، رونے کی اذیت لمحہ بھر میں دور ہو گئی۔ اس نے بے اختیار اس کا پیار سے ماتھا چوم لیا۔



نعیمہ ناز

دو قدموں کا فاصلہ

ناولٹ

"اے ہائے۔ ہم کیوں چلے جائیں، اب دیکھنے کے لیے؟ میں اتی اتی بیمار پڑی۔ تمہاری پھپھو نے آکے جھانکا بھی؟ ایک آدھ بار آگئیں، بس دنیا دکھاوے کو۔" امی نے کھٹا کھٹ سروتا چلایا۔

"تو امی جان! آپ بھی دنیا دکھاوے کو ہی چلی چلیں اور ویسے بھی آپ ان سے سیدھے منہ تو بات نہیں کرتیں۔ بقول ان کے۔" سارہ نے ان گھورتی ہوئی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے جلدی سے وضاحت کی۔ "اسی لیے پھپھو نے آنا کم کر دیا۔" سارہ نے آہستہ سے بات مکمل کی۔

"ارے تمہیں کیا پتا، یہ کم کم آنا میرے رویے کی وجہ سے نہیں، بلکہ شرمندگی کی وجہ سے ہے، جو سلوک ان دونوں بہنوں نے میرے ساتھ کیا، میری شادی کے بعد آج تک نہیں بھولی اور ان شاء اللہ مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔ میں گھر کی بہو تھی، مگر نوکرانی سے بھی بدتر، ساس تو تھیں نہیں اور دونوں بہنیں ساس بنی ہوئی تھیں۔ تمہارے دادا کو تو بس وقت پر ناشتا کھانا اور کپڑے چاہیے تھے۔ باقی گھریلو معاملات سے انہیں کوئی واسطہ نہیں کہ بیٹیاں کیسے چودھرانی بنی بیٹھی ہیں اور مجھے ان سے کیا شکایت ہوتی، جب میاں ہی بدھو ملے، تمہارے ابو میں کون سی عقل تھی کہ بیوی کے ساتھ ہونے والا سلوک نوٹ کرتے۔ میں چاہے گھر بھر کا کام کروں، بیماری میں مجھے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا، کھانا تک میں اپنی مرضی سے نہیں نکال سکتی تھی۔ گن کر روٹیاں دیتیں اور ناپ کر سالن، کپڑے دھونے کے لیے ایسے کاسٹک سوڈے والے صابن منگواتیں کہ ہاتھ زخمی ہو جاتے۔ سارا پیسہ، حساب کتاب، سب کچھ اپنے ہاتھ میں رکھتی تھیں۔ دو سال تک تو میں نے اپنی پسند سے ایک پیسے کی کوئی چیز نہیں خریدی، اول تو پیسے ہی نہیں ہوتے تھے اور اگر کبھی قسمت سے کچھ مل بھی جاتے کبھی میکے سے کبھی شوہر سے، تو ہزار باتیں، ہزار پابندیاں، ارے بہت پریشان کیا ہے ان دونوں نے مجھے، تین بچوں کی ماں ہو کر بھی میں ڈرتی ہی رہتی تھی کہ کوئی بات نہ





ہو جائے‘ کوئی جھگڑا نہ ہو جائے‘ میکے میں بھلا کون بیٹھا تھا حمایت کے لیے‘ والدین تھے نہیں‘ بھائی‘ بہن شادی کے بعد بھلا کس کے ہوتے ہیں‘ اسی لیے تو زیادہ دباتی تھیں مجھے کہ آگے پیچھے کوئی ہے نہیں پوچھنے والا‘ ایک ایک چلتر بن یاد ہے مجھے دونوں کا‘ ما چس چھپا کے رکھتی تھیں کہ میں ان سے چھپا کر کچھ پکا نہ لوں۔“

امی جو شروع ہوئیں تو کئی بار کی سنائی ہوئی رام کہانی ایک بار پھر سارہ کو سننی پڑی۔ جس میں بلاشبہ سچائی تو تھی‘ مگر مبالغہ آرائی کے ساتھ۔

”پھر؟ آپ چلیں گی یا نہیں؟“ اس نے اکتا کر سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔ ”چلی جاؤں گی‘ تمہیں کیا فکر ہے؟ اب ذرا گرمی سردی میں لان اور کاٹن کے جوڑے مل گئے تو پھپھو پر واری صدقے ہوئی جا رہی ہیں بھتیجی صاحبہ۔“

”آج کے دور میں بغیر مطلب کون‘ کس پر رقم خرچ کرتا ہے می جی۔“ زارا نے مونگ پھلی ٹونگتے ہوئے اپنی ٹانگ اڑائی۔ ”اب ہمارا بھائی ہے چھوٹا‘ پھر ان کی ایک بیٹی‘ وہ بھی شادی شدہ‘ دوسری ہمارے بھائی سے بڑی ہے۔ ابو کی کوئی ایسی جائیداد بھی نہیں جس میں سے حصہ چاہیے ہو‘ پھر اگر وہ رقم خرچ کرتی ہیں تو اس کے پیچھے کیا لالچ ہو سکتی ہے؟“

”بھتیجیوں کی محبت۔“ سارہ نے ٹکڑا لگایا۔

”ہونہہ! بھتیجیوں کی محبت۔“ امی نے منہ بنایا۔ ”یہ سب اب اپنی جھینپ مٹانے کو کرتی ہیں‘ اپنے غلط رویوں کا احساس تو ہوتا ہی ہوگا کبھی۔“

”آج کے دور میں ایسا احساس ہونا بھی بڑی بات ہے۔“ زارا کی ہر بات آج کے دور سے شروع ہوتی تھی‘ علی نے تو اس کا نام ہی آج کا دور رکھا ہوا تھا۔

”امی جی! پھر بتائیں نا‘ کب چلیں گی؟“ سارہ کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

”امی پلیز‘ میں اتنی دیر سے کیا کہہ رہی ہوں‘ وہ تو سن لیں۔“ سارہ نے ایک بار پھر ملتجیانہ انداز میں دہائی دی۔

”تم دونوں بہنیں ہر وقت میرا دماغ نہ خراب کیا کرو‘ کہہ دیا جب فرصت ملے گی چلی جاؤں گی‘ ویسے بھی شمسہ کے گھر جانا کوئی آسان ہے؟ اللہ میاں کے پچھواڑے میں گھر ہے‘ ملیر سے اورنگی ٹاؤن‘ یہ اللہ ماری مہنگائی‘ ہم سب کو مار کر ہی کم ہو گی‘ پیٹرول ایک روپیہ بڑھے تو کرایہ فوراً دو روپے بڑھ جاتا ہے۔

”سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں‘ غضب خدا کا‘ دو قدم کے لیے بھی بس میں بیٹھ جاؤ تو پورا پورا کرایہ وصول کر لیتے ہیں اور مہنگائی دیکھو‘ بازار جاؤ تھیلا بھر کے نوٹ لے جاؤ اور ذرا ذرا سی تھیلیوں میں چیزیں لے آؤ‘ ہر چیز سونے کے بھاؤ۔“

امی کے جلال کا رخ اور ان دونوں سے ہٹ کر دوسری جانب مڑ گیا تھا اور اب ان کی بڑبڑاہٹ‘ تبصرے اور تجزیے کے دوران کسی کی مداخلت ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی۔

سارہ مایوس ہو کر وہاں سے اٹھ گئی‘ مگر جانے سے پہلے زارا کو ایک دھموکا جڑنا نہیں بھولی۔



”تم کب تیار ہو گی؟“ زارا بالیاں پہنتی ہوئی وہیں کچن میں آ گئی۔

”ذرا یہ لاک لگانا۔“ اس نے سارہ کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”ابو اور علی کے لیے روٹیاں پکا کر رکھ رہی ہوں‘ دوپہر میں کھا لیں گے۔“ سارہ نے ہاتھ دھو کر پیڑے بنانے شروع کر دیے۔

”ہاں وہ میرے بلیک شوز نکال دینا‘ وہ جو عید پر لیے اور وہ پنک نگوں والے ٹاپس بھی نکال دینا اور زارا پلیز میرے گاؤن اور اسکارف پہ ہلکی سی استری پھیر دو‘ روٹیاں پکانے کے ساتھ ساتھ۔“ سارہ کی ہدایات بھی کھٹ کھٹ جاری تھیں۔

پورے ڈھائی گھنٹے لگے انہیں پھپھو کے گھر جانے میں‘ مگر وہاں جا کر کم از کم دونوں بہنوں کی تو کوفت بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ہاں امی بس ذرا اپنے مخصوص لیے

دینے والے انداز میں بیٹھی تھیں۔
شیریں میکے آئی ہوئی تھی' وہ کچن میں مصروف ہو گئی' سارہ تو پھپھو کے ساتھ ہی بیٹھی رہی' مگر زارا تھوڑی دیر بعد کچن میں آ گئی۔
"آپ کب آئیں؟"
"میں کل ہی تو آئی ہوں' امی نے بلوایا تھا' بھابھی اپنے گھر گئی ہوئی ہیں' ان کے بھائی کی شادی ہے نا اگلے ہفتے' امی ویسے تو اب ٹھیک ہیں' مگر بلڈ پریشر زیادہ ہائی ہو جائے تو کام کہاں ہوتا ہے گھر کا۔" شیریں چائے نکالتے ہوئے تفصیل بتا رہی تھی۔
"آپ کی بالیاں بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" زارا نے اس کی بالیوں کی تعریف کی۔ "شکریہ۔" شیریں بے ساختہ مسکرا دی۔ "عائشہ کی پیدائش پر انہوں نے گفٹ کی تھیں۔"
"بس ہم اب چلیں گے' تم کھانے کا تکلف نہ کرنا۔" امی نے چاول چنتی ہوئی شیریں کو مخاطب کیا اور چائے کا کپ ٹرے میں رکھا۔
"ابھی تو آئی ہیں ڈھائی گھنٹے بس میں بیٹھ کر اور اتنی جلدی واپس؟ کھانا وانا کھا کر آرام سے جایئے گا۔ یہ کیا بس آنا اور جانا۔"
"اور کیا امی! ابھی تو آئے ہیں' ذرا دل' جگر' گردے وغیرہ وغیرہ اپنے ٹھکانوں پر تو آجائیں جو بس کے مسلسل جھٹکوں سے ادھر کے ادھر ہو گئے ہیں۔" سارہ نے امی کی گھورتی ہوئی نگاہوں اور رد عمل کی پروا کیے بغیر مزے سے کہا۔
"امی! آپ نماز پڑھ لیں۔" سارہ نے مشورہ دیا۔
"اذان تو ہو جائے۔" امی کی گھوری اور ڈانٹ ڈپٹ عموماً" اوپری ہی ہوتی تھی۔ نیم دلی سے ہی سہی' مگر بیٹیوں کی مرضی پر وہ راضی ہو ہی جاتی تھیں۔
"پھپھو کتنی کمزور ہو گئی ہیں' ہے نا؟" واپسی پر دونوں بہنیں تبصرہ کر رہی تھیں۔
"ہاں۔ پہلے کتنی صحت مند تھیں' اب تو آدھی ہی رہ گئیں۔" سارہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔
رات کو دسترخوان پر کھانا لگاتے ہوئے سارہ نے بات نکالی۔
"پھپھو۔ آپ کو بہت پوچھ رہی تھیں ابو!"
"چھٹی والے دن ان شاء اللہ ہو کر آؤں گا۔ پچھلے دو' تین ہفتوں سے چھٹی کا دن بھی کام میں ہی گزر رہا ہے۔" ابو پلیٹ میں سالن نکالنے لگے۔
"تمہیں ٹائم نظر آرہا ہے اپنے ابو کے پاس' صبح کے گئے رات گیارہ' بارہ بجے تک تو گھر آتے ہیں۔ اوپر سے چھٹی کے دن بھی تین' چار گھنٹوں کے لیے بلا لیتے ہیں' ٹائم کہاں سے نکالیں' وہاں تو جانے کے لیے ہی پورا دن چاہیے۔" امی نے دخل اندازی کی۔
"ہاں ہاں ٹھیک ہے' جب پورے دن کی چھٹی ہو گی میں چلا جاؤں گا۔" ابو نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے بحث سمیٹ لی۔



اس ہفتے ابو کا پورا پورا ارادہ تھا کہ وہ اورنگی ٹاؤن چھوٹی پھپھو کی عیادت کے لیے ضرور جائیں گے۔ مگر اب کی چھٹی ان کے لیے ایک ایسی مصروفیت لائی کہ وہ جانے کا پکا ارادہ رکھتے ہوئے بھی نہ جا سکے۔
برابر والی رحیمہ بوا اپنی ایک جاننے والی کو لائی تھیں' سارہ کے رشتے کے لیے' وہ خاتون تو سارہ کو دیکھتے ہی فدا ہو گئیں۔ اپنے گھر اور بیٹے کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بصد اصرار انہیں اپنے گھر آنے کو کہہ گئیں۔ اگلے ہفتے ابو' امی' رحیمہ بوا اور ان کے بڑے بیٹے کے ساتھ وہاں گئے۔ واپس پر دونوں ہی خاصے مطمئن اور خوش لگ رہے تھے' لڑکا سرکاری ملازم تھا۔ گھر اپنا تھا۔ متوسط طبقے کا خوش حال گھرانہ تھا۔ والدین بھی کافی ملنسار اور سیدھے سادے تھے۔
"پھر کیا سوچا؟" رات گئے تک ابو' امی کے ساتھ یہ ہی معاملات ڈسکس کر رہے تھے۔
"اب زیادہ سوچ بچار کیا کرنی' اللہ کا نام لے کر ہاں کر دیں۔" امی کا پورا پورا ارادہ بن گیا تھا' سارہ کا رشتہ یہیں طے کرنے کا۔

"سارہ کی رائے بھی تو ضروری ہے۔" ابو نے پُرخیال نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

"دیکھیے بھلا اسے کیا اعتراض ہوگا؟ اس کا اچھا برا دیکھ کر ہی ہم یہ فیصلہ کررہے ہیں' پھر بھی آپ کہتے ہیں تو میں اس سے پوچھ لوں گی۔" امی نے انہیں یقین دہانی کروائی۔



سارہ کے سسرال والے تو ہتھیلی پر سرسوں جمار ہے تھے' اگلے ہفتے منگنی اور دو ماہ بعد شادی۔ دراصل چار بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے سب ہی کو بہت ارمان تھے۔

منگنی میں بہت قریبی لوگوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ مگر پھر بھی ان ہی سے چھوٹا سا گھر بھر گیا۔ مردوں کے لیے باہر گلی میں شامیانہ لگا کر انتظام کیا گیا تھا۔ سبھی لوگ آئے تھے' سوائے چھوٹی پھپھو کے۔ ان کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ اتنا لمبا سفر کرسکتیں۔

"امی نے بہت مبارک باد کہلوائی ہے اور سارہ کے لیے بہت سی دعائیں۔ اگر ان کی طبیعت تھوڑی سی بھی اس قابل ہوتی تو وہ ضرور آتیں۔" عظیم بھائی ابو' امی سے بات کررہے تھے۔

"آپ کو بہت یاد کررہی ہیں' منگنی وغیرہ سے فارغ ہوجائیں تو ضرور چکر لگائیے گا۔" عظیم بھائی اب ابو سے مخاطب تھے۔ جو چھوٹی بہن کے نہ آنے سے اور بیماری کا سن کر کچھ پریشان سے ہوگئے تھے۔

"میں اگلے ہفتے ضرور آؤں گا۔" ابو نے ان سے وعدہ کیا تھا یا خود سے عہد کیا تھا۔

امی کے تیور وہی تھے' جو اپنی نندوں کے معاملے میں وہ کبھی کبھی اختیار کرلیتی تھیں۔

"تمہارے گھر کی پہلی خوشی تھی' آنا تو چاہیے تھا۔"

"پھپھو کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ ضرور آتیں۔" زارا نے امی کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی' بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"رہنے دو بی بی! ہم نے بھی بیماریاں جھیلی ہیں' مگر لوگوں کی خوشی غمی میں بھی شریک ہوئے ہیں۔ اب کوئی پوچھے گا تو کیا کہوں گی؟ نئی نئی رشتہ داری کا معاملہ ہے' وہ لوگ تو یہ ہی سوچیں گے نا کہ چھوٹی نند سے کوئی لڑائی جھگڑا ہوگا ہمارا' جو وہ نہیں آئی۔" امی کا منہ بنا ہوا تھا۔

"چھوڑیں امی! کوئی نہ تو کچھ سوچے گا نہ کہے گا' پھر پھپھو کے بچے تو سارے آئے ہیں نا' عالیہ بتارہی تھی کہ انہوں نے خود اصرار کرکے سب کو بھیجا ہے' اور ویسے بھی ابھی ان سب باتوں کی کیا تک بنتی ہے' مہمان آنے والے ہیں' آپ بس ان کی فکر کریں۔" زارا نے ان کا مزاج ٹھیک کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

سارہ کے سسرال والے تھوڑی دیر میں آگئے تھے۔ سب ہی لوگ بہت خوش تھے۔ بس ابو سمیت ان دونوں بہنوں نے چھوٹی پھپھو کی کمی شدت سے محسوس کی۔

"ابو! اگلے ہفتے ہم بھی چلیں گے آپ کے ساتھ پھپھو کے گھر۔" رات گئے تک فارغ ہونے کے بعد سب ہی تھکن سے چور تھے' مگر نیند کسی کو نہیں آرہی تھی۔

"ہاں ضرور' تم لوگ بھی چلنا۔" ابو نے ہامی بھرلی۔



"ماموں! ماموں!" عالیہ سسکتی ہوئی ان کے سینے سے آلگی۔

"امی آپ کو بہت یاد کررہی تھیں اور یاد کرتے کرتے ہی دنیا سے چلی گئیں۔" وہ اب بری طرح رو رہی تھی۔

"بس اچانک ہی چٹ پٹ ہوگئی بے چاری' ایسی تو بیمار نہیں تھی نہ کوئی عمر اتنی تھی۔" وہ پھپھو کی محلے دار تھیں۔ زارا کے برابر میں بیٹھی ایک دوسرے سے باتیں کررہی تھیں۔

"بس اللہ کی مرضی یہ ہی تھی' ناگہانی آگئی۔" دوسری خاتون نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

بہت سی خواتین پھر پھر اپنی باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ زارا نے سپارہ اٹھایا اور ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ آنسو تھے کہ اُمڈے ہی چلے جارہے تھے۔ خود پر قابو پاکر اس نے سپارہ پڑھنا شروع کردیا۔

آج سارہ کی منگنی کو چوتھا روز تھا۔ دوپہر میں فون آیا ان کے انتقال کا تو کتنی دیر تک تو یقین ہی نہ آیا' اپنے بہن' بھائیوں میں سب سے چھوٹی' پھر بیماری بھی کوئی ایسی نہیں تھی کہ اس قسم کا کوئی اندیشہ ہوتا' سپارہ پڑھنے کے دوران زارا کے خیالات کی رو بار بار بھٹک رہی تھی۔

"کاش! ہم کم از کم ایک بار تو ضرور ہی آجاتے' ان سے مل لیتے' پچھلی بار جب وہ لوگ آئے تھے اس بات کو ایک ماہ سے بھی اوپر ہوچکا تھا۔" زارا یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

اور یہ وقت بھی گزر ہی گیا' یہ پہلا دن' دوسرا دن اور تیسرا دن گزار کر وہ لوگ رات میں گھر واپس آئے تو رات گئے تک پھپھو کی باتیں اور اپنی یادیں ایک دوسرے سے شیئر کرتی رہیں۔

ابو پہلے بھی بہت زیادہ نہیں بولتے تھے' مگر اب تو بالکل ہی گم صم ہوگئے تھے۔ انہیں رہ رہ کر یہ خلش ستا رہی تھی کہ اپنی زندگی میں سے فقط ایک دن وہ اپنی بیمار بہن کی عیادت کے لیے نہیں نکال سکے۔ صرف ایک دن؟ اب باقی تمام عمر کے لیے ایک پھانس سی جیسے سینے میں گڑ گئی تھی۔

اگلے دن ان کے محلے کی صفیہ بوا گھر آئی تھیں تعزیت کے لیے۔

"میرے سامنے کی بچی تھی' نظروں کے سامنے پلی بڑھی' جوان ہوئی' شادی ہوئی اور اب یوں جھٹ پٹ اللہ کو پیاری ہوگئی' چلو یہ اچھا ہوا کہ اپنے دو بچوں کی خوشی تو آپنے سامنے دیکھ لی۔" صفیہ بوا نے بولتے ہوئے آہ بھری۔

"اللہ جنت میں جگہ دے' میں برائی نہیں کررہی' مگر ایک حقیقت بیان کررہی ہوں۔" صفیہ بوا نے آگے کچھ کہنے کی تمہید باندھتے ہوئے رک کر سانس لی' پھر کہنے لگیں۔

"دونوں بہنوں نے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تمہارے ساتھ اور وہ بڑی والی تو۔۔۔۔"

"بس چھوڑیں بوا! اب وہ اس دنیا سے چلی گئی' مرے ہوئے کی برائی کیا کرنا' مجھ سے انہیں جو تکلیف تھی اللہ اس کے لیے مجھے معاف کرے' رہا میرا معاملہ تو میں نے اسے بھی معاف کیا اور باقی سب کو بھی۔ دو دن کی زندگی ہے' سارے جھمیلے یہیں دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔" امی خاصی آزردگی سے بولیں' نند کی یوں اچانک موت سے انہیں بھی خاصا دھچکا لگا تھا۔

"ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ میری شادی کے بعد ان لوگوں کی تائی کا بھی میری سسرال میں بہت عمل دخل تھا۔ وہی دونوں بہنوں کو میرے خلاف بھڑکاتی تھیں۔ کئی بار میں نے خود اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی تھیں۔ میری دونوں نندوں کا بھی کیا قصور' عقل میں کم' عمر میں بھی کم اور پھر سکھائے سے تو پتھر بھی چل پڑتے ہیں' چلتر ہوتیں تو اپنی شادیوں کے بعد بھی اپنا رویہ خراب رکھتیں مجھ سے' مگر دونوں کی شادیوں کے بعد کبھی ہماری تو تو میں میں نہیں ہوئی۔"

امی بے حد صاف گوئی اور فراخ دلی سے اعتراف کررہی تھیں اور کچن میں بوا کے لیے شربت بناتی سارہ ان کی باتیں سن سن کر حیران تھی۔

"چائے پیجیے بوا!" اس نے جاکر چائے کی ٹرے ان کے سامنے رکھی۔

سارہ کے سسرال والے تعزیت کے لیے ان کے گھر بھی آئے تھے۔ ویسے تو وہ پھپھو کے بھی گئے تھے۔ منگنی کا پلٹاوا فی الحال مؤخر کردیا گیا تھا۔ امی' ابو نے یہ طے کیا تھا کہ چالیسویں کے بعد گھر کے ہی افراد سارہ کے سسرال جاکر منگنی کا سامان دے آئیں گے۔ سارہ کے ساس' سسر تو ان تکلفات سے بھی منع کررہے تھے کہ اب کچھ دینے دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔



"یہ آپ کے بچے بھی نا' بالکل آپ پر گئے ہیں۔

ایک منٹ جو سکون سے بیٹھ جائیں' ہر وقت بس ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہو' گھر میں کام کیا کم ہیں کہ ان کی شرارتیں بھی بھگتو اور آپ۔" اس نے غصے سے میاں کو گھورا۔

"اس لیے آپ کی نگرانی میں چھوڑ کر گئی تھی کہ ذرا دیکھ لیں گے' مگر آپ بھی چھٹی والے دن اخبار میں منہ دے کر جو بیٹھتے ہیں تو پھر ہوش نہیں رہتا' نہ اپنا' نہ کسی اور کا۔" بیٹے کے گیلے کپڑے وہ اتار کر آئی تھی' اب اس کا بدن خشک کرتی جا رہی تھی اور بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

ابھی بمشکل دس منٹ ہوئے تھے اسے کمرے سے نکلے ہوئے' تینوں بچوں کو کمرے میں چھوڑ کر وہ کچن میں گئی تھی کہ ناشتے کے برتن وغیرہ دھو کر اور کچن صاف کرکے دوپہر کے کھانے کی تیاری کرے۔ دیورانی اپنے میکے گئی ہوئی تھی — سارہ کی طبیعت صلح جو قسم کی تھی' لہٰذا بہت خوش اسلوبی اور اچھے انداز میں سسرال کی گاڑی چلی' پھر گزرے پانچ سالوں میں بہت کچھ تبدیلیاں آئیں۔ ساس کا انتقال ہو گیا۔ دونوں نندوں اور ایک دیور کی یکے بعد دیگرے شادی ہوئی۔

سارہ کے تین بچے ہو گئے' سب سے بڑا عاطف' پھر مشعال اور کاظم جڑواں تھے' چونکہ اب ان کی اپنی فیملی تھی اور کمروں کی زیادہ ضرورت تھی۔ لہٰذا نیچے کا پورشن سارہ اور ندیم کو دے دیا گیا۔ دونوں نندوں کی شادی کے بعد سارہ پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ پھر چھوٹے چھوٹے تین بچے' دیورانی عادت مزاج کی تو اچھی تھی' مگر کام کے معاملے میں ذرا ڈھیلی اور لاپروا۔

سارا نے کچھ تو یہ سوچ کر نظرانداز کیا کہ نئی نئی ہے کچھ دنوں میں خود ہی ایڈجسٹ ہو جائے گی' پھر اسے خود سے کام کے معاملے پر عنبرین سے کچھ کہنا عجیب بھی لگتا تھا ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے اور کچھ اس لیے بھی لحاظ کیا ہوا تھا کہ عنبرین کے بھائی سے ہی اس کی ایک نند ہما کی شادی ہوئی تھی۔ دونوں کالج فیلو تھیں ابتدا میں تو وٹہ سٹہ کا کوئی خیال بھی نہیں تھا۔ پہلے سارا کی نند ہی شادی ہو کر وہاں گئی تھی پھر سارا کے دیور نے عنبرین کے لیے پسندیدگی ظاہر کی تو اس کے سسر کو کچھ تحفظات تھے کہ یہ ادلا بدلا ہو جائے گا۔ آگے چل کر کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نہ ہو' مگر ان کے کمزور سے اعتراض کو کوئی خاطر میں نہیں لایا اور یوں یہ شادی ہو گئی۔ دیورانی کے آجانے سے سارہ پر سے کام کا بوجھ گھٹا نہیں' بلکہ ذمہ داریاں کچھ اور بڑھ گئیں۔ وہ رات کو سونے لیٹتی تو تھک کر چور ہو چکی ہوتی۔

"اللہ! سچی شادی سے پہلے کی زندگی اچھی ہوتی ہے' نہ کوئی ذمہ داری' نہ ٹینشن' شادی کے بعد تو انسان پھرکی بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو دل بھر کے سونے اور آرام کو بھی ترس جاتی ہوں۔" سارہ کبھی کبھار اپنے دکھڑے زارا کے ساتھ ہی رو لیا کرتی تھی۔ جو خود بھی ایک بیٹی کے ساتھ اپنی شادی شدہ زندگی انجوائے کر رہی تھی۔

"یہ ہم تم جیسے بے وقوف ہی ہیں جو یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ دنیا میں کئی عقل مند موجود ہیں جو ہر فکر سے آزاد بالکل ٹینشن فری' جیسے ہماری بھابھی صاحبہ۔" زارا کا لہجہ طنز سے بھرپور ہوتا۔

"چھوڑو بھی' ابھی دو ماہ تو ہوئے ہیں شادی کو' آہستہ آہستہ خود ہی سیٹ ہو جائے گی۔" سارہ کو سب کے متعلق اچھے گمان ہی رہتے تھے۔



"یہ اچھی مصیبت ہے' اپنے سسرال میں بھی اپنی ہڈیاں گھستے رہو' ساری ذمہ داریاں نبھاؤ' سارے کام کرو اور اپنے گھر آؤ تو یہاں بھی خود ہی کرکے کھاؤ' ایک کپ چائے پینے کے لیے بھی خود ہی بنانی پڑتی ہے' اچھی بھاوج آئی ہے ہمارے گھر' نہ کوئی ذمہ داری' نہ کوئی فکر' ہمارے گھر ہوں تو بیمار بن کے بستر پر پڑی رہتی ہیں۔ ورنہ میکے بھاگ جاتی ہیں' پتا نہیں کس جرم کی سزا ملی ہے ہمیں' جو علی کی شادی ایسی لڑکی سے کر دی' کاہل' نکمی' نخرے باز۔"

زارا جس تیزی کے ساتھ برتن دھو دھو کر رکھ رہی تھی اسی فراٹے کے ساتھ اس کی بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

"کسے سنا رہی ہو یہ سب؟" سارہ نے پلاؤ کے لیے یخنی چڑھاتے ہوئے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"دیواروں کو۔" زارا نے چڑ کر جواب دیا اور پتیلی کو زور زور سے مانجھ کر اس پر ہی اپنا غصہ اتارنے لگی۔ ویسے اس کا غصہ کچھ اتنا بے جا بھی نہیں تھا۔

آج چھٹی کے دن وہ دونوں میکے آئی ہوئی تھیں۔ زارا قریب رہتی تھی۔ جلدی آگئی تھی' وہ یہاں آئی تو علی اور انیلا ناشتا کر کے فارغ ہو چکے تھے اور انیلا گھر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

"اچھا طریقہ ہے کہ نندیں گھر آئیں تو خود اپنے میکے چل دو' ہم تو اپنے سسرال میں کبھی ایسے نہیں کرتے اور ابھی پچھلے ہفتے تو واپس آئی ہیں' دو ہفتے رہ کر' اب پھر جانے کی کیا تک ہے؟ اور یہ علی؟ یہ تو بالکل ہی بیوی کا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔" زارا امی کے سامنے اپنے جی کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ اسے شدید غصہ آرہا تھا انیلا کی اس حرکت پر۔

"آپ نے ناشتہ کر لیا؟" امی کی چپ چاپ صورت دیکھ کر زارا نے موضوع بدل دیا۔

"ہاں!" انہوں نے مختصر جواب دیا۔ "آپ دونوں کے کھانے پینے کا خیال رکھتی ہیں محترمہ؟ اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہیں آپ؟"

زارا کو اب امی' ابو دونوں کی فکر لاحق ہوگئی۔ امی خود بھی بہت ایکٹیو تھیں کام کے معاملے میں' کبھی فارغ نہیں بیٹھتی تھیں۔ مگر اب جوڑوں کے درد نے انہیں بستر سے لگا دیا تھا۔

"چھوڑو' اب کیا کہیں؟ بہو کو کیا دوش' جب بیٹے پر کوئی زور نہ ہو۔" امی آزردہ ہوگئیں۔

انہیں علی سے یہ توقع نہیں تھی کہ شادی کے بعد وہ یوں بے دام غلام بن جائے گا اپنی بیوی کا اور انہیں اپنے لیے تو کوئی خواہش یا مطالبہ نہیں تھا' بہو' بیٹے

سے، مگر اس وقت سچ مچ ان کا دل بہت کڑھتا تھا' جب ان کی بیٹیاں گھر آتیں اور آتے ہی مختلف کاموں میں لگ جاتیں۔

"آپ دونوں نے بھی بہت شہہ دی ہوئی ہے۔" زارا بولتی رہی اور اپنا کام کرتی رہی اور جب وہ چائے بنانے کچن میں گئی تو غصے کے مارے اس کا برا حال تھا۔ سنے ہوئے برتنوں کا ڈھیر اور پھیلا ہوا کچن۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پہلے چائے بنا کر میاں کو دے یا پھر کچن صاف کرے؟ ایسی حالت میں تو کوئی کام کرنا بھی محال بھی تھا۔ اوپر سے اس کا غصہ' وہ یوں ہی تذبذب' کوفت اور غصے کی حالت میں کھڑی تھی کہ سارہ آن پہنچی۔

"چلو یہ سب ابھی رہنے دو' تھوڑی دیر میں کرلیں گے' پہلے چائے بنالیتے ہیں۔"

سارہ نے صورت حال سے آگاہ ہونے کے بعد تجویز پیش کی۔ اسے کچن کا منظر دیکھ کر کوفت تو بہت ہوئی' مگر کچھ اس کی فطرت میں تحمل اور برداشت کا مادہ تھا اور کچھ یہ کہ وہ اس قسم کے مناظر کی عادی ہو گئی تھی۔

چائے بنانے' پینے اور پلانے سے فارغ ہو کر سارہ نے کھانا پکانے کی تیاری شروع کردی اور زارا برتن دھونے میں لگ گئی۔

"اتنا آرام اور سہولت ہوتے ہوئے بھی کام نہیں ہوتا' کاہلی اور لاپروائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔" زارا شروع ہو گئی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں۔" سارہ نے لہسن چھیلتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

"تم اور عادتیں خراب کردو' کام کر کر کے رکھ جاتی ہو' تاکہ محترمہ کو انگلی بھی نہ ہلانی پڑے۔" زارا نے اسے ڈانٹا۔

"ذرا سی دیر کا کام ہے' میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں اسے بھی کر ڈالوں۔" سارہ نے رسان سے جواب دیتے ہوئے' پسا ہوا لہسن ادرک' بوتل میں ڈال کر ڈھکنا لگایا اور اسے فریج میں رکھ دیا۔

"سارہ! یہ ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ہم نے تو اپنی سسرالوں میں ایسا نہیں کیا۔ جیسے ہمارے گھر میں ہماری بھابھی کررہی ہیں' ہمیں کس بات کی سزا ملی ہے۔ علی کو کتنے لاڈ پیار سے پالا تھا' وہ بھی کیسا بدل گیا' اسے امی' ابو کا ذرا خیال نہیں۔" زارا بہت دکھ کے ساتھ بول رہی تھی' آواز کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

"پاگل ہو تم' فوراً جذباتی ہو جاتی ہو۔" سارہ پیار سے اسے دیکھ کر مسکرائی "ایک تو یہ کہ ہماری یہ مصیبت یا مشکل ہمارے گناہوں کی سزا نہیں ہوتی' کبھی کبھار اللہ کی طرف سے ہماری آزمائش بھی ہوتی ہے کہ ہم اس پر بھروسہ رکھتے ہوئے کتنے صبرو تحمل اور برداشت سے کام لیتے ہیں اور دوسری بات یہ کہ لڑکیاں جب شادی ہو کر سسرال جاتی ہیں تو ایڈ جسٹمنٹ میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ انیلا بھی سیٹ ہو ہی جائے گی۔ ہمارے گھر میں اول ہے ہی کون؟ اول آخر کام تو اسے ہی کرنا ہے۔" سارہ چاول چنتے چنتے رسان سے بولتی جارہی تھی۔

"نہ وہ سیٹ ہوگی نہ گھر سنبھالے گی۔ وہ اس گھر میں مہمانوں کی طرح سے رہ رہی ہے اور ایسے ہی رہے گی' غیر ذمہ دار لاپروا اور خود غرض۔" زارا پھر اپنی جون میں واپس آگئی۔



سارہ گھر آئی تو تھکی ہوئی تھی۔ اپنے گھر سے کام کر کے پھر میکے گئی تھی۔

وہاں بھی سارا دن ان ہی دھندوں میں گزرا' اب واپس آئی تو معلوم ہوا کہ عنبرین میکے چلی گئی' دوپہر کو تو اس نے کھانا پکا کے سب کو کھلا دیا۔ مگر اب رات میں؟ اسے معلوم تھا کہ سارہ رکنے نہیں جارہی' شام میں واپس آجائے گی' لہٰذا وہ بڑے اطمینان سے اپنے گھر چلی گئی۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ندیم! انسان کو کچھ تو احساس ہونا چاہیے' اپنی ذمہ داریوں کا' میکے اور سسرال کی

زندگی میں کچھ فرق ہوتا ہے یا نہیں۔"

سارہ کب تک کس کس بات کو نظرانداز کرتی' شوہر کے سامنے احتجاج پر مجبور ہو ہی گئی۔

"اب کون کہے؟ امی ہوتیں تو کچھ اور بات تھی' ابا کا تو تمہیں پتا ہے ان سب معاملات میں بولتے ہی نہیں' میرا اور تمہارا بولنا کہیں ناگوار نہ لگے عنبرین کو' پھر وہ ہما کی نند بھی ہے' سسرالی رشتوں میں بڑی نزاکتیں ہوتی ہیں اور پھر خاص طور پر اس طرح کے ادلے بدلے کے رشتوں میں۔" ندیم کے انداز میں بے بسی تھی۔

"ہما بھی تو وہاں کام کرتی ہے' ذمہ داری کے ساتھ رہ رہی ہے۔" سارہ اپنی بیٹی کو تھپکتی ہوئی تھوڑا غصے میں آ گئی۔

"چلو' میں ہوٹل سے لے آتا ہوں نہاری روٹی' تم آرام کرو' بلکہ عیش کرو۔" ندیم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پھر بھی صبح تو یہ دونوں لنچ لے کر جائیں گے' ان کے لیے تو کچھ پکانا ہوگا۔"

سارہ کا اشارہ اپنے دیوروں کی طرف تھا۔ دونوں صبح کھانا لے کر جاتے تھے۔ ایک تو نخریلا تھا' اسے باہر کی چیزیں پسند ہی نہیں تھیں اور اگر ہوتیں بھی تو تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ پورے مہینے کھانا خرید کے کھانا افورڈ کر لیتا۔ کینٹین کا کھانا ایک' دوبار کھایا تو بقول اس کے انتہائی بدمزہ اور بے کار صرف اور صرف پھینکنے کے قابل' گھر کے پکے کھانے کی بات ہی کچھ اور ہے۔

دوسرے دیور کے ساتھ معدے کی پرابلم تھی۔ باہر کے غیر معیاری اور چٹ پٹے کھانے اسے ہضم نہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھار کی بات الگ تھی۔ مگر روٹین میں وہ باہر کے کھانے نہیں کھا سکتا تھا۔

"اور ابا بھی کہاں پسند کرتے ہیں بازار کے کھانے' تندور کی روٹی تو ان سے کھائی بھی نہیں جائے گی' چلو میں دیکھتی ہوں کچن میں۔" سارہ اٹھ گئی۔

شکر ہے کہ کچن صاف ستھرا پڑا تھا۔ برتن دُھلے ہوئے تھے۔ دوپہر کا تھوڑا سا مٹر قیمہ بچا رکھا تھا۔ چلو' ابا کے لیے تو انتظام ہو گیا' باقی لوگ نہاری روٹی کھا لیں گے۔ صبح کے لیے شامی کباب دے دوں گی دونوں کو۔

سارہ نے فریزر کھول کر جائزہ لیا' چھ' سات شامی کباب رکھے ہوئے تھے۔ روٹیاں پکا کر اس نے دودھ گرم کیا اور بچوں کو دیا۔

رات سونے لیٹی تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے دل میں عنبرین کی طرف سے ایک گرہ پڑ گئی تھی۔



"میں تو نہیں جاؤں گی' بسم اللہ میں' علی نے پہلے بھی یہی کیا تھا۔ جب بیٹے کا عقیقہ کیا تو اپنے سسرال والوں کو تین دن پہلے ہی خود جا کر دعوت دے کر آیا اور ہمیں ایک دن پہلے' وہ بھی رات میں فون کر دیا کہ کل عقیقہ میں آ جانا' آج بھی یہی کیا کہ کل بسم اللہ ہے تمہارے بھتیجے کی' یہ کوئی طریقہ ہے دعوت دینے کا؟ ہماری بھی سسرال میں کوئی عزت ہے' یہ لوگ کیا کہیں گے' یہ ٹیلی فونک دعوتوں سے ویسے بھی یہ لوگ ذرا چڑ جاتے ہیں کہ ہماری کوئی ویلیو نہیں' جو گھر آنے کے بجائے فون پر بلا دے دیا۔"

زارا نان اسٹاپ بولے چلے جا رہی تھی سارہ ہمیشہ کی طرح خاموشی اور تحمل سے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا پتا علی کے پاس اتنا ٹائم نہ ہو اور پھر تمہارا گھر آؤٹ آف وے بھی تو ہے' رکشا' ٹیکسی کے بغیر انسان پہنچ ہی نہیں سکتا' علی بتا رہا تھا کہ اس کی بائیک ٹھیک ہونے کو دی ہوئی ہے' وہ خود آج کل پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کر رہا ہے۔" سارہ نے علی کی حمایت کی۔

"رہنے دو۔" زارا تڑخ کر بولی۔ "جب میرا سسرال قریب تھا تب وہ کون سا آتا تھا۔ علاقہ آؤٹ آف وے ہے سارہ! تم بھی نا' بہت اس کی چمچہ گیری کرنے لگی ہو' وہ بھی بلاوجہ میں۔" زارا اتنی تپی ہوئی تھی کہ اس کے غصے کی لپیٹ میں سارہ بھی آ گئی۔

"بلاوجہ نہیں۔ میری پیاری بہن اس کی ایک وجہ ہے۔" سارہ نے اسے دل ہی دل میں مخاطب کیا۔ وہ ان دنوں کو کیسے بھول سکتی تھی' جب ابو شدید بیمار تھے' اپنے انتقال سے دو دن پہلے انہوں نے سارہ سے بہت

ساری باتیں کی تھیں۔
"سارہ!" انہوں نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔
"میرے بعد تم اپنی امی کا خیال رکھنا علی اور زارا کا بھی' زارا جذباتی ہے اور علی لاپروا' دونوں میں آئے دن چھوٹا موٹا جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ شادی شدہ بھائی' بہنوں میں یہ جھگڑے اور لڑائیاں کبھی کبھار ہمیشہ کی جدائی بن جاتے ہیں' تم ان دونوں کو سمجھاتی رہنا' میں چاہتا ہوں تم سب مل کر رہو۔ ایک دوسرے کے لیے دلوں میں گنجائش ہو' پیار محبت ہو۔" وہ دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔
"آج تک پچھتاتا ہوں کہ میں اپنی بہن سے اس کے آخری دنوں میں مل نہ سکا' کوئی بات نہ کر سکا۔" تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولے۔
سارہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"سچ کہوں تو میں ان دونوں کے گھر کم ہی جاتا تھا کہ تمہاری امی کو ناگوار گزرتا تھا اور وہ بھی اپنی جگہ شاید ٹھیک ہی تھیں' ان سے کچھ اچھا سلوک نہیں ہوا تھا' مگر جب تمہاری پھپھو بیمار پڑیں تو میں چاہتے ہوئے بھی نہ جا سکا' یہ ہمیشہ کا پچھتاوا میرے ساتھ رہے گا کہ میں نے اپنے سگے رشتوں کو ایسے نہیں نبھایا جیسے نبھانا چاہیے تھا۔ سارہ' میں یہ ذمہ داری تمہیں سونپ کر جا رہا ہوں کہ تم اپنے بہن' بھائی کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کرتی رہو گی۔ تم بڑی سے بڑی بات بھی برداشت کر سکتی ہو' درگزر کر سکتی ہو' مگر علی اور زارا دونوں اس صفت سے محروم ہیں۔ تمہیں پل بننا ہو گا دونوں کے بیچ۔"
سارہ نے بہت غور سے ابو کی باتیں سنی تھی اور بہت دھیان سے انہیں اپنے دل و دماغ میں بٹھایا تھا۔
اور پھر ابو کے انتقال کے بعد کچھ عرصے تک تو سب کچھ اک دم ٹھیک ہو گیا تھا۔ علی بہت ذمہ دار اور بردبار ہو گیا تھا۔ زارا کی تنقید اور طنز بھی جیسے کہیں کھو گیا تھا۔ مگر کچھ عرصے بعد پھر وہی سب کچھ دوبارہ شروع ہو گیا۔ انیلا کی بے نیازی' علی کا لاپروائی پن اور زارا کی تنقید' سارہ ہمیشہ ثالث کا کردار ادا کرتی' اور آج اس وقت بھی وہ یہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "اب تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا' کچھ تو بولو۔" اس کی خاموشی پر زارا جھنجلا گئی۔
"یہ بات نہیں ہے زارا! تم میری بہن ہو اور علی میرا بھائی' میرے لیے تم دونوں برابر ہو' دیکھو ابو کے بعد علی ان کی جگہ ہے' ہم سے چھوٹا ہے تو کیا ہوا' وہ اور امی ہمارا میکہ ہیں' تم خود سوچو تمہاری اور علی کی یہ ناراضیاں اور رنجشیں کیا امی کو اچھی لگتی ہوں گی؟ امی کی وجہ سے تحمل اختیار کر لو' تم لوگ ایسے لڑتے رہے تو آگے کیا کرو گے؟" سارہ کی آواز بھرا گئی بولتے بولتے اسے رونا آنے لگا۔
"افوہ! اب روؤ تو نہیں۔" زارا گھبرا گئی۔
"میں بھی سب سمجھتی ہوں' رشتوں کی اہمیت بھی اور معاملات کی نزاکتیں بھی' لیکن بس مجھے غلط بات پر غصہ آجاتا ہے' میں کیا کروں۔" زارا کچھ دیر بعد صاف گوئی سے بولی۔
سارہ کچھ کہے بغیر چپ چاپ سنتی رہی۔
"تو پھر تم کب تک جاؤ گی؟" تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد زارا نے ہی سوال کیا "علی تو کہہ رہا تھا صبح سے آجانا۔"
"دیکھو' ویسے میرا جلدی جانا تو مشکل ہے' شازیہ لوگ شفٹ ہو رہے ہیں نا اپنے فلیٹ میں' تو ان کا سامان جائے گا اسی روز' پھر میں دوپہر کے بعد ہی نکل سکوں گی گھر سے۔" سارہ کچھ سوچتے ہوئے بتانے لگی۔
"تمہاری یہ نئی نویلی دیورانی بڑی اچھی رہیں' ایک سال نہیں ہوا شادی کو اور سارے جھنجھٹوں سے جان چھڑا کر اپنے نئے فلیٹ میں بھی شفٹ ہو گئیں' اپنا حصہ بھی لے لیا۔" زارا ہنسی۔
"میکے کی سپورٹ ہے ورنہ اتنی جلدی کہاں سے فلیٹ خرید لیتے' چلو اپنی اپنی قسمت' ویسے محترمہ کا ہمارے گھر میں گزارا مشکل ہی تھا۔ یہ سال بھر بڑے ناز نخروں میں گزرا۔ اکلوتی ہیں نا تو شور شرابے اور لوگوں کے درمیان رہنے کی عادت نہیں۔ بھرے

رے گھر میں ان کا دل گھبراتا ہے' یہ تو چچی عنبرین سے بھی گئی گزری نکلی۔" سارہ اسی سے ہی اپنی باتیں ڈسکس کرتی تھی۔

"چلو چھوڑو یہ سب' تم بتاؤ' دوپہر تک آجانا' میں بھی کوشش کروں گی کہ آجاؤں' کچھ وقت امی کے ساتھ گزارنے کو بہت دل چاہ رہا تھا' کتنے دن ہوگئے ان سے تفصیلی ملے ہوئے' بس جاتے ہیں اور تھوڑی دیر میں مل کر آجاتے ہیں۔ گھر سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی اور جب سے چاروں نے اسکول جانا شروع کردیا اور ہی بندھ گئے گھر سے' رہنے کے لیے میکے جانا تو ایک خواب بن گیا ہے۔" سارہ یاسیت سے بول رہی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے میں دوپہر تک آجاؤں گی۔" زارا نے ہامی بھری۔

"اچھا خدا حافظ!"



"امی' میری پیاری امی' جانے دیں نا' میری ساری فرینڈز جارہی ہیں' سب کو پرمیشن مل گئی گھر سے' ایک آپ ہی اتنی سنگ دل بن رہی ہیں۔" بیٹی نے بولتے بولتے منہ پھلالیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتیں یہ اسکول کی پکنکس' ہر جگہ تو تمہارے ابو گھماتے ہی رہتے ہیں۔" امی نے صاف انکار کیا۔

"امی! آپ کے کون سے کپڑے پریس کروں؟" مشعال نے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

"میرے کپڑے رہنے دو' تم لوگ اپنے ابو کے ساتھ چلے جانا' میں گھر پر رہوں گی۔" سارہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا! بدلہ!" مشعال نے اچھا کو معنی خیز انداز میں کھینچتے ہوئے اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں کہا۔

"بدلے ودلے کی کوئی بات نہیں' بس میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" سارہ نے خفیف ہوتے ہوئے جواب دیا۔ (ایک تو یہ آج کل کی اولاد۔

"اونہوں' یہ ہی بات ہے۔" مشعال نے ٹھوڑی سہلایا۔

"چونکہ شازیہ چچی عید پر ہمارے گھر نہیں آئی تھیں' اور آپ نے اعلان کیا تھا کہ اب آپ بھی ان کے گھر نہیں جائیں گی۔ اس لیے آج ان کی چھٹکی کی سالگرہ میں آپ کا بائیکاٹ' ٹھیک ہے نا؟"

"چپ کرو' بہت بولنے لگی ہو۔" سارہ نے پٹر پٹر بولتی اپنی بیٹی کو گھورا۔

"امی ڈارلنگ! آپ بھول رہی ہیں کہ عید کے تیسرے روز ان کے ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ اسپتال میں تھے' اس لیے وہ نہیں آسکیں۔" مشعال اپنے کپڑوں پہ گرم استری پھیرنے لگی۔

"رہنے دو بلاوجہ کی حمایت' عنبرین کے' حنا اور بڑی آپا سب کے تو گھر تو وہ عید مل آئیں اور یہیں ہمارے گھر سب سے بڑے بھائی' بھاوج کے گھر آنے کی توفیق نہیں ہوئی ہمارے دیور اور دیورانی کو' پورے سال میں فقط عید' بقرعید پر تو ہمارے گھر آتے ہیں یہ لوگ' اس سال وہ بھی گول' دراصل یہ لوگ ہم سے تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتے۔" سارہ بول بال کر خاموش ہوگئی۔

"پھر' امی! آپ کا کون سا سوٹ نکالوں؟" مشعال کا اطمینان دیدنی تھا۔

"تمہارے ابو نے تمہیں سر پر چڑھالیا ہے' بہت اور بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔" سارہ نے بیٹی کی "ڈھٹائی" پر اسے گھورا۔

"اب اس میں بے چارے ابو کا کیا قصور ہے؟ آپ چھوڑیں نا یہ سب' جلدی سے تیار ہوجائیں' واپسی پر نانو کے گھر چلیں گے۔" مشعال نے اپنا منصوبہ اسے بتایا۔

علی اور زارا کی جھڑپیں بلکہ جھگڑے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم یا ختم ہونے کے بجائے بڑھے ہی تھے۔ ہمیشہ سارہ دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کراتی آئی تھی۔ اب کی بار بھی کچھ یہ ہی ہوا' امی کے پتے کا آپریشن ہوا تھا۔ زارا نے اسپتال میں ہی اعلان کردیا تھا

کہ وہ امی کو اپنے گھر لے جائے گی۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے' امی اپنے گھر آئیں گی' میں دیکھ بھال کروں گا امی کی اور انیلا بھی۔" علی نے فوراً "اپنا فیصلہ سنایا۔
"تم تو سارا دن اپنی جاب پر ہوتے ہو' امی کی دیکھ بھال کہاں سے کرو گے اور رہی بات تمہاری بیوی کی تو پچھلا ریکارڈ ہی ماشاء اللہ بہت شان دار ہے اور ابھی اسپتال میں ہی دیکھ لو' ایک ہفتے میں فقط دو چکر لگائے ہیں ساس کی عیادت کے لیے' وہ کیا خیال رکھے گی' لے جا کے ایک طرف کونے میں ڈال دے گی امی کو اور تمہاری آنکھیں تو ویسے بھی بند ہی رہتی ہیں۔" زارا کا تیکھا لہجہ اور طنزیہ گفتگو تلخ ضرور تھی' مگر اس میں بہت کچھ سچائی بھی تھی۔
"بچوں کا ساتھ ہے اب وہ گھر اور بچوں کو دیکھے یا یہاں کے چکر لگائے اور رہنے کو تو تم نے ہی منع کر دیا تھا' تم اور سارہ آپا رک تو رہی ہو' امی کے پاس۔" علی اپنی بیوی کی حمایت کرنے سے باز نہیں آتا تھا اور یہ ہی بات زارا کا موڈ اور خراب کرتی تھی۔
امی کی اسپتال سے چھٹی ہوئی تو زارا نے اپنی من مانی کی اور انہیں اپنے گھر لے گئی۔
"جب ٹھیک ہو جائیں تو چھوڑ دوں گی تمہارے گھر' دوبارہ بیمار کرنے کے لیے۔" فون پر وہ علی پر طنز کرنا نہ بھولی۔
علی نے اس کی ساری شکایتیں سارہ سے کیں۔ جو کہ وہ ہمیشہ ہی کرتا تھا۔
"یہ ہمیشہ میری بے عزتی کرواتی ہے' لوگ کیا کہیں گے کہ میں نے اپنی ماں کو بہن کے گھر رہنے کے لیے چھوڑ دیا' اب کسی کو کیا پتا کہ ہماری بہن صاحبہ ہی کیسی ہٹلر ہیں۔"
"دیکھو علی! سمجھنے کی کوشش کرو' امی کو اس وقت کیئر کی ضرورت ہے' انیلا خود بچوں میں اور گھر کے کاموں میں الجھی ہوئی ہے' اس پر بہت بوجھ پڑ جائے گا۔ اس لیے زارا امی کو اپنے گھر لے گئی ہے' اس میں تمہیں بے عزت یا ذلیل کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ امی کی طبیعت کچھ بحال ہو گی تو تم اور انیلا جا کر لے آنا' ان کا غسل صحت بھی کر لینا تم اپنے گھر پر۔"
"آپ ہی جا کر لے آیئے گا امی کو' میں زارا کے گھر نہیں جاؤں گا۔" علی اٹل لہجے میں طوطے کی طرح ایک ہی بات رٹ رہا تھا۔
"اُفوہ!" سارہ عاجز آ گئی' اس نے اس وقت تو بات ختم کر دی' مگر ہار نہیں مانی' بعد میں دو گھنٹے ٹیلی فون پر لگائے۔
مشعال کی زبانی علی کے زارا کے گھر جانے کا سن کر سارہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔
"میں نے آپ کا کاسنی والا سوٹ نکال لیا ہے۔ آپ اس رنگ میں بہت پیاری لگتی ہیں' بقول ابو کے۔" مشعال نے آخری جملے کا اضافہ ذرا ٹھہر کر کیا تھا۔
"یہ آج کل کی اولاد؟" سارہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی۔



"مما میری پیاری مما' جلدی' جلدی' جلدی کریں' بہت لیٹ ہو رہا ہوں میں۔" عاطف شور مچاتا ہوا کچن میں آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔
"ممی جان' پلیز جلدی۔" کرسی پر بیٹھا تھا بھی وہ بے قرار ہی ہو رہا تھا اور عادت کے مطابق ماں کو مختلف ناموں سے پکار رہا تھا۔
"ایک منٹ۔" سارہ نے اپنے چھ فٹ اونچے خوبرو بیٹے کو کچھ فخر اور بہت محبت سے دیکھا۔
"تم جانتی ہو ماں!" اس نے ڈرامائی انداز اختیار کیا۔ "بھوک میں میرے پیٹ میں چوہے نہیں دوڑتے بلکہ آنکھوں کے سامنے تارے اور چاند ناچنے لگتے ہیں۔"
"میرے ہیرو بھائی کے ڈائیلاگز پورا محلہ سن رہا ہے' ذرا آہستہ اور ذرا آہستہ۔" اندر آتی مشعال نے اس پر فقرہ کسا۔
"مشی بیٹا! ذرا چائے تو نکال دو۔" سارہ نے پراٹھا

اور سالن عاطف کے آگے رکھتے ہوئے مشعال سے کہا۔

"تم پراٹھا کھاؤ گی یا توس؟" سارہ نے اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں صرف چائے۔"

"اوہو' ڈائٹنگ۔" عاطف ہنسا۔

مشعال کا وزن اس کے قد اور عمر کے حساب سے ذرا زیادہ تھا' اور کچھ ویٹ کانشنس بھی تھی۔

"پاگل ہو رہی ہو کیا۔ کھانا چھوڑنے سے وزن کوئی کم نہیں ہوتا' الٹا صحت خراب ہو جاتی ہے۔ چلو ناشتا کرو ٹھیک سے۔" سارہ نے اسے ڈانٹا۔

"ڈائٹنگ کی بات نہیں ہے امی!" مشعال ٹھنکی۔ "صبح صبح ناشتا نہیں کیا جاتا' مجھ سے' اچھا میں دودھ پی لیتی ہوں' ٹھیک ہے۔" مشعال نے عاطف کے لیے چائے نکالی۔

کاظم پہلے ہی اپنے ابو کے ساتھ نکل چکا تھا۔ وہ اپنی بائیک پر کاظم کو اس کے کالج چھوڑ دیتے' جو کہ ان کے آفس کے راستے میں پڑتا تھا۔

سب کے جانے کے بعد سارہ نے پہلے زارا کو کال کی' کل اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' بلڈ پریشر بہت زیادہ ہائی ہو گیا تھا۔ دوپہر سے رات تک وہ قریبی کلینک میں ایڈمٹ رہی۔ سارہ کو جونہی اطلاع ملی وہ فوراً" پہنچ گئی تھی۔ رات میں ڈاکٹر نے بہت سی ہدایات اور تسلی تشفی کے ساتھ گھر بھیج دیا تھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟" سارہ کی آواز سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"اب تو بہتر ہے۔ بس میڈیسن کھاتے رہو تو ٹھیک ہے' دو دن بلڈ پریشر کی گولیاں نہیں کھائیں تو طبیعت خراب ہو گئی۔"

"تم بھی تو ہر بات ذہن پر سوار کر لیتی ہو' یہ عمر ہے تمہاری بلڈ پریشر کی مریضہ بننے کی' اپنے غصے پر قابو رکھا کرو۔"

"بس کیا کروں' غلط بات پر غصہ آ ہی جاتا ہے' اب تم خود بتاؤ' میں نے کیا غلط کہا تھا کہ علی کے سارے نخرے شادی کے بعد ختم ہو گئے ہیں۔ بیوی جو بھی جیسا بھی پکا کے رکھ دے' خاموشی سے کھا لیتا ہے' کیا یہ جھوٹ ہے؟ اور انیلا کو دیکھو' مجھے کیسی باتیں سنا رہی تھی کہ میں دونوں میاں' بیوی میں لڑائی کرواتی ہوں' علی کو دیکھو' مجال ہے جو ایک لفظ بھی کہا ہو اپنی بیوی کو' بھاڑ میں جائیں دونوں' مجھے کیا۔" وہ پھر شروع ہو گئی۔

"بس کرو زارا! ایک تو پہلے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اوپر سے تم پھر وہی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔" سارہ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جب تک امی ہیں میں ان کے لیے بولوں گی' میرا منہ بند نہیں ہو سکتا' تم از کم اپنی ماں کے لیے تو کوئی ہلکی پھلکی غذا پکوا سکتا ہے' امی کو اتنی ثقیل اور بادی چیزیں کہاں ہضم ہوتی ہیں۔"

"مجھے لگ رہا ہے کہ تمہارا دوبارہ دل چاہ رہا ہے ہوسپٹلائز ہونے کو۔" سارہ نے عاجز آ کر کہا۔

"تم تو ہمیشہ مجھے ہی کہنا' کبھی علی کو بھی سمجھا لیا کرو۔" زارا الٹا اس سے خفا ہو گئی "میں تو تم دونوں کو ہی سمجھا سمجھا کر ہلکان ہو گئی ہوں۔ اچھا اب بات سنو' امی کو تمہاری بہت فکر ہو رہی تھی۔ میں انہیں لے کر تمہارے گھر آ رہی ہوں' وہ دو' چار دن رک جائیں گی تمہارے پاس۔ اپنی طبیعت ٹھیک کرو اور امی کی خدمت کرو۔"

"میں تو تمہاری بھی خدمت کر لوں گی' تم بھی رک جاؤ نا سارہ!" زارا کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔

"میں کہاں رک سکتی ہوں زارا! تمہیں پتا تو ہے' سب سے پہلے تو ندیم کا ہی دل نہیں لگتا گھر میں' ان کے سارے کام بند ہو جاتے ہیں' کھانا نہیں ملتا' چائے نہیں ملتی' کپڑے نہیں ملتے۔"

"بھائی جان سے کہو' اب بچے بڑے ہو گئے' اپنا رومانس ذرا کم کر لیں' ہر وقت تمہارا پلو پکڑ کر پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔" زارا اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"ان کو کیا کہوں' ان کے بچوں کا بھی یہ ہی حال ہے۔" سارہ ہنس پڑی۔

"اچھا چلو میں ابھی تو آ رہی ہوں' پھر ویک اینڈ پر

کوشش کروں گی کہ آجاؤں۔" سارہ نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔



لاؤنج میں ایک شور شرابا اور ہنگامہ تھا' ندیم اپنے بہنوئی اور بیٹوں کے ساتھ اتنے جوش و خروش سے میچ دیکھ رہے تھے۔

"یار! یہ کرکٹ بورڈ صحیح نہیں ہے' یہ اگر ٹھیک فیصلے کرے تو یہ صورت حال ہی نہ ہو۔" ندیم' بہنوئی صاحب سے مخاطب تھے۔ جو ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

"اور کھلاڑی تو جیسے سب اللہ میاں کی گائے ہیں۔" قریب سے گزرتی سارہ نے تبصرہ کیا۔ وہ کچن میں جا رہی تھی۔ جہاں مشعال اور عبیر کام کر رہی تھیں۔

"ہاں بھئی تمہارے سینڈوچیز کہاں تک پہنچے؟" سارہ نے مشعال کو مخاطب کیا۔ عبیر فروٹ سلاد بنا رہی تھی جو تقریباً" مکمل ہی تھا۔

"بس بن ہی جائیں گے ٹی ٹائم تک۔" مشعال کا لہجہ سادہ سا تھا مگر نہ جانے کیوں سارہ بے چین ہو گئی۔

"دیکھو' تمہارے دل میں اگر کوئی بات ہے تو بتا دو ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ ابھی تمہاری پھپھو نے صرف پروپوزل دیا ہے۔ اگر تم کچھ اور چاہتی ہو تو بتا دو۔" سارہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی' پھپھو کی پوری فیملی ہی بہت اچھی ہے' سب سے اچھی فرینڈ شپ ہے میری' لیکن وہ جو اصل موصوف ہیں نا' مستقبل کے ڈاکٹر منصور صاحب' ان کی سنجیدگی سے بڑا ڈر لگتا ہے' بلکہ سچ کہوں؟" مشعال ادھر ادھر دیکھ کر' رازداری سے گویا ہوئی۔ "سنجیدگی سے بھی بڑھ کر سڑیل مزاج ہے پورا۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ اپنی امی اور بہن کے ساتھ خود بھی ہنس پڑی' تینوں کو معلوم تھا کہ وہ کچھ مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہے۔

"فضول باتیں مت کرو' اچھا بھلا سمجھ دار لڑکا ہے' اپنے گھر کا ہے' دیکھا بھالا' بس ذرا تمہاری طرح فالتو بولنے کی عادت نہیں ہے۔" سارہ نے پیار سے اسے ڈانٹا۔

رشتہ بہت خوش اسلوبی اور خوشی کے ساتھ طے ہوا۔ منگنی دھوم دھام سے ہوئی اور شادی دو سال بعد کرنے کا فیصلہ ہوا۔

مشعال کا رشتہ طے ہونے کے بعد اب سارہ کی خواہش تھی کہ عاطف کے لیے بھی کسی لڑکی کا انتخاب کر لیں اور مشعال سے پہلے اس کی شادی کر دیں۔ شوہر سے اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو ہنس پڑے۔

"اچھا تو بیگم صاحبہ کسے شرف بخش رہی ہیں اپنی بہو بنانے کا؟" ندیم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"اب یہ تو سب سے مشورہ کر کے ہی ڈیسائیڈ کریں گے۔" سارہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اس وقت شہرین کے بارے میں سوچ رہی تھی' وہ سمجھ دار اور پیاری سی لڑکی' جس کی آنکھوں میں اس نے اپنے بیٹے کے لیے پسندیدگی کے رنگ دیکھے تھے۔ اس کے اپنے ہاتھوں میں پلی بڑھی شہرین' جسے اس گھر کی بہو بنانے کا خیال بارہا اس کے دل میں آیا۔ ندیم کے سامنے اس نے شہرین کا تذکرہ کیا تھا اور ظاہر ہے کہ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ان کے سامنے پلی بڑھی لڑکی' باادب' سمجھ دار اور پیاری بھتیجی' یقیناً" وہ ایک اچھی بہو ثابت ہوتی۔

"عاطف سے بات کر لی؟" ندیم نے سوال کیا۔

"اب موقع اور وقت دیکھ کر ہی بات کروں گی' ابھی تو وہ اتنا مصروف ہے' صبح کا گیا رات گئے واپس آتا ہے' ویسے بس رسمی طور پر تو ہی پوچھنا ہے' اسے بھلا کیا اعتراض ہو گا؟" سارہ کا لہجہ اطمینان اور اعتماد سے بھرا ہوا تھا۔

"اعتراض ہو نہ ہو' کوئی پسند تو ہو سکتی ہے۔" ندیم مسکرائے۔

"ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور تذکرہ کرتا' اچھا خیر' میں اس سے پوچھ لوں گی۔" سارہ نے بات سمیٹ کر

اٹھتے ہوئے کہا۔



عبیر کے لیے رشتہ جاننے والوں میں سے آیا تھا۔ سب کچھ اتنا اچھا اور مکمل تھا کہ انہیں یہ رشتہ ٹھکرانا کفران نعمت لگا۔ عبیر کی کم عمری نظرانداز کر کے ہامی بھرلی۔ اب رشتہ طے ہونے پر وہ لوگ نکاح کے لیے اصرار کرنے لگے' سارہ کا دل نہ جانے کیوں وسوسوں کا شکار ہو رہا تھا۔

"ایسے ہی سادگی سے رشتہ طے کرلیتے' یہ نکاح کی بیخ بلاوجہ لگادی۔" سارہ جھنجلائی۔

"کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہو؟ ریلیکس رہو' اللہ پر بھروسہ رکھو۔ تم بھی دیکھ رہی ہو کہ صمد صاحب کی کیا کنڈیشن ہے؟ اکلوتا پوتا ہے ان کا' اس کی خوشی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہ رہے ہیں' اس لیے نکاح کی تجویز پیش کردی۔ اب جب اللہ کا نام لے کر ہاں کی ہے تو فضول اندیشوں کو ذہن سے جھٹک دو۔ اللہ جو کرے گا بہتر ہی کرے گا۔" ندیم نے اپنی بیگم کو سمجھایا۔

"چلیں اللہ مالک ہے۔" سارہ نے ایک گہری سانس لی اور خود کو مطمئن اور پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

عبیر کا رشتہ "آنا" "فانا" طے ہوا اور پھر نکاح بھی کہ عاطف کا معاملہ پس پشت چلا گیا۔ سارہ کا ارادہ تھا کہ عبیر کے نکاح سے نمٹ کر عاطف کے لیے شہرین کو مانگ لے گی۔ ندیم نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

نکاح کی تقریب بے حد مختصر پیمانے پر کرنے کے باوجود ٹھیک ٹھاک مہمان بن گئے تھے۔

تقریب بہت سادہ اور پروقار تھی۔ لڑکے والوں کی طرف سے بے حد مختصر اور گنے چنے لوگ تھے۔ جو بھی تھوڑے بہت مہمان تھے' وہ لڑکی والوں کی جانب سے تھے۔ نکاح کے بعد کھانا کھلا کر جلدی ہی سب کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ عنبرین اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سارہ کے پاس آئی اور اپنے جانے کا عندیہ دینے لگی۔

"چچی جان' رک جائیں نا' کل چلی جایئے گا۔" مشعال نے کہا۔ "ارے بیٹا' ہمارا کہیں رکنا اتنا آسان تھوڑی ہوتا ہے۔" عنبرین ہنس پڑی۔ "شہرین کو چھوڑ دیں۔" مشعال نے پھر اصرار کیا۔

"شہرین!" وہ دھیرے سے مسکرائیں' پھر ہنسنے لگیں۔ "اب تو تمہارے گھر میں رہنا ہے اسے' مگر یوں ہونے والی سسرال میں رکنا؟ بے شک گھر کی بات ہے' مگر لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے؟" سارہ نے چونک کر عنبرین کو دیکھا اور ان سے زیادہ حیران عاطف تھا جو ندیم کے ساتھ انہی کی جانب آرہا تھا اور قریب آتے ہوئے اس نے عنبرین چچی کی بات سنی تو چکرا ہی گیا۔

"امی! وہ۔۔۔" عاطف نے کچھ کہنے کا آغاز ہی کیا تھا کہ چند مہمان خواتین سارہ کے پاس چلی آئیں۔ عاطف یوں ہی الجھا الجھا واپس چلا گیا۔ مگر تقریب ختم ہونے پر جب وہ لوگ گھر واپس آئے تو عاطف نے سب سے پہلے سارہ سے یہ ہی بات کی کہ

"امی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے' آپ فارغ ہوجائیں تو پلیز مجھے بلا لیجئے گا۔"

"اچھا!" سارہ کو عاطف کا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں وہم ستانے لگے۔ جب ندیم تھکے ہارے بیڈ روم میں آئے اور بیڈ پر گر گئے۔

"بات سنیں۔" سارہ نے شوہر کو مخاطب کیا۔

"ہوں۔"

"آپ نے شہرین کے متعلق کوئی بات کی تھی عنبرین سے یا اظہر سے رشتے کی؟"

"ارے ہاں' کل میری بات ہوئی تھی اظہر سے' وہ ذکر کر رہا تھا کہ شہرین کے لیے رشتہ آیا ہے عنبرین کے میکے والوں کی طرف سے۔ بتا رہا تھا کہ سوچ بچار کر رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ سوچ بچار کرنے کی ضرورت نہیں ہے' شہرین ہماری ہے' اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ندیم بڑے اطمینان سے بول رہے تھے۔

"بڑی غلطی ہوگئی، ہمیں عاطف کو بٹھا کر ایک بار سنجیدگی سے اس موضوع پر بات کرنی چاہیے تھی' پتا نہیں۔" سارہ کا دل ہول رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو؟" ندیم نے غور سے اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" سارہ نے ایک گہری سانس لی۔

"امی پلیز' میں آپ کو ساری بات بتا چکا ہوں۔ اب آپ مجھ سے اس طرح اصرار نہ کریں۔ چچا' چچی سے کچھ کہنے سے پہلے آپ کو مجھ سے تو بات کرنی چاہیے تھی۔" عاطف نے جھنجلا رہا تھا۔

سارہ کافی دیر سے اس کی بات سن رہی تھی' اور اپنے اندیشوں کو سچ ہوتے دیکھ کر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آئی تو چہرے پر بڑا بڑا پریشانی کا ایک نوٹس لگا تھا' جسے دیکھ کر ندیم چونک گئے۔

"کیا ہوا؟"

"عاطف کی مرضی کہیں اور ہے وہ شہرین سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" سارہ نے ایک ہی جملے میں معاملہ سمیٹ دیا۔

"کیا؟" ندیم کا چہرہ بھی بیوی کی طرح فق ہوگیا۔

"صدیقی صاحب کی پوتی نمرہ سے کمٹ منٹ ہے اس کی۔" سارہ نے عاطف کی مرضی سے بھی شوہر کو آگاہ کردیا۔

"مم... مگر... کب؟ کیسے؟" ندیم ایسے چکرائے' منہ سے فقط چند بے ربط الفاظ ہی نکل سکے۔

"یہ مجھے کیا پتا' کب؟ کیسے؟" سارہ نے دھیمی آواز میں جیسے خود سے سرگوشی کی۔

"اب کیا ہوگا؟"

دونوں کے دماغوں میں ایک ہی سوال چکرا رہا تھا' یہ تو طے تھا کہ عاطف کو زبردستی اس رشتے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا اور اگر اظہر اور عنبرین کو یہ وجہ بتا کر انکار کرتے تو نہ جانے ان کا کیا ردعمل ہو' بہت قریبی رشتہ تھا اور اتنے قریبی رشتے بڑے نازک ہوتے ہیں' بالکل نازک دلوں کی طرح' ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔ نہ بھی ٹوٹیں تو دراڑ تو پڑ ہی جاتی ہے۔ جسے بھی کبھار گزرتا وقت بھی بھرنے میں ناکام رہتا ہے۔

دونوں کی تقریباً" پوری رات ہی آنکھوں میں کٹی' دونوں ہی چپ چاپ یہ ہی سوچتے رہے کہ اس معاملے کو کیسے ہینڈل کریں۔

دو ہفتے گزر چکے تھے' مگر گھر کے ماحول میں عجیب سی ایک کشیدگی' روز اوّل کی طرح موجود تھی' نہ عاطف ان سے ناراض تھا' نہ وہ عاطف سے۔ مگر پھر بھی ایک عجیب سا کھنچاؤ ان کے درمیان آگیا تھا۔ ضروری اور رسمی باتوں کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی' مشعال' عبیر اور کاظم اپنی پڑھائی میں مشغول ہوگئے تھے۔

ان ہی دنوں میں سارہ کی بڑی نند اور مشعال کی ہونے والی ساس کا فون آیا۔ معلوم اور خیر خیریت پوچھنے کے دوران سارہ کو ان کا لہجہ کافی اکھڑا اکھڑا الگ رہا تھا اور اگلے چند لمحوں میں سارہ کا گمان سچ ثابت ہونے لگا۔

"تم لوگوں نے شہرین کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بھلا کوئی اپنوں کے ساتھ بھی ایسا کرتا ہے؟ تمہارے آگے بیٹیاں ہیں' کچھ تو سوچا ہوتا۔" بڑی آپا بولنا شروع ہوئیں تو بولتی ہی چلی گئیں۔

"آپا! یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں' پھر بھلا جان بوجھ کر ایسا کریں گے' وہ ہمارے ہاتھوں کی پلی بڑھی ہماری ہی بیٹی ہے۔"

دکھ کی شدت سے سارہ کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے اور شدت جذبات سے گلا رندھ گیا۔

"اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا برتاؤ پسند کروگی؟" وہ تلخ لہجے میں بولیں۔

"تم لوگوں کے کہنے پر کہ اظہر اور عنبرین نے شہرین کے ایک اور اتنے اچھے پرپوزل کو انکار کردیا۔ سب کو یہ پتا تھا کہ شہرین کا رشتہ عاطف سے ہونے جارہا ہے' اس نے اپنے میکے کا رشتہ چھوڑ کر تمہارے گھر کے لیے ہامی بھری اور اب تم لوگ کہتے ہو کہ عاطف راضی نہیں' یہ تو مذاق ہوگیا اس بچی کے ساتھ بھی اور اس کے ماں' باپ کے ساتھ بھی۔"

"ندیم نے آپ کو ساری بات تفصیل سے بتا تو دی

ہے، پھر بھی آپ ہمیں قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔" سارہ نے احتجاجی انداز اختیار کیا۔

"اب میری سسرال میں خاص طور پر شوہر کے سامنے میری پوزیشن کتنی خراب ہو رہی ہے، تمہیں علم ہے کہ عنبرین اپنے بھائیوں کی کتنی لاڈلی ہے اور پھر شہرین اکلوتی نواسی، اکلوتی بھانجی، یہاں تو مجھ یہ بات آ رہی ہے کہ میرے بھائی، بھاوج نے ان کی بہن، بھانجی کا تماشا بنا دیا۔" وہ سارہ کو سن کم رہی تھیں اور سنا زیادہ رہی تھیں۔

"خیر اب میں آؤں گی تو بات کروں گی۔" سارہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بولیں اور خدا حافظ کر کے فون بند کر دیا۔

سارہ کی فکرات بڑھتی جا رہی تھیں، عجیب عجیب خوف و خدشات اسے ڈرا رہے تھے۔



سارہ بیڈ روم میں گئی تو ندیم اسے دیکھ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ چہرے کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ کوئی خاص بات ہے۔

"کیا ہوا؟" سارہ نے شوہر کا چہرہ بغور جانچتے ہوئے پوچھا۔

"عاطف چاہ رہا ہے کہ ہم نمرہ کا پروپوزل لے جائیں۔" ندیم نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھا۔

"اتنی جلدی کیا ہے، شہرین کا رشتہ کہیں طے ہو جائے تو یہ معاملہ ٹھنڈا ہو، ویسے ہی خاندان میں سب کے منہ بنے ہوئے ہیں، ابھی ہم نمرہ سے رشتہ طے کریں گے تو نہ جانے کیا ہو۔" سارہ نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"عاطف نے مجھ سے بات کی تھی، اس کا کہنا ہے کہ نمرہ کے ایک، دو پروپوزل ہیں، جس پر اس کے گھر والے سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں، لہٰذا ہم لوگ رشتہ لے کر چلے جائیں۔"

سارہ خاموشی کے ساتھ شوہر کی بات سن رہی تھی۔ صدیقی صاحب کا گھرانہ ان کے بہت پرانے ملنے جلنے والوں میں سے تھا۔ شریف اور وضع دار لوگ تھے۔ نمرہ بھی اعلا تعلیم یافتہ باادب اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اگر شہرین کا معاملہ نہ ہوتا تو یقیناً" یہ ایک بہترین انتخاب تھا۔" میرا تو دماغ ماؤف ہو رہا ہے، بالکل کام نہیں کر رہا، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" سارہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"اور ویسے بھی دیکھا جائے تو غلطی ہماری ہی ہے، ہم اپنے بیٹے سے بھی کیوں ناراض ہوں، ہم نے اسے بتائے بغیر، اس سے ڈسکس کیے بغیر اس کی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کر لیا۔ ہم نے سوچا ہی نہیں کہ اس کی مرضی کہیں اور، کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔" ندیم دوبارہ بولنے لگے۔

"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" سارہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے فیصلہ شوہر پر چھوڑ دیا۔



"یا اللہ، تم دونوں اپنا یہ بچپنا کب چھوڑو گے۔" سارہ علی کی بات سن کر ہمیشہ کی طرح اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ زارا اور علی میں پھر جھگڑا ہو گیا تھا اور علی، سارہ کو فون کر کے پوری روداد سنا کر اعلان کر رہا تھا کہ اب مرتے دم تک زارا کی شکل نہیں دیکھے گا۔

"شاباش ہے تم پر، ان ذرا ذرا سی باتوں کے پیچھے سگے رشتوں سے منہ موڑا جاتا ہے۔ جانتے تو ہو کہ وہ مزاج کی ذرا تیز ہے، اور ویسے بھی اپنے لیے تو نہیں لڑتی تم سے، امی کے ساتھ انیلا کا رویہ دیکھ کر ہی کچھ نہ کچھ کہہ دیتی ہے، تھوڑا تم ہی برداشت کر لیا کرو۔"

"کتنا برداشت کروں، ہر بار میں ہی کمپرومائز کر لیتا ہوں کہ چلو چھوڑو، مگر اس بار تو زارا نے حد کر دی۔ انیلا کے گھر والوں کے سامنے ہم دونوں کو ہی اتنی باتیں سنائی ہیں کہ کیا بتاؤں۔ آخر میری بھی عزت ہے، سسرال والوں کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دیا مجھے۔ میں شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا اب اس کی، اور آپ سے بھی صاف صاف کہہ رہا ہوں، عاطف کی آپ جو

بھی خوشی کریں‘ اگر زارا کو بلایا تو میں نہیں آؤں گا۔“ علی نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو علی! میرے لیے تو تم دونوں برابر ہو‘ اب تمہارے ان احمقانہ جھگڑوں کے درمیان میں کیوں پسوں‘ تم دونوں مجھے کیوں پاگل بنا رہے ہو۔“ سارہ غصے میں علی پر برس پڑی۔

”آپ ہمیشہ زارا کی فیور کرتی ہیں آپا! اب دیکھتا ہوں آپ میری بہن زیادہ ہیں یا اس پھاپھا کٹنی کی۔“ علی نے بھی غصے میں بولتے ہوئے فون بند کر دیا۔

”اف خدایا۔ آخر میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے‘ سسرال والوں کی طرف سے ٹینشن الگ‘ میکے کی طرف سے الگ‘ ذہنی سکون تباہ ہو کے رہ گیا ہے میرا۔ غصے اور رنج کے مارے سارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ادھر عاطف کے رشتے کی وجہ سے پریشان تھی کہ کیا کرے۔

سارہ اور ندیم کی خواہش تھی کہ رشتہ سادگی سے طے ہو جائے۔ مگر نمرہ کے والدین نہیں مان رہے تھے۔ ”ہمارے گھر کی پہلی خوشی ہے اور پھر ایک ہی بیٹی ہے ہماری‘ ہم اپنے ارمان اور کس پر نکالیں گے۔“ چاروناچار انہیں بات ماننی ہی پڑی۔

دعوت دینے وہ دونوں ہی سب کے گھروں پر گئے تھے‘ گنے چنے گھر تھے۔

”عنبرین کے گھر میں نہیں جاؤں گی‘ آپ ہی دعوت دے آئیں۔“ سارہ نے شوہر سے کہا۔

”کیوں؟“

”دیکھا نہیں تھا ہم بڑی آپا کے گھر گئے تھے تو وہاں آئی ہوئی تھی‘ ہمیں دیکھ کر نہ سلام‘ نہ دعا‘ نہ خیر خیریت‘ اٹھ کر جو اندر گئی تو ہماری واپسی تک تو کمرے میں آئی نہیں‘ جب وہ ہم سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تو وہاں جا کر کیا کروں گی‘ آپ ہی چلے جایئے گا۔“ سارہ دلگیر لہجے میں بول رہی تھی۔

”نہیں ابھی غم و غصہ ہے‘ اس لیے ایسے ری ایکٹ کر رہے ہیں۔ اگر ہم بھی ان کی طرح کھنچنے لگیں تو ہمارے درمیان فاصلے ہی بڑھیں گے اور کچھ نہیں ہو گا۔“ ندیم نے بیوی کو سمجھایا۔

”مجھے وہاں جانے میں یا ان لوگوں سے ملنے میں کوئی عار نہیں ہے‘ مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ ہم نے ساری بات بتا کر اپنا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی ان سے معافی مانگی‘ مگر وہ دونوں تو کسی بھی قسم کی لچک نہیں دکھا رہے۔“ سارہ نے افسوس سے کہا۔

”آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ندیم نے اسے تسلی دی۔

شوہر کے کہنے پر وہ ساتھ چلی تو گئی‘ مگر سارہ کی توقع کے عین مطابق وہاں ماحول میں کشیدگی اور سرد مہری کا راج تھا۔ شہرین ہمیشہ کی طرح بہت ادب اخلاق اور محبت سے ملی‘ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ ماں کو بلانے اندر گئی‘ کافی دیر میں واپس آئی تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

”وہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی‘ وہ دوائی کھا کر سوئی ہیں‘ آپ کہیں تو اٹھا دوں؟“ شہرین شرمندہ لہجے میں اٹک اٹک کر بول رہی تھی‘ وہ بہت معصوم اور سادہ مزاج لڑکی تھی‘ اسے نہ جھوٹ بولنا ڈھنگ سے آتا تھا نہ بات بنانی۔

”رہنے دو‘ میڈیسن کھا کر سوئی ہیں تو جگانا نہیں ہم فون پہ بات کر لیں گے‘ اظہر ابھی تک نہیں آیا ڈیوٹی سے‘ میری آج بات ہوئی تھی فون پر‘ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم آج گھر آئیں گے۔“ ندیم بڑی متانت سے بول رہے تھے۔

”ابو پتا نہیں کیوں نہیں آئے اب تک‘ ورنہ اس وقت تک تو آجاتے ہیں۔“ وہ اپنے مخصوص سادہ لہجے میں کہنے لگی۔

”اچھا‘ میں ابھی آئی‘ آپ پلیز بیٹھیے۔“ وہ بولتی ہوئی جلدی سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں اندر آئی تو ٹرے میں کولڈ ڈرنک‘ چپس‘ نمکو اور کباب تھے۔

”ارے بیٹا! ہم کوئی مہمان ہیں‘ تم نے خوامخواہ اتنی زحمت کی۔“ سارہ نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا۔

”زحمت کی کیا بات ہے اور ویسے بھی آج تو آپ

اتنے دنوں میں گھر آئے ہیں' بالکل مہمانوں کی طرح۔"

شہرین مسکرائی' اس کے انداز اور باتوں سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ عاطف کے رشتے کا اس پر کیا رد عمل ہوا ہے' دل کا حال بڑی کامیابی سے چھپا کر وہ ان لوگوں سے ویسی ہی محبت سے مل رہی تھی جیسے کہ پہلے ملا کرتی تھی۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" ندیم نے چپس کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

رومیل اور عائشہ سینٹر گئے ہوئے ہیں پڑھنے اور عامر کرکٹ کھیلنے نکلا ہوا ہے' گھر پر میں اور امی ہی تھے۔

عبیرہ ان کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔

"اچھا بیٹے' اب اجازت دو' میں اظہر کو کال کرلوں گا' ابھی تو اس کا نمبر بزی جا رہا ہے' کئی بار ٹرائی کر چکا ہوں۔" ندیم اٹھ کھڑے ہوئے' ان کے ساتھ سارہ بھی۔

واپسی کا سفر دونوں نے ہی بڑی خاموشی کے ساتھ طے کیا۔ نہ سارہ نے کچھ کہا' نہ ندیم نے' گھر پہنچ کر بھی ندیم نے کئی بار اظہر کو کال کرنے کی کوشش کی' مگر اس کا سیل مسلسل بند ملا۔ دوسرے روز ندیم شام میں اس کے آفس ہی چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر جا چکا ہے۔ ندیم وہاں سے سیدھے اس کے گھر پہنچے' اظہر اور عنبرین دونوں ہی گھر پر مل گئے۔ مگر ان کے رویے میں سرد مہری اور کھنچاؤ بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ندیم مختصر لفظوں میں انہیں عاطف کی منگنی میں شریک ہونے کی دعوت دے آئے۔



عاطف کا رشتہ تو نمرہ کے ساتھ طے ہو گیا' مگر سارہ کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ ندیم بھی بظاہر ہنس بول رہے تھے' مگر اندر ہی اندر انہیں بھی افسوس تھا' عاطف ان کی پہلی اولاد تھا۔ بڑے بیٹے کی پہلی خوشی میں نہ اظہر اور عنبرین شریک ہوئے اور نہ ہی بڑی آپا۔ حالانکہ ان سے تو اب مشعل کے حوالے سے رشتہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے شوہر کی وجہ سے معذرت کرلی تھی کہ انتہائی غصیلے مزاج کے انسان تھے' اور عنبرین ان لوگوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن' جب عنبرین نے قطع تعلق کرلیا تھا تو وہ کیوں آتے؟

ادھر سارہ کو میکے والوں کی طرف سے بھی یہ ہی دھچکا لگا تھا۔ علی نے اپنے بیوی بچوں کو بھیج دیا۔ مگر خود نہیں آیا کہ وہاں زارا ہوگی اور زارا نے بھی آنے سے معذرت کرکے اپنے شوہر اور بچوں کو بھیج دیا تھا۔

نمرہ کے گھر اور اپنے گھر دونوں طرف کی تقاریب میں سارہ نے بہت ضبط سے کام لیا اور خود پر قابو رکھا' مگر اگلے ہی روز اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ ندیم کے سامنے وہ بکھر گئی اور بے تحاشا رو پڑی۔

"ہمارے بیٹے کی پہلی خوشی تھی اور ذرا دیکھو کہ سب نے کیا سلوک کیا۔"

"کیوں دل چھوٹا کرتی ہو جان! وقتی کرانسس ہے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا' تم اپنے دل و دماغ پر کوئی بوجھ مت لو' ہمارے بچے خوش رہیں' ہمارے لیے یہ ہی کافی ہے۔"



بڑی آپا کا فون آیا تھا' ان کی بات سن کر سارہ کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا!" بمشکل سارہ کے منہ سے نکلا۔

"مجھے بہت افسوس ہے سارہ! مشعل بھی میری بیٹی ہے اور بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں' میرے بس میں ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہونے دیتی' مگر کیا کروں' اس عمر میں آکر نہ اپنا گھر تباہ کر سکتی ہوں اور اگر میں نے احمد کی بات نہ مانی تو وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں' اتنا تو مجھے یقین ہے اور تم بھی ان کا مزاج جانتی ہو۔"

وہ اپنے شوہر کا نام لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور سارہ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا' اس نے اپنے کانپتے ہاتھ پاؤں سنبھال کر بڑی مشکل سے اپنی ہمت مجتمع کی اور کہنے

لگی۔

"ڈیڑھ سال ہوگیا مشعال اور منصور کی بات طے ہوئے' اب شادی کا وقت آیا تو آپ رشتہ ختم کرنے کی بات کررہی ہیں' اتنا آسان ہے یہ سب' آپ کے آگے بھی بیٹیاں ہیں۔" سارہ کی ہمت جواب دینے لگی۔

"میں تمہیں ساری بات بتا چکی ہوں' عنبرین اور شہرین' احمد کی ہی نہیں بلکہ منصور کی بھی بہت لاڈلی ہے' جو کچھ شہرین کے ساتھ ہوا' یہ اس کا رد عمل ہے' بخدا میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی' مگر احمد کے ساتھ ساتھ اب منصور بھی اس رشتے کے حق میں نہیں اور میری باقی سسرال والے تو خیر اب مخالف ہیں ہی' اب تم ہی بتاؤ کہ میں اکیلی کس کس سے لڑوں یا کس کس کو مناؤں' منصور بھی اگر راضی ہوتا تو میں کچھ نہ کچھ کرلیتی' مگر اب کیا کروں؟"

"اور یہ سب کہنا کتنا آسان' مگر سننا کتنا مشکل ہے۔" سارہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے سیل آف کیا اور اسے یونہی بیڈ پر ڈال کر خالی خالی نظروں سے تکنے لگی۔

آنسو تھے کہ امڈے چلے آرہے تھے۔ ان ہی آنسوؤں کی چادر کے پار اسے ایک مہربان چہرہ نظر آیا' ایک مہربان آواز سنائی دی۔

"سارہ!" ندیم اس کے قریب آکر اسے مخاطب کررہے تھے۔ یہ ان کے آنے کا وقت نہیں تھا' مگر وہ آگئے تھے' بے وقت۔

انتہائی پریشان' خاموشی سے وہ بیڈ پر بیٹھ گئے' سارہ نے ایک نظر شوہر کو دیکھا' جن کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ان پر بھی وہی قیامت گزر چکی ہے اور پھر ندیم کے ایک ہی فقرے نے اس کے اندازے کی تصدیق کردی۔

"احمد بھائی کا فون آیا تھا ابھی۔" ندیم نے اپنے چٹختے لبوں پہ زبان پھیری۔

"بڑی آپا نے بھی کیا تھا۔" سارہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

مشعال اور عبیر یونیورسٹی سے گھر آئیں تو باپ کو بے وقت گھر میں دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

"خیریت تو ہے ابو' آپ اس وقت گھر پر؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔" مشعال نے باپ کا ستا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا ہوا امی؟" عبیر سیدھی کمرے میں ماں کے پاس پہنچی تو ان کی بری طرح سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ "امی... کیا ہوا؟" مشعال بھی عبیر کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچی۔ مشعال کو دیکھ کر سارہ کے ضبط کے بندھن پھر ٹوٹ گئے۔ "کچھ تو کہیں؟ کیا ہوا؟؟" مشعال پریشان ہوگئی۔

عبیر گلاس میں پانی لے آئی' مشعال ماں کے قریب بیٹھ کر چہرے سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"ابو جی' آپ ہی کچھ بولیں' میرا دل ہول رہا ہے۔" عبیر چھوٹی بھی تھی اور نازک مزاج بھی' روہانسی ہوکر باپ سے مخاطب ہوئی۔

ندیم نے بے بسی اور پریشانی سے اپنی دونوں بیٹیوں کو دیکھا' ہمت تو ان کی بھی نہیں ہورہی تھی' بیٹیوں سے کچھ کہنے کی' مگر سارہ تو بالکل ہی بے حال ہورہی تھی' اس وقت اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلنا محال تھا۔

"ادھر آئیں ابو جی!" مشعال نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور ان کے ہاتھوں کو تھامے ہوئے خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔

"اب بتائیے کیا بات ہے؟" وہ انتہائی سنجیدگی سے باپ سے مخاطب ہوئی۔

ندیم نے ایک نظر اپنی پیاری بیٹی کا چہرہ دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

یونہی نظریں جھکائے جھکائے کٹتے ہوئے دل کے ساتھ بڑی مشکل سے مختصر لفظوں میں بات بتائی۔

"اچھا' تو یہ بات ہے۔" مشعال نے ایک گہری سانس لی۔

"تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی یا رونے کی کیا بات ہے؟" مشعال کچھ دیر بعد دونوں سے مخاطب ہوئی۔

"اس معاملے میں یقیناً" اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت اور ہمارے لیے بہتری ہوگی' آپ لوگ پلیز کوئی ٹینشن نہ لیں' ویسے بھی وہ ڈاکٹر صاحب ہر وقت تیوریاں

چڑھائے، مزاج میں بالکل اپنے والد بزرگوار کی دوسری کاپی ہیں۔ آپ خود سوچیں، ایسے انسان کے ساتھ میں کیسے خوش رہ سکتی تھی جو مسکرانا تک نہ جانتا ہو، جو کچھ ہوا، اچھا ہی ہوا، مجھے تو کوئی پریشانی نہیں۔" مشعال ہلکے پھلکے لہجے میں بولتے ہوئے مسکرائی۔

عبیر خاموش بیٹھی باری باری تینوں کے منہ تک رہی تھی، اس کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

"کھانا کیا پکایا ہے امی! پیٹ میں دوڑتے چوہے بھی اب تو بے دم ہوتے جا رہے ہیں۔ عبیر پلیز، ذرا کھانا تو گرم کردو جان۔" مشعال بول بول کر معاملے اور ماحول کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں پکایا، اٹھنے کی ہی ہمت نہیں ہو رہی تھی، پکاتی کیا؟ تمہارا ابو بازار سے کچھ لے آئیں گے۔" سارہ مضمحل لہجے میں کہنے لگی۔

"آپ دونوں تو بہت خوب ہیں، خود بھی بھوکے بیٹھے ہوئے ہیں اور بچوں کی بھوک کا بھی کوئی خیال نہیں۔" مشعال نے مصنوعی ناراضی دکھائی۔

"ابو جی! اب فٹافٹ ہم سب کی فیورٹ چیزیں لے آئیں۔"

"بلکہ ایسا کریں۔" وہ چند لمحے رک کر بولی۔

"بریانی لے آئیں، ہم سب ہی شوق سے کھاتے ہیں، مگر پلیز جلدی آیئے گا، بھوک کے مارے دم نکلنے کو ہے، آج تو کینٹین میں بھی فقط دو سموسے ہی کھائے تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ فریزر میں چار، پانچ کباب رکھے ہیں۔ پتا نہیں کاظم سے کیسے بچ گئے۔ میں تب تک فرائی کرلیتی ہوں، جب تک آپ بریانی لائیں گے۔"

"تھیں بھئی امی! بہت سوگ منالیا۔ اب ذرا پیٹ پوجا کرلیں۔ خالی پیٹ تو رویا بھی نہیں جاتا۔" مشعال بول کر ہنس پڑی۔

ندیم کے لبوں پر مسکراہٹ چمکی اور فوراً ہی مدھم بھی پڑ گئی، وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں بریانی لے کر آتا ہوں۔" انہوں نے بائیک کی چابی اٹھائی۔

"پلیز جلدی آیئے گا۔" مشعال نے ایک بار پھر تاکید کی اور ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا۔

☆ ☆ ☆

عبیر کے سسرال والے رخصتی کے لیے اصرار کر رہے تھے، ندیم کچھ متذبذب تھے اور سارہ پریشان۔

"پھر کیا جواب دیں انہیں؟" سارہ نے مدد طلب نظروں سے شوہر کو یوں دیکھا جیسے وہ اپنی زنبیل میں سے کوئی ایسا حل نکالیں گے جو پلک جھپکتے ان کی ساری فکرمندی کو ہوا کردے۔

"میں کیا کہوں، میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، سوچا تھا کہ مشعال کی شادی کرکے عاطف کی بھی کردیں گے، پھر عبیر کی رخصتی ہوجائے گی، مگر یہاں تو سب کچھ ہی الٹ پلٹ ہوگیا۔" سارہ نے بولتے بولتے ایک گہری سانس لی اب میں آگے کیا کہتی، خاموش ہوگئی۔

"بچوں سے بھی مشورہ کرلو، کیا پتا ان کے پاس کوئی بہتر تجویز ہو ہم سے۔" سارہ نے شوہر کو دیکھا۔

"عاطف اور مشعال کا تو یہ ہی کہنا ہے کہ رخصتی کردیں، جو کام سال، چھ ماہ بعد کرنا ہے وہ ابھی کردیں۔" ندیم نے اسے بتایا۔ جو آپ مناسب سمجھیں، کریں، مجھے تو بس مشعال کی فکر ہے۔ اس کا رشتہ ہوجائے کسی اچھی جگہ تو مجھے سکون سے نیند آئے۔" سارہ کے لفظوں اور انداز میں ایک ماں کی پریشانی بول رہی تھی۔ "اللہ مالک ہے، اس کا رشتہ بھی ہوجائے گا، جہاں نصیب ہوگا، یوں فکرمند ہوکر خود کو ہلکان مت کرو۔" ندیم نے تسلی دیتے ہوئے اسے سمجھایا۔

☆ ☆ ☆

عبیر کی شادی کی تیاریاں فقط دو ماہ میں مکمل کرلی تھیں، ان کے پاس اتنا ہی وقت تھا اسے رخصت کرنے کے لیے، سارہ کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے مگر ندیم، عاطف اور مشعال کی مدد سے اس مشکل اور کڑے مرحلے سے گزرنے کے تمام تر جتن کر رہے

تھے۔ شادی کے اخراجات اور تیاریاں اپنی جگہ' مگر خلق خدا سے نمٹنا' ان کے بظاہر بے ضرر مگر چبھتے ہوئے سوالات کے جوابات دینے میں ان کو دانتوں پسینے آگئے' مشعال کا رشتہ کیونکر ختم ہو گیا؟ اب کہاں کرنے کے ارادے ہیں؟ عبیر تو سب سے چھوٹی ہے' اس کی شادی پہلے کیوں کر رہے ہیں؟ عاطف کی بھی ساتھ میں کر دیتے' ایک بیٹی جاتی تو دوسری آجاتی' وغیرہ وغیرہ۔ پھر شادی کی تمام تقریبات میں بھی لوگوں کی چہ مگوئیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

گھر کی پہلی شادی اور ننھیال اور ددھیال کے بے حد قریبی رشتے غیر موجود' زارا اور علی کے جھگڑوں نے وہ طول پکڑا تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ عبیر کی شادی پر بھی دونوں کا مطالبہ سارہ سے یہ ہی تھا کہ صرف مجھے شادی میں مدعو کیا جائے اور دوسرے فریق کو نہ بلایا جائے' مگر سارہ ایسے کیسے کر سکتی تھی؟

"ٹھیک ہے' اگر تم میں سے کوئی بھی شادی میں نہیں آیا تو میرا ملنا جلنا تم لوگوں سے ختم' میں نہ تمہارے گھر آؤں گی' نہ علی کے' امی کو اپنے پاس بلوالوں گی۔" سارہ بھی غصے میں زارا کو دھمکی دے کر آگئی۔ مگر دونوں شادی کی کسی تقریب میں شریک نہیں ہوئے' مگر دونوں کے شریک حیات اور بچے ہر تقریب میں پیش پیش رہے۔ ادھر عنبرین اور بڑی آپا کے گھر سے شادی میں کوئی شریک نہیں ہوا' حالانکہ ندیم اور سارہ خود دعوت دینے گئے تھے اور بڑی آپا کے گھر جانے پر سارہ راضی نہیں تھی' مگر ندیم اور مشعال نے اسے وہاں جانے پر کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا' عبیر کی رخصتی ان سب کے بغیر ہی ہوئی۔

عبیر کی شادی کو چند ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ نمرہ کے گھر والوں نے شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ سارہ مشعال کی طرف سے سخت پریشان تھی۔ اس کے رشتے کے سلسلے میں کئی مہمان آئے اور حسب روایت کھا پی کر رخصت ہو گئے' کسی کو مشعال کے اضافی وزن پر اعتراض تھا' کسی کو اس کا قد کم لگتا تھا' کسی کو اس کی تعلیم لڑکے کے مقابلے میں بہت زیادہ لگتی' کسی کو لڑکی میں تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی' مگر علاقے اور گھر پر اعتراض ہوتا' اسٹیٹس کانشس افراد گھر کی تبدیلی کا مطالبہ کرتے کہ کسی پوش علاقے میں گھر لے لیں تو رشتہ کر لیں گے' اکثریت کو پہلی منگنی ختم ہونے کی وجوہات جاننے سے بھی دلچسپی ہوتی۔

سارہ اور ندیم دونوں ہی اس ساری صورت حال سے بہت دلبرداشتہ تھے۔ کئی جگہ مشعال کے رشتے کے لیے کہہ رکھا تھا' مگر کہیں کوئی بات بنتی نظر نہیں آرہی تھی۔

بہرحال گھر میں عاطف کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

سارہ نے شادی سے دو ہفتے پہلے ہی اپنی امی کو اپنے گھر بلالیا تھا۔ وہ بہت بوڑھی اور کمزور ہو گئی تھیں' اولاد کے آپس کے اختلافات اور بگڑے معاملات نے انہیں ذہنی اور جسمانی طور پر بہت متاثر کیا تھا' مگر ان کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ چپ چاپ تماشائی کا کردار ادا کر رہی تھیں اور اندر ہی اندر گھل رہی تھیں۔

سارہ نے واقعی اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ شوہر اور بچے بے بس ہو گئے۔ عاطف کی شادی کا ہنگامہ بھی عبیر کی رخصتی کی طرح ادھورا رہا۔ ان قریبی رشتوں کے بغیر بھی عاطف کی شادی ہو ہی گئی' بس ایک پھانس تھی جو ہمیشہ کے لیے سب کے دلوں میں گڑ کے رہ گئی اور رہ رہ کر تکلیف دیتی تھی۔ عاطف' نمرہ کو پا کر خوش تھا۔ ندیم اور سارہ بھی بہو آجانے سے کچھ بہل گئے تھے۔ نمرہ تھی بھی بہت سلجھی ہوئی اور محبت کرنے والی لڑکی' دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ نمرہ کو یہ لوگ بچپن سے جانتے تھے اور اس کی بھی اس گھر اور گھر کے مکینوں سے آشنائی تھی۔ لہٰذا اسے یہاں ایڈجسٹ ہونے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔

گرمیوں کی وہ ایک طویل اور اداس سی دوپہر تھی جب خاموشی اور افسردگی کے عالم میں سارہ اپنے کمرے میں لیٹی یونہی سوچ رہی تھی کہ علی اور زارا

سے ملے ہوئے اسے کتنا عرصہ بیت گیا ہے۔ تقریباً" ڈیڑھ سال ہونے کو آیا تھا۔ دیکھا جائے تو بات کچھ خاص بھی نہیں تھی۔ مگر پھر بھی جانے کیسے رشتوں میں ایک معمولی سی دراڑ پڑی اور وہ دراڑ بڑھ کر اتنا چوڑا شگاف بن گئی کہ وہ ایک دوسرے سے دور ہو کر شکل دیکھنے سے بھی محروم ہو گئے۔

جانے کیا کیا سارہ کو یاد آ رہا تھا۔ اپنا بچپن، لڑکپن، جوانی اور شادی کے بعد کے کئی سال، یہ یاد، ہر خیال علی اور زارا کے بغیر ادھورا تھا۔ عنبرین اور بڑی آپا کو بھی اس نے کبھی اپنی سگی بہن سے کم نہیں سمجھا، کتنا اچھا اور خوب صورت وقت گزارا تھا ان سب نے، مگر وہ وقت یوں فراموش ہو گیا جیسے کو تھا ہی نہیں، سوچ سوچ کر سارہ کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

سارہ بہتے ہوئے آنسو صاف کرنے لگی، آج نہ جانے کیوں، دل بھر بھر کر آ رہا تھا، سارہ اک دم اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کا دل اتنا بے چین ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی، وہ کھڑی ہو گئی، پیاس کے مارے حلق سوکھنے لگا تھا۔ ابھی قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ نمرہ تیزی سے اندر آئی۔

"امی جی۔" وہ سارہ سے مخاطب ہوئی تو اس کے چہرے پر پریشانی کی جھلک اور انداز میں جھجک اور تذبذب تھا، جیسے کہ کچھ کہنا چاہتی بھی ہو اور نہیں بھی، سارہ اک دم ٹھٹک کر رک گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے نمرہ کی طرف دیکھا۔

"وہ... فہد کا فون آیا تھا، زارا آنٹی کی طبیعت خراب ہے، وہ اسپتال میں ہیں۔" نمرہ کے رکتے رکتے اسے بتایا۔

"کیا ہوا زارا کو؟" سارہ کا چہرہ فق ہو گیا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔

"پتا نہیں، بس اس نے اتنا ہی کہا کہ امی اسپتال میں ہیں، خالہ کو بتا دیں۔" نمرہ بولتے ہوئے سارہ کے قریب آ گئی۔

"آپ پلیز پریشان مت ہوں، ہم ابھی اسپتال چلتے ہیں، میں کاظم سے کہہ کر آئی ہوں وہ ٹیکسی لینے گیا ہے۔" نمرہ نے سارہ کے ہاتھ تھامے جو انتہائی سرد اور بے جان سے ہو رہے تھے۔

"یا اللہ میری بہن کو کچھ نہ ہو، اسے اپنی حفظ و امان میں رکھنا، اسے کامل شفا اور صحت عطا فرما دے۔"

پورے راستے سارہ کا رواں رواں خالق حقیقی سے دعا میں، التجا میں فریاد کناں رہا۔

"فہد نے اور کچھ نہیں بتایا؟" سارہ نہ جانے کتنی بار نمرہ سے یہ سوال کر چکی تھی اور ہر بار اس کا ایک ہی جواب سن کر مایوسی اور بے بسی کے عالم میں اسے تکنے لگتی، اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو نمرہ اس سے چھپا رہی ہے اور اس کا شک یا اندازہ ٹھیک ہی تھا، نمرہ کو فہد نے بتا دیا تھا، مگر اس نے سارہ کے اسپتال پہنچنے تک یہ بات چھپائے رکھی کہ زارا کو برین ہیمبرج ہوا ہے اور وہ اس وقت آئی سی یو میں تھی۔



"آپا پلیز آپ دعا کریں، اسے ہوش آ جائے، بس ایک بار، ایک بار میں اس سے معافی مانگ لوں، میں اس کا گناہ گار ہوں۔ مجھے ایک پل کے لیے بھی سکون نہیں ملتا، آپا، میں کیا کروں، میں کیا کروں، مجھے بتائیں۔" علی، سارہ کے گلے لگا تو بکھر گیا۔ سارہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

سارہ کو رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ عاطف کی شادی کے ایک ہفتے بعد زارا کے شوہر گھر پر آئے تھے۔ نمرہ کو بلا کر شادی کی مبارک باد دی اور منہ دکھائی میں ایک بہت خوب صورت اور نازک سا لاکٹ سیٹ دیا۔ نمرہ تو سلام اور شکریہ کر کے ان کی خاطر تواضع کا انتظام کرنے چلی گئی مگر سارہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"جب سے عاطف کی شادی کا سنا تھا، زارا نے تب سے خرید کر رکھا ہوا تھا کہ عاطف کی دلہن کو منہ دکھائی میں دے گی۔ مگر آپ نے بلایا ہی نہیں۔" انہوں نے

کوئی طنز نہیں کیا تھا‘ بلکہ اپنی مخصوص سادگی اور بے تکلفی سے وہ سارہ سے مخاطب تھے۔

"عنبر کی دفعہ ان کو غصہ چڑھا ہوا تھا اپنے بھائی کی طرف سے‘ مگر ہم تو آئے تھے نا‘ آپ ہمیں دیکھ کر ہی دعوت دے دیتیں۔"

خلیل کے لہجے میں شکوے کا رنگ آچلا تھا اور بات ان کی ٹھیک بھی تھی‘ وہ تو بہت صلح جو اور سمجھ دار قسم کے انسان تھے۔ عنبر کی شادی میں زارا نہیں آئی‘ مگر وہ خود تو بچوں سمیت ہر تقریب میں پیش پیش رہے تھے‘ سارہ نے غصے میں وہ سب بھی فراموش کر دیا تھا۔

"جب اپنے بہن‘ بھائی ہی اپنے نہیں رہے تو کسی اور کا کیا۔" سارہ نے تلخی سے جواب دیا تھا۔ "مجھے علی اور زارا سے کبھی بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہ اپنے آپس کے جھگڑوں میں میری اور میرے بچوں کی خوشیاں بھی ملیامیٹ کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے‘ میں مانتا ہوں وہ دونوں غلط ہیں‘ مگر یہ رشتے کوئی ٹوٹنے یا چھوٹنے والے تھوڑی ہیں‘ آج ناراضی ہے‘ کل یہ ناراضی ختم ہو کر پھر آپ سب ایک ہو جائیں گے‘ چھوڑیں پچھلی باتوں کو‘ ختم کریں‘ میں دعوت دینے آیا ہوں‘ اس اتوار کو آپ سب ہمارے گھر کھانا کھائیں‘ اور صبح سے شام تک کے لیے آئیے گا‘ بلکہ ہو سکے تو ہفتے کی رات کو ہی آجائیں‘ وہی پہلے کی طرح‘ اپنا گزرا وقت اور بیتی یادیں ایک دوسرے سے شیئر کریں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

سارہ ان کی بات کے جواب میں خاموش ہی رہی تھی‘ نہ تو ناں میں جواب دینا چاہتی تھی اور نہ ہی ہاں میں‘ اتنے میں ندیم ڈیوٹی سے گھر واپس آگئے تھے۔ پھر وہ ندیم اور بعد میں عاطف سمیت تمام بچوں کے ساتھ باتوں میں لگ گئے تھے‘ رات کا کھانا کھا کر گئے اور اگلے اتوار کی دعوت میں آنے کی پرزور تاکید کر کے گئے تھے‘ مگر اتوار کو سارہ سب کے اصرار کے باوجود بھی نہیں گئی تھی۔

"تم لوگ جاؤ‘ مجھے پلیز اکیلا چھوڑ دو‘ میں نہیں جاؤں گی‘ میں نے کہہ دیا تم میں سے جو جانا چاہتا ہے شوق سے جائے‘ بس میرے پیچھے مت پڑو۔" سارہ کا چڑچڑا پن اپنے عروج پر تھا۔

اور کاش میں اس دن چلی ہی جاتی‘ وہ چھوٹی تھی‘ ضدی اور لاڈلی‘ اس نے ہٹ دھرمی دکھائی تو میں نے بھی بڑا پن نہیں دکھایا۔ سارہ کو کبھی نہ ختم ہونے والے پچھتاووں اور ندامتوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور آنسو تھمتے بھی کیسے‘ پچھلے ایک ہفتے سے زارا بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ اس کی جو کنڈیشن تھی اسے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی معجزہ ہی اسے اب ٹھیک کر سکتا ہے۔

دوا اور دعا میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی‘ مگر قدرت کے ارادے کچھ اور تھے‘ اسی بے ہوشی کے عالم میں دسویں روز زارا انتقال کر گئی‘ کسی سے کچھ بھی کہے اور سنے بغیر‘ خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

سارہ پر کڑی مشکل آن پڑی تھی‘ بوڑھی ماں کو کیسے تسلی دیتی؟ علی کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی‘ اسے سنبھالتی‘ جسے پچھتاوے اور ندامت نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ یا خود کو سمجھاتی‘ چوٹ بہت گہری اور درد بہت شدید تھا۔ شوہر اور بچوں نے کسی نہ کسی طرح اس کو سنبھال لیا۔ تعزیت کے لیے جہاں اور بہت لوگ سارہ کے پاس آئے‘ وہاں اظہر‘ عنبرین اور بڑی آپا بھی اپنے شوہر کے ساتھ آئیں۔ سارہ کی خوشیوں میں کوئی شریک ہوا یا نہیں‘ مگر اس کے غم میں سب برابر کے شریک تھے۔



"جب ہم لوگ چھوٹے تھے نا تو زارا جب بھی کسی بچے سے مار کھا کر یا لڑ کر آتی‘ علی سے شکایت کرتی اور علی فوراً اس کا بدلہ لینے پہنچ جاتا‘ میں ذرا صلح جو بلکہ ڈرپوک قسم کی تھی‘ اسکول میں یا محلے میں کھیل کے دوران کوئی مجھے کچھ کہہ دیتا تو ہمیشہ زارا یا علی ہی اس کو سبق سکھاتے۔

پتا ہے بڑے ہو جانے پر بھی زارا کا بچپنا نہیں گیا

تھا' اس کی حرکتیں اور باتیں وہی اوٹ پٹانگ تھیں۔ امی سے ڈانٹ کھاتی 'مگر ابو اس کی بہت حمایت کرتے تھے۔"

سارہ بلا تکان اور بلا ناغہ زارا کی باتیں کرتی رہتی تھی' کبھی ندیم سے' کبھی بچوں سے' کبھی خود سے' پھر بیٹھے بیٹھے رونے لگتی۔

وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ہی صبر آئے گا۔ ندیم بے بسی سے اسے چپ کراتے ہی رہ جاتے اور وقت تو گزر ہی رہا تھا' ایسی برق رفتاری سے' کہ پتا ہی نہیں چلا' ایک سال بھی گزر گیا۔

سارہ کے دل سے ابھی تک بہن کی یادیں فراموش نہیں ہوئی تھیں۔ رات گئے ندیم سے یہی باتیں کرتی رہی۔

"منصور کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔" ندیم نے باتوں کے دوران آہستگی سے سارہ کو بتایا۔

"کب؟ کہاں؟" سارہ کے منہ سے بے ساختہ سوالات نکلے۔

"پرسوں ہوا ہے' منصور کی کلاس فیلو ہے۔" ندیم نے مختصراً" بتایا۔

"اچھا!" سارہ نے یہ لفظ یوں کہا جیسے دل سے آہ نکلی ہو' مشعال کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا تھا۔

"کیا تھا جو بڑی آپا ہماری مشعال سے ہی کر لیتیں۔" سارہ کے دل میں پھانس اب تک گڑی ہوئی تھی۔

"بھول جاؤ کہ کبھی کوئی ایسی بات ہوئی تھی۔ دراصل ہماری بیٹی کا وہاں نصیب ہی نہیں تھا' شہرین کا معاملہ تو بس ایک بہانہ بن گیا' یہ بات نہ ہوتی تو کوئی اور بات ہو جاتی' مگر مشعال کا رشتہ وہاں سے ختم ہی ہونا تھا' اللہ ہماری بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔" ندیم نے آہستگی سے بولتے ہوئے تکیے پر سر رکھا۔



منصور کے بعد آنا" فانا" شہرین کا رشتہ طے ہونے کی بھی خبر آ گئی۔ اظہر مٹھائی لے کر آیا۔

ندیم اور سارہ سمیت سبھی گھر والوں کو اس خبر سے دلی مسرت ہوئی۔ سب نے ہی بے حد گرم جوشی اور خلوص سے اظہر کو مبارک باد دی اور فون کر کے عنبرین اور شہرین کو بھی۔

شہرین کے سسرال والوں کو شادی کی جلدی تھی' لڑکا کینیڈا سے آیا ہوا تھا' ایک ماہ کے اندر اندر شادی ہو رہی تھی' اس کے بعد منصور کی شادی تھی۔

مشعال بڑی خوشی خوشی شہرین کی شادی کی تیاریاں کر رہی تھی' مایوں کا سوٹ' بارات کا' ولیمہ کا' جوتے' جیولری' اس کی تیاری اور جوش و خروش ایسا ہی تھا' جیسے عبیر کی شادی کے وقت تھا۔

"ابھی تک کارڈ نہیں آیا چچا کے گھر سے۔" شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ تب مشعال نے تشویش کا اظہار کیا۔

"میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا۔" کاظم نے چپس ٹونگتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائیں' جہاں کوئی کامیڈی شو چل رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے آج کل میں آجائے' اتنی ایمرجنسی میں تو شادی ہو رہی ہے' سو کام ہوتے ہیں کرنے کے لیے' شادی سر پر آ پہنچتی ہے' مگر کئی ضروری کام ختم نہیں ہوتے۔" نمرہ اپنے چھ ماہ کے بیٹے کو فیڈر سے پانی پلا رہی تھی' اظہار خیال کر بیٹھی۔

"ہو سکتا ہے۔" مشعال نے زیرلب یونہی کہا۔ اسے کل ہی چھوٹے چچا کی رشنا نے فون پر بتایا تھا کہ عنبرین چچی ان لوگوں کی فیملی کو شادی میں نہیں بلائیں گی۔

"کیا؟" مشعال کو ایک جھٹکا سا لگا تھا یہ سن کر۔

"ابو بتا رہے تھے انہیں اظہر چچا نے بتایا تھا۔" رشنا نے اس کی بے یقینی پر بڑے اعتماد سے کہا۔

"اچھا!" مشعال اس کے بعد بس ہوں ہاں کر کے بات کرتی رہی' پھر اسے خدا حافظ کہنے کے کتنی دیر بعد تک بھی وہ اسی بے یقینی اور دکھ کے عالم میں بیٹھی رہی' اسے بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ شہرین کی شادی میں انہیں انوائٹ نہیں کیا جائے گا۔ کتنی خوشی خوشی اور شوق سے اس نے تیاری کی تھی شادی کی۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ لوگوں نے بھی تو عاطف

بھائی کی شادی میں انہیں نہیں بلایا تھا۔" مشعال کی سماعتوں میں رشنا کا جملہ گونج رہا تھا۔
کل سے مشعال شش و پنج میں تھی کہ گھر میں اس بات کا تذکرہ کرے یا نہ کرے۔
"ہو سکتا ہے' ایسی کوئی بات نہ ہو' رشنا کو غلط فہمی ہوئی ہو۔" اس نے خود کو جھوٹی تسلی سے بہلانا چاہا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ شہرین کو مایوں بیٹھے دو دن ہو چکے تھے اور شادی میں دو ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ تیسرے دن شادی تھی۔ مگر ندیم اور سارہ کو کوئی دعوت نہیں آئی اور ویسے بھی خاندان کے دوسرے افراد سے انہیں پتا چل ہی گیا تھا کہ اظہر کے چاہنے کے باوجود بھی عنبرین نے ان لوگوں کو بلانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔
"دیکھا آپ نے عنبرین کی حرکت کو؟ بڑے تیاریاں کر رہے تھے کہ بھتیجی کو یہ دیں گے' وہ دیں گے' ایسا کریں گے' ویسا کریں گے' ہم نے تو اپنا دل صاف کر لیا تھا' ملنا جلنا چاہتے تھے' مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ اس قابل ہی نہیں کہ مروت اور اخلاق کا مظاہرہ کیا جائے' رشتے نبھائے جائیں۔" سارہ چیخ کر ندیم سے مخاطب ہوئی۔ اسے بہت غصہ آرہا تھا۔
"چھوڑو' کیا کہہ سکتے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ ہم نے عاطف کی شادی میں انہیں نہیں بلایا۔" ندیم نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔
"تو؟ اس سے پہلے عبیر کی شادی میں تو بلایا تھا نا' کیوں نہیں آئے یہ لوگ؟" سارہ نے شوہر کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔
"وہ لوگ عاطف اور شہرین کے رشتے کو جواز بناتے ہیں۔" ندیم غیر شعوری طور پر ان لوگوں کی وکالت کر رہے تھے۔
"آپ زیادہ حمایت کرنے کی کوشش مت کریں' عاطف اور شہرین کے رشتے کے معاملے میں جو کچھ بھی ہوا' اس میں ہمارا کیا قصور تھا' اپنی طرف سے تو ہم نے نیک نیتی اور محبت کے ساتھ ہاتھ بڑھایا تھا' جو کچھ بھی ہوا وہ سب کے سامنے ہے' پھر ہم نے کتنی بار معافی بھی مانگ لی' شہرین تو اپنے گھر کی ہونے جا رہی ہے' ہماری بیٹی تو اب تک اپنے گھر بیٹھی ہے۔ میں اب بتا رہی ہوں' چاہے کچھ بھی ہو جائے' میری طرف سے جینا مرنا ختم' میں اب کسی سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔" سارہ بری طرح بکھر گئی۔
"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں اتنی جذباتی ہو جاتی ہو فوراً؟" ندیم نے بے بسی سے سارہ کو دیکھا۔
"پاگل ہو گئی ہوں میں' دماغ خراب ہو گیا ہے' کاش زارا کی جگہ میں مر گئی ہوتی' اس دنیا کے جھنجھٹوں سے تو قبر کی آغوش اچھی ہے۔" سارہ رونے لگی۔ "میری بیٹی کا گھر اب تک آباد نہیں' کیا مجھے فکر نہیں ہوتی' راتوں کو نیند نہیں آتی مجھے' پھر بھی' پھر بھی ہم نے بڑی آپا کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیا' ان سے میل جول کر لیا' کیا ہم ہی بے وقوف ہیں؟" سارہ کے آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔
"مشعال کتنی محبت اور خلوص سے اس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی' کیا اس کا دل نہیں دکھا ہو گا' اوپر اوپر ہنستی مسکراتی رہتی ہے' مگر عنبرین کی اس حرکت سے تو اس کا چہرہ بھی اتر گیا ہے' کیا پتا اکیلے میں کتنا روئی ہو' مجھے معلوم ہے نا' محبتوں کے معاملے میں وہ بھی میرے جیسی ہی ہے' ٹوٹ کر محبت کرتی ہے اور کوئی اس طرح ٹھیس پہنچا دے تو بہت چوٹ لگتی ہے' بہت تکلیف ہوتی ہے۔" سارہ اپنے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے بہت زیادہ رنجیدہ تھی۔
"ہم کسی کے دل میں اپنا دل نہیں ڈال سکتے۔ بس اب رونا بند کرو' عنبرین یا اظہر جو بھی کریں' ان کی مرضی' ہم ان کی خوشی میں خوش ہیں۔"
ندیم کا لہجہ دل گرفتہ تھا' عنبرین کے رویے سے دھچکا تو انہیں بھی لگا تھا۔ مگر سہہ گئے' اب بھی وہ شہرین کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھے۔



آج شہرین کی شادی تھی۔
"پتا نہیں چچا کے گھر کیا ہو رہا ہو گا اس وقت۔"

ناشتا بناتے ہوئے مشعال سوچ رہی تھی' دس بجنے والے تھے' ندیم' سارہ اور مشعال بیدار ہوگئے تھے۔ عاطف اور کاظم چھٹی والے دن دیر سے ہی اٹھتے تھے' نمرہ عموماً" صبح جلدی بیدار ہوتی تھی' مگر رات بھر بیٹے نے بہت تنگ کیا تھا' وہ بے چاری صبح فجر کی نماز پڑھ کر اب سوئی تھی۔

"رت جگا ہوا ہوگا' سب لوگ آئے ہوئے ہوں گے' کتنا مزا آیا ہوگا۔" مشعال نے آملیٹ پلیٹ میں نکالا۔

"ابو کو بلالیں امی! ناشتا تیار ہے۔" مشعال نے آملیٹ لاکر میز پر رکھا۔

"آرہے ہیں ابھی' موبائل بج رہا تھا' پتا نہیں کس کا فون آگیا اس وقت۔" سارہ سلائس پر شہد لگانے لگی۔

"تم شروع کرو' آرہے ہوں گے تمہارے ابو۔"

"ہاں' ابو کو آنے دیں' پھر کھالوں گی۔" مشعال نے کچھ نیم دلی سے کہا۔ اس کا دل بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا ناشتا کرنے کو' مگر ابو' امی کے خیال سے وہ بس زبردستی ہی بیٹھ گئی تھی۔

"ابھی وہ سلائس پر مکھن لگا رہی تھی کہ ندیم تیزی کے ساتھ حواس باختہ سے اندر آئے' چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آتے ہی وہ گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا؟" مشعال اور سارہ کے منہ سے ایک ساتھ سوال نکلا۔

"حنا کا فون تھا۔" ندیم نے اپنی سب سے چھوٹی بہن کا نام لیا۔

"وہ..." ندیم نے سوکھے لبوں پہ زبان پھیری۔ "وہ بتا رہی تھی کہ شہرین کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوگئی ہے۔ وہ لڑکا شادی شدہ تھا' ایک' دو دن پہلے اس کی سوئس بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان آگئی' اسے اپنے شوہر کی شادی کی اطلاع ملی تھی اور پتا نہیں کیسے وہ اظہر کے گھر پہنچ گئی' وہاں سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔

"کیا؟" سارہ اور مشعال کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"اس لڑکے کا اور گھر والوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ چکا ہے' مگر بیوی انکار کررہی ہے' اب اللہ جانے کیا بات ہے' مگر یہ تو طے ہے کہ انہوں نے لڑکے کی بیوی اور بیٹی کے بارے میں کچھ نہ بتاکر دھوکے بازی کا مظاہرہ تو کیا ہے۔"

ندیم کی آواز' ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی' شہرین انہیں مشعال اور عبیر کی طرح ہی پیاری تھی' اس کی زندگی کا یوں تماشا بننا کسی بہت بڑے صدمے سے کم نہ تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" بہت دیر بعد مشعال کی دھیمی سی آواز آئی۔

"آج رات شادی ہے' سارے انتظامات مکمل ہیں' اور..." ندیم نے جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

"اوہو' ناشتا چل رہا ہے' بلکہ دوڑ رہا ہے' اب فٹافٹ میرے لیے بھی کچھ انتظام کردو۔" کاظم کرسی گھسیٹ کر بیٹھتا ہوا بولا' آج وہ خلاف توقع آدھ ایک گھنٹہ پہلے اٹھ گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" سب کے چہروں پر غیر معمولی سنجیدگی دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا' ناشتا بھی میز پر رکھے رکھے ٹھنڈا ہوگیا تھا۔

مشعال نے مختصر لفظوں میں اسے پوری بات بتائی۔

"کیا؟" کاظم کا منہ بھی حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا' اور پھر بتدریج اس حیرت کی جگہ سنجیدگی اور رنجیدگی نے لے لی۔

"یہ تو بہت برا ہوا؟" اس نے کچھ دیر بعد تاسف سے کہا۔

"برا نہیں' بہت زیادہ برا ہوا' نہ جانے اس بچی کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔" ندیم کا لہجہ اور آواز دکھ سے بوجھل تھے۔

"شہرین کی شادی' آج ہی' ہو بھی سکتی ہے۔" مشعال نے اچانک کہا تو سب چونک پڑے۔

☼ ☼ ☼

زندگی یونہی گزرتی چلی جاتی ہے، نسل در نسل وہی ایک سی کہانیاں اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی، سارہ کو جانے کیا کیا یاد آرہا تھا، اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا دور، جب امی کے میکے اور سسرال کی داستانیں ان کے منہ سے سنا کرتی تھی، وہی رنجشیں، دوریاں، غلط فہمیاں ہم سوچتے ہیں کہ ہم وہ غلطیاں نہیں کریں گے جو ہمارے بڑوں نے کی ہیں، مگر دانستہ یا نادانستہ ہم انہی راستوں پر چلتے چلے جاتے ہیں، جہاں قربت اور الفت کے پھولوں کے بجائے نفرت، عناد اور دوریوں کے کانٹے بچھے ہوتے ہیں۔ جہاں دلوں کو ملانے والی نہیں بلکہ الگ کرنے والی پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔

"تو اب وقت آگیا ہے کہ ان زہریلے کانٹوں بھرے راستے کو چھوڑ کر وہی راستہ اپنایا جائے جہاں سب لوگ مل کر ساتھ چلیں، ایک دوسرے کا ساتھ اور رشتے نبھاتے ہوئے۔" سارہ نے فیصلہ کرلیا۔

ندیم نے دو گھنٹے پہلے اس سے مختصر سی ہی بات کی تھی۔

"سارہ! ہم میں سے کسی کو بھی توقع نہیں تھی، نہ اندازہ تھا کہ زارا یوں اچانک ہماری دنیا اور زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی، زندگی میں ہم رشتوں اور لوگوں کی قدر نہیں کرتے اور بعد میں پچھتاتے ہیں، ایک روز اس دنیا میں، میں اور تم بھی نہیں ہوں گے اظہر اور عنبرین بھی، مگر بس ہمارے فیصلے اور وہ راستے ہوں گے، جو ہم اپنی آئندہ نسل کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ اب تم خود فیصلہ کرو کہ تمہیں اپنے بچوں کے لیے محبت کا راستہ چھوڑنا ہے یا نفرت کا۔"

اور سارہ سوچتی رہی، روتی رہی، فیصلہ تو اس نے ندیم کی بات سنتے ہی کرلیا تھا۔ بس بلاوجہ کی انا تھی جو آڑے آرہی تھی، مگر سارہ کے نرم اور حساس دل نے اسے پچھاڑ دیا۔

جب مشعال نے شہرین کے لیے کاظم کا نام تجویز کیا تو فوری طور پر اس کا ردعمل جارحانہ ہی تھا، مگر پھر اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ اپنے بچوں کے لیے لڑائی جھگڑوں کی جو فصل وہ لوگ چھوڑ جائیں گے، اسے آئندہ کی نہ جانے کتنی نسلیں کاٹیں گی۔

ندیم نے اظہر کو فون کرکے اپنے آنے کا عندیہ دیا۔

"شہرین کی شادی ان شاءاللہ آج اسی وقت ہوگی جو تم نے طے کیا تھا، بس دولہا اور باراتی بدل گئے۔"

اظہر اور عنبرین کی رضامندی کے بعد ندیم نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ تو نہ جانے کتنے گھنٹوں کے کرب اور اذیت کے بعد اظہر کے لبوں پہ مسکراہٹ آئی تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بہت اچھے طریقے سے ایڈجسٹ ہوجائے گی۔ عاطف کے ساتھ اس کی کوئی ایسی گہری جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ اس نے بہت جلدی خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اس کا نصیب ہمارے گھر میں ہی لکھا تھا، مگر تمہارے ساتھ مجھے یقین ہے کہ وہ اللہ کی اس مرضی پر راضی اور خوش ہوگی۔"

مشعال جو شہرین کو بہت قریب سے جانتی تھی، دل ہی دل میں کاظم سے مخاطب ہوئی، جو اس اچانک شادی پر کچھ کچھ حیران، پریشان اور شرمایا ہوا سا تھا۔ اللہ تعالیٰ میری بچی کو بھی اپنی رحمت اور عافیت سے نوازے، اس کے نصیب اچھے کرے۔ مشعال کو خوشی خوشی جانے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی، طمانیت سے مسکرادی۔

نفرت کے راستے سے الفت کے راستے کا فاصلہ محض دو قدم ہی کا تھا، مگر کبھی کبھی ہم یہ دو قدم طے کرنے میں اتنا وقت لگا دیتے ہیں کہ زندگی ہی ختم ہوجاتی ہے۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم سے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کروایا۔" سارہ نے اپنے دل کو شکر گزاری کے جذبات سے لبریز پایا اور۔ تیار ہونے چل دی۔





یاد کا جگنو

سکوتِ شب کے
سیاہ لمحوں کی آنکھوں میں
تلخئ حیات کا پیمانہ
درد کی مئے سے بھرنا ہے
سرسوں کے پھولوں
کے جنگل میں
پھول در پھول اُڑتے ہوئے
طلوعِ سحر تک
روشنی کا سفر
طے کرنا ہے
بن کے تمہاری یاد کا جگنو

سرور شاذ

یہ سنگت دیس دیوانی ہے

یہ کویتا پاکستانی ہے
یہ سنگت دیس دیوانی ہے
مرے دریاؤں کی لہروں میں
سُر چڑھتے اور اُترتے ہیں
مرے کھیتوں اور کھلیانوں سے
سب روپک تال اُبھرتے ہیں
ہر تال میں ہے تصویرِ وطن
اور ہر تصویر کہانی ہے
یہ کویتا پاکستانی ہے
یہ سنگت دیس دیوانی ہے

جمیل الدین عالی

شگفتہ جاہ

زندگی گلگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔"

تشریح :۔ عام گزرگاہوں کی حفاظت اور ان کی تعمیر و صفائی اس قدر ضروری ہے کہ وہاں سے ایک تنکے کو دور کر دینا بھی ایک بڑا ثواب قرار دیا گیا ہے اور کسی پتھر، کانٹے کوڑے کو دور کر دینا ایمان کی علامت بتایا گیا۔ یہ مذہب اسلام کی ایک خوبی ہے کہ اس نے ہر مقام پر خدمت خلق کو مدنظر رکھا ہے۔

اخلاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم،

سب جانتے ہیں، ابوجہل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ایک مرتبہ اس کے دوست نے اس سے پوچھا۔

" دوست! یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی اور نہیں۔ جو ہماری باتیں سن سکے۔ یہ بتاؤ، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں یا جھوٹے؟"

ابوجہل نے کہا۔

" خدا کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

اس اعتراف کے باوجود ابوجہل نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ اس کا غرور و تکبر تھا چنانچہ وہ شرک ہی کی حالت میں مارا گیا۔"

نادیہ اسلم گجر۔ ٹھٹھہ پور

خوبصورتی کے آداب،

قبیلہ بنی طی کا ایک نوجوان احنفا کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ احنفا کو بہت ہی اچھا لگتا تھا۔

ایک دن احنفا نے اس سے پوچھا " اے نوجوان کیا تو اپنی خوبصورتی کو اور خوب سیرتی کو کس چیز سے مزین کرتا ہے؟"

نوجوان نے کہا " ہاں! میں جب بات کرتا ہوں یعنی بولتا ہوں تو سچ بولتا ہوں۔ سوچ کر بولتا ہوں۔ جب کوئی مجھ سے بات کرتا ہے تو میں غور سے سنتا ہوں جب معاہدہ کرتا ہوں تو اسے پورا کرتا ہوں یعنی نبھاتا ہوں۔ جب وعدہ کرتا ہوں تو اسے پورا کرتا ہوں اور جب میرے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو خیانت نہیں کرتا۔"

دعا گل۔ لکی مروت

رضامندی،

ایک برطانوی خاتون نے ایک عدالت میں جیوری کی رکن بننے سے محض اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ موت کی سزا کو ناپسند کرتی تھیں۔ جج نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

" دیکھیے محترمہ! وہ مقدمہ جس کے لیے آپ کو جیوری میں شامل ہونا ہے، ایک معمولی سا مقدمہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک عورت نے اپنے شوہر کو دس ہزار پونڈ زیورات کی خریداری کے لیے دیے تھے مگر شوہر نے زیورات لانے کے بجائے ساری رقم جوئے میں ہار دی۔"

محترمہ نے یہ سنا تو فوراً بولیں۔" آپ کی بات بالکل مناسب ہے۔ میں بہ خوشی جیوری میں شامل ہوتی ہوں، ممکن ہے کہ موت کی سزا کے بارے میں میرے جو خیالات ہیں وہ غلط ہی ہوں۔"

ہنزہ، اقراء۔ کراچی

قانون،

مچھلیوں کے شکار کا موسم نہیں تھا۔ ایک شخص

کو دریا میں مچھلیاں پکڑتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ وارڈن نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ سال کے اس حصے میں مچھلیاں پکڑنا منع ہے۔"

شکاری نے اثبات میں سر ہلایا تو وارڈن نے پوچھا۔

"پھر تم کیوں شکار کھیل رہے ہو؟"

شکاری کہنے لگا "جناب! جب شکار کا موسم آتا ہے تو مچھلیاں غائب ہو جاتی ہیں لیکن جب شکار کا موسم ختم ہو جاتا ہے تو دریا میں ہر طرف مچھلیاں ہی مچھلیاں نظر آتی ہیں۔ اب ایسے قانون کا کیا فائدہ جس پر مچھلیاں ہی عمل نہیں کرتیں۔"

شاہدہ شبیر رانا۔ رحمان گڑھ

حضرت علیؓ نے فرمایا

ضرورت کے وقت اللہ کو پکارنے والا دونوں صورتوں میں اللہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ ضرورت پوری ہو جائے تب بھی اور ضرورت پوری نہ ہو تب بھی۔

نیلم ناز۔ سکھر

فرانسیسی کہاوتیں

- نکمے مزدور کو اچھا اوزار کبھی نہیں ملتا۔
- باپ قدرت کی طرف سے ہمارا خزانچی ہے۔
- اپنی غلطی سے پھرنا دوبارہ غلطی کرنے کے مترادف ہے۔
- قابل ڈرائیور تنگ موڑ پر گاڑی موڑنا جانتا ہے۔
- چھوٹی چھوٹی ندیاں بڑے بڑے دریا بناتی ہیں۔
- مئی اور دسمبر کبھی متفق نہیں ہو سکتے۔
- طاقت کسی کا حق نہیں پہچانتی۔
- چھوٹے چھوٹے تحفے بڑی دوستیاں برقرار رکھتے ہیں۔

درخشاں بی۔ چوٹالہ

آنسوؤں کی طاقت

کہتے ہیں سلطان صلاح الدین ایوبی صلیبی جنگوں میں مصروف تھے۔ اطلاع ملی کہ دشمن کا بحری بیڑہ آرہا ہے تو سلطان صلاح الدین ایوبی کو بڑی فکر ہوئی کہ مسلمانوں کی تعداد پہلے تھوڑی ہے اب اوپر سے اگر دشمنوں کا بحری بیڑہ آ گیا تو مسلمانوں کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ بیت المقدس میں پہنچ کر ساری رات اللہ کے حضور مناجات میں گزاری۔ رکوع و سجدے میں گزاری۔ فجر ہو گئی۔ فجر پڑھ کر گھر جانے کے لیے نکلے تو مسجد کے دروازے پر کسی اللہ والے سے ملاقات ہوئی۔ اس کا چہرہ پرنور تھا۔ صلاح الدین ایوبی ان کے قریب آئے اور ان سے کہا۔

"حضرت دعا کیجیے دشمن کا بحری بیڑا آرہا ہے۔" وہ بھی کوئی باخدا بندے تھے۔ وہ بھی مادے کے پار دیکھنا جانتے تھے۔ بصیرت نصیب تھی ان کو۔ انہوں نے صلاح الدین کے چہرے کو دیکھا۔ پتا چل گیا کہ اس کی ساری رات کیسے گزری، فرمانے لگے۔

"صلاح الدین! تیرے رات کے آنسوؤں نے دشمن کے بحری بیڑے کو ڈبو دیا ہے۔"

اور واقعی تیسرے دن اطلاع ملی، دشمن کا بحری بیڑا سمندر میں ڈوب چکا ہے۔

شافیہ اسلم۔ ہری پور

خوراک

مریض نے آکر ڈاکٹر صاحب سے شکایت کی۔

"آپ نے مجھے طاقت کی جو گولیاں دی تھیں، وہ سب کی سب میں بڑی باقاعدگی سے کھا رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں خود کو بے حد کمزور محسوس کر رہا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے تمہاری خوراک ٹھیک نہ ہو۔ آج کل کیا کھا رہے ہو؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"اچھا... تو ان گولیوں کے علاوہ مجھے کھانا بھی کھانا تھا؟" مریض نے حیرت سے کہا۔

فرحانہ۔ سرگودھا

خون کا عطیہ

ایک بزرگ آدمی خون کا عطیہ دینے اسپتال پہنچے اور ڈاکٹر سے کہنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا خون لیجیے۔"

ڈاکٹر نے کہا "بزرگوار! آپ کافی بوڑھے ہو۔ آپ کا خون نہیں لیا جا سکتا۔"

مگر بزرگ آدمی منت سماجت کرنے لگے اور بضد رہے کہ میں خون ضرور دوں گا۔
بالآخر ڈاکٹر نے کہا ”اچھا بھئی بزرگوار بیڈ پر لیٹ جاؤ۔“
خون کی بوتل جونہی آدھی ہوئی، بزرگ دیکھ کر بے ہوش ہوگئے۔ ہوش میں آنے کے بعد بولے۔
”ارے کم بختو! بس بھی کرو۔ کیا سارا خون نکالو گے۔“
ڈاکٹر نے کہا ”بزرگوار آپ کو پانچ بوتل خون لگا چکے ہیں۔ یہ چھٹی بوتل لگ رہی ہے۔“
صائمہ رحیمی۔ کراچی

علاج

”تم اپنی بیماری کا کیا علاج کر رہے ہو؟“
”میں آرام کے ذریعے اپنا علاج کر رہا ہوں۔“
”وہ کس طرح؟“
”میں روزانہ تین گھنٹے ڈاکٹر کے ویٹنگ روم میں آرام سے اپنی باری کے انتظار میں گزارتا ہوں۔“
مریم، سعدیہ۔ کراچی

عمل سے زندگی بنتی ہے

برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ دنیا کے پانچویں حصے پر حکمران تھی۔ ایک روز اس نے اپنے اتالیق اور وزیراعظم لارڈ ملبورن سے پوچھا۔
”آپ نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں آپ کو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات کیا نظر آئی؟“
لارڈ ملبورن نے بلا تامل جواب دیا۔
”اسلام کا عروج۔“
ملکہ نے سوال کیا ”آپ نے اس کے اسباب پر بھی غور کیا؟“
اس نے کہا ”میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ ان کے پیغمبر نے انہیں ہدایت کے لیے ایک ہدایت قرآن مجید دی تھی۔ جب تک وہ اس پر عمل پیرا رہے، ترقی کی تمام راہیں ان پر کھلی رہیں۔ پھر جیسے ہی انہوں نے اس سے بے رخی برتنی شروع کی، ان کا زوال شروع ہوگیا۔“
اگر کسی زمانے میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا، مسلمانوں نے ایک قوم کی حیثیت سے پھر قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی انفرادی اور قومی زندگی اس کے مطابق بنائی تو پھر سے ہم تو کیا ساری دنیا ان کے زیر نگیں آجائے گی۔
شاہدہ شبیر رانا۔ رحمان گڑھ

بہتر نظر نہ آنے کے دس بہانے

- میرے پاس وقت نہیں ہے۔
- میرے شوہر کو میک اپ پسند نہیں ہے۔
- مجھے تصنع بالکل پسند نہیں ہے۔
- پھر بھی کوئی توجہ نہیں دے گا۔
- مجھے بننے سنورنے کا شوق نہیں ہے۔
- میری مالی استطاعت نہیں ہے۔
- کیا میں اس کے بغیر بری لگتی ہوں۔
- چھوڑو کوئی اور بات کرو۔
- اب کیا، اب تو عمر ہی گزر گئی ہے۔
- مجھے خوف آتا ہے۔

راہب

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کی خبر سن کر شاہ روم نے کہا۔
”اگر عیسیٰ مسیحؑ کے بعد کوئی شخص تن مردہ میں جان ڈال سکتا تو وہ عمر بن عبدالعزیزؒ ہوتے۔ میں اس راہب کو پسند نہیں کرتا جو دنیا سے منقطع ہوکر عبادت خانے میں جا بیٹھے۔ میں تو اس راہب پر تعجب کرتا ہوں جو دنیا کو اپنے قدموں کے نیچے رکھتا تھا۔ پھر بھی راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا۔“
عنبر نوشین۔ گوجرانوالہ

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

- دونوں پیروں سے ایک بے وقوف ہی پانی کی گہرائی معلوم کرسکتا ہے۔
(افریقی کہاوت)
- ”بالکل غلط ہونے سے ”تقریباً صحیح“ ہونا بہتر ہے۔
(وارن بفٹ)

کچھ لوگ آگ کی روشنی دیکھ کر ہی راستے بدل لیتے ہیں جبکہ کچھ لوگ آگ کی حدت محسوس کر کے راستہ بدلتے ہیں۔

(کیرولین شیر ڈون)

گفتگو ختم کرنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب دوسرا کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا رہا ہو۔ (ہاپکنز)

غربت سے امارت کا سفر جان جوکھوں کا ہے مگر واپسی بہت آسان ہے۔ (چینی کہاوت)

نادیہ اسلم گجر۔ ٹھٹھہ پور

قابل دید،

چند ریٹائرڈ کاروباری حضرات نے علاقے کی ایک چلتی ہوئی شراب کی دکان خریدی اور نئے سرے سے اس کی تزئین و آرائش کے لیے اسے بند کر دیا۔ کافی دنوں تک یہی معمول رہا کہ وہ دکان میں آتے، دروازے کھڑکیاں بند رہتیں اور اندر سے کھٹر پٹر کی آوازیں آتی رہتیں۔

آخر کار کھٹر پٹر کی آوازیں آنا بند ہو گئیں لیکن دکان نہیں کھلی۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے۔ آخر ایک روز متوقع گاہکوں کے لیے مزید انتظار کرنا ممکن نہ رہا۔ وہ ہجوم کی صورت میں دکان کے سامنے جمع ہو گئے۔ ان میں سے کسی نے دکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحے بعد چھوٹی سی ایک کھڑکی کھلی اور ریٹائرڈ بزنس مین نے بے زاری سے باہر جھانکا۔

"جناب! دکان کب کھلے گی؟" مجمع میں سے کسی نے بلند آواز میں پوچھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ یہ دوبارہ کھلے گی؟" بزنس مین نے بے زاری سے کہا۔ "یہ تو ہم نے اپنے لیے خریدی ہے۔"

صدف عمران۔ کراچی

آسٹریلیا میں خرگوش،

جان ولیم کلائس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جب آسٹریلیا کا برِاعظم نیا نیا دریافت ہوا اور یورپ کے بہت سے لوگ وہاں جا کر آباد ہونے لگے تو انہوں نے دیکھا کہ اس برِاعظم میں خرگوش بالکل نہیں ہیں۔ یہ لوگ یورپ میں خرگوش کے شکار کے عادی تھے اور انہیں اس شکار میں جو لطف آتا تھا آسٹریلیا میں اس کی بار [illegible] لانے والا [illegible] شخص تھامس آسٹن تھا۔ اس نے ۱۸۵۹ء میں [illegible] فضا خوشگوار بنانے کی کوشش کی اور [illegible] کے تقریباً بارہ جوڑے منگوا کر وہاں چھوڑ دیے۔

لیکن قدرت کی حکمتوں کا احاطہ کون کر سکتا ہے [illegible] ہیں تو خرگوشوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی مخلوقات بھی پائی جاتی ہیں جو ان کی طبعی دشمن ہیں اس کی وجہ سے وہاں خرگوش کی نسل میں اعتدال و توازن برقرار رہتا ہے مگر آسٹریلیا —— ان طبعی دشمنوں سے خالی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بارہ جوڑوں سے خرگوش کی نسل بڑھنی شروع ہوئی تو اس کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا آسٹریلیا خرگوشوں سے بھر گیا اور یہ بے بہار مخلوق کھیتوں میں گھستی تو کھیت ویران کر دیتی۔ چراگاہوں میں پہنچتی تو چراگاہیں اجاڑ دیتی۔ غرض وہ جانور جسے آسٹریلیا کی طبعی فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے باقاعدہ درآمد کیا گیا، سارے برِاعظم کے لیے عذابِ جاں بن گیا۔ اب اس مشکل پر قابو پانے کی کوشش شروع ہوئی۔ "کوئنز لینڈ" کے علاقے میں باقاعدہ سات سو میل لمبی فصیلیں اس غرض کے لیے تعمیر کی گئیں کہ خرگوش آبادیوں میں نہ پہنچ سکیں لیکن یہ کوشش بھی ناکام ہوئی اور خرگوش ان فصیلوں کو پھلانگ کر اندر آنے لگے۔ پھر ایک زہریلی غذا کو کام میں لا کر یہ روز افزوں نسل گھٹانے کی کوشش کی گئی مگر اس کا بھی نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

آخر کار کئی سال کی محنت اور کوشش کے بعد اس مشکل کا حل دریافت ہوا۔ ایک دوا ایجاد کی گئی جو خرگوش کو مرض مخاطی کے مہلک مرض میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اس وباء کے پھیلنے سے خرگوش کی نسل میں کمی واقع ہوئی اور رفتہ رفتہ بڑے بڑے خشک صحرا اور بنجر پہاڑ جو دسیوں سال قحط زدہ رہے۔ اب سرسبز و زرخیز خطوں میں تبدیل ہو گئے —— اس کے علاوہ بکریوں کی تجارت سے آمدنی بھی بہت بڑھ گئی۔ 53-1952ء کے دوران اس تجارت سے آمدنی میں جو اضافہ ہوا، اس کا اندازہ 84 ملین پونڈ ہے۔

شافیہ اسلم۔ ہری پور ہزارہ



امت الصبور

خاتون کی ڈائری

شاہدہ شبیر رانا کی ڈائری سے

یاسیت دراصل تغیر احساس سے پیدا ہونے والی کیفیت کا نام ہے۔ اور یہ کیفیت انسان کے باطن میں ظہور پذیر ہونے کے بعد کیسے لفظوں کی صورت میں ڈھل کر منکشف ہوتی ہے۔ اسی کیفیت اور درد کو "منور جمیل" اپنی نظم میں بیان کر رہے ہیں۔

زمیں پر پاؤں رکھتا ہوں تو دل پر بوجھ پڑتا ہے
فلک پر دیکھتا ہوں تو عجب اک بدگمانی کی کہانی
فنا کی گرد میں لپٹی ہوئی شکلیں دکھاتی ہے
جدا ہونے نہ ہونے کے کئی نوحے سناتی ہے
ہوا سے بات کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ اس کی یاد کی
خوشبو کی، خدوخال کی، رنگوں کی بارش
ہوا کے جسم کو چھو کر نہیں گزری
عجب بے اختیاری کی فضا ہے
نہ اب کاغذ پہ پہلے کی طرح غزلیں اترتی ہیں
نہ اس کی بات ہوتی ہے
نہ خوشبو سے لدی شامیں اترتی ہیں
نہ شاخ وقت پر وعدوں کا کوئی پھول کھلتا ہے
نہ منزل ہے، نہ رستے میں کوئی بھی پہلے جیسی
خوش دلی سے آ کے ملتا ہے
کہ جس سے پوچھ لیں ہم تم محبت کی کہانی لکھتے لکھتے خالی
صفحے چھوڑنے والو
کہ حرف و لفظ سے معنی کے ناتے توڑنے والو
کہاں ہو تم؟
کہانی اپنے کرداروں سے خالی ہو رہی ہے

شافیہ اسلم کی ڈائری سے

یہ بات تو مسلم ہے کہ جب دل کا موسم اچھا نہ ہو تو باہر کا موسم کتنا ہی رعنائیوں سے بھرپور ہو، اچھا محسوس نہیں ہوتا۔ ہر طرف دکھ پھیلا نظر آتا ہے اور شاید اعتبار ساجد نے بھی یہ غزل کچھ انہی حالات میں کہی ہے۔

تعبیر ہو جس کی اچھی سی، کوئی ایسا خواب نہیں دیکھا
کوئی ٹہنی سبز نہیں پائی، کوئی شوخ گلاب نہیں دیکھا

ایسا ہے کہ تنہا پھرنے کا کچھ اتنا زیادہ شوق نہیں
ترے بعد سو، ان آنکھوں نے کبھی جشن مہتاب نہیں دیکھا

ہم ہجر زدہ سودائی تھے، جلتے رہے اپنے شعلوں میں
اچھا ہے کہ تو محفوظ رہا تو نے یہ عذاب نہیں دیکھا

بس اتنا ہوا، ہم تشنہ دہن لوٹ آئے بھرے دریاؤں سے
کوئی اور فریب نہیں کھایا، کوئی اور سراب نہیں دیکھا

کسی شاخ امید کی باہوں نے گجرے نہیں پہنے اب کے برس
یہ موسم یوں ہی بیت گیا، کلیوں پہ شباب نہیں دیکھا

نمرہ، اقرا کی ڈائری سے

شاعری کا خوبصورت نام خالد معین، ان کی غزل تمام قارئین کے لیے۔

بہت دن بعد پھر ایسا ہوا ہے
کہ ہم سے آئینہ روٹھا ہوا ہے

ہمارے ہونے کے امکاں سے آگے
نہ ہونے کا خلا پھیلا ہوا ہے

تمہارے جیت جانے سے زیادہ
ہماری ہار کا چرچا ہوا ہے

بہت گھل مل کر بھی دنیا سے ہم نے
ذرا سا فاصلہ رکھا ہوا ہے



ناد رہ خاتون

بات نامے عالم



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نورین عباس.....لاگر

میں خواتین ڈائجسٹ بہت ذوق وشوق سے پڑھتی ہوں مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ مہربانی کر کے آپ مجھے بتا دیں کہ اگر میں اپنا ناول آپ کے ڈائجسٹ میں بھیجنا چاہوں تو اس کا کیا طریقہ کار ہے۔

ج خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' بلاشبہ ہم نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ آپ صفحے کی ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور جیسے یہ خط پوسٹ کیا ہے اسی طریقے سے اسی ایڈریس پر پوسٹ کر دیں۔

نسیم کھوکھر' سندھ میھز

ٹائٹل اچھا تھا اور سب سے پہلے میں نعیمہ ناز جی کا ذکر کروں گی اس بار مجھے خط لکھنے پہ مجبور کر دیا نعیمہ ناز جی نے میں تو ان کے قلم کی قائل ہو گئی۔ تحریروں میں' سب تحریریں اچھی تھیں۔ افسانوں میں' ثمرہ بخاری جی نمبر لے گئیں ویل ڈن ثمرہ جی! اور سب بھی اچھی تھیں۔

ج پیاری نسیم! آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں' اس کے لیے کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔ نعیمہ ناز کی کہانی نے آپ کو خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

فرحانہ..... سرگودھا

بی اے کرنے کے بعد سوچا تھا' اب آگے نہیں پڑھنا۔ مگر گرمیوں کی طویل دوپہروں ' لوڈشیڈنگ کے طویل دورانیوں نے ناچیز کو آرام سے سال بھی نہیں گزارنے دیا اور کورس کی کتابوں کی یاد دلا دی اور اب ایم اے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تاریخ میرا پسندیدہ مضمون ہے۔ لہٰذا اسی مضمون کا فیصلہ کیا ہے۔ ٹھیک کیا نا؟

ماڈل اچھی لگ رہی تھی مگر ڈریس اچھا نہیں لگا۔

''کرن کرن روشنی'' سے فیض حاصل کیا۔ باقی دنیا کا تو معلوم نہیں مگر اپنے وطن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ''یہاں سے امانت داری اٹھ گئی ہے'' جب ہی تو اس قدر زبوں حالی کا شکار ہیں۔

رفعت ناہید سجاد کے لیے ڈھیروں دعائیں اور عقیدت بھرا اسلام ''چراغ آخر شب'' میں پلیٹ فارم کی منظر نگاری میں رائٹر نے تھال پر چائے کی پیالیوں کا مینار سجائے گزرتے بچے کی اہمیت بڑھا دی۔ یوں لگا اس بچے کے ذکر کے بغیر پلیٹ فارم کا منظر ادھورا رہ جاتا۔ رخسانہ نگار آپی کو میرا اسلام اور دعائیں۔

''محبت خواب سفر'' میں عزہ ایک عزت دار لڑکی ہے اسی لیے آخری صفحہ پڑھ کر بھی دل نہیں مانا کہ ریمپ پر نیم عریاں لباس میں عزہ آئے۔

عطیہ عمر کا افسانہ اچھا تھا۔ سلمیٰ یاسمین نجمی کا افسانہ ''کیسے سیاست دان'' مزاحیہ رنگ میں اچھا لگا۔ آپ ایک افسانہ سیاستدانوں کے بیرون ممالک کے دوروں پر لکھیے گا۔ سدرہ سحر کا افسانہ ''ٹھنڈی چائے'' اچھا لگا۔ ثمینہ عظمت

کا افسانہ کیا کہا جائے‘ حیران کن تھا۔ عورت حسد‘ جلن کا اس حد تک شکار ہو سکتی ہے کہ بہن بھائی کے رشتہ کو بھی رقابت کی نظر سے دیکھتی ہے۔
سعدیہ حمید کا ناولٹ ”من و تو“ اچھا تھا۔ پہلے پہل تو مجھے زینب کا اعتراف اچھا نہیں لگا۔ اینڈ میں اس کا فیصلہ بہت پسند آیا۔ رخ چودھری نے ہنسایا۔ آسیہ رزاقی کا ناول ”جی یہ ہی بات ہے“ پڑھ کر سوچا انسانی دماغ کتنی حیران کن شے ہے۔
نبیلہ ابر راجہ کا ناول ”مجھے رنگ دے“ جعلی ڈگریوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ انٹرویوز بہت اچھے تھے۔
”اس کار ہنر میں“ انیسہ سلیم آجائیں تو ماہ بدولت کو ڈھیروں ڈھیر خوشی مل جائے گی۔
”باتیں کتابوں کی“ میں حمیرا اطہر نے ذکر کیا ”امن کی آشا“ کا اس پر میں بھی اتفاق کروں گی۔ ہمیں اپنے ٹی وی چینلز پر انڈین پروگرامز‘ موویز‘ اشتہارات اور مزید یہ ”امن کی آشا“ گیت دیکھ کر مجھے بڑا تاپا چڑھتا ہے۔ جب دلوں میں نفرتیں‘ تعصب ہیں تو امن کے گیت گا کر منافقت کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں؟

ج: فرحانہ اپنے پسندیدہ مضمون میں ایم اے کرنے کا ۔۔۔ آپ کا فیصلہ بالکل صحیح ہے‘ تفصیلی تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ‘ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

عاشفہ...... ای میل (دوحا قطر)

اس بار سرورق بہت اچھا اور موسم کی مناسبت سے تھا۔ رخ چودھری کو خوش آمدید۔ شکر ہے کہ آپ کی بھی کوئی تحریر نظر آئی۔ سب سے بڑھ کر آسیہ جی کا ”جی یہی بات ہے“ لگی‘ آسیہ جی بہت وضع دار خاتون لگتی ہیں
رفعت سراج اب کیوں نہیں لکھتیں؟ باقی سلسلے وار ناول تو کیا کہنے۔ جہانگیر ہمدانی کو تو الٹا لٹکا کر چھترول ہونی چاہیے۔
رخسانہ جی بہترین لکھتی ہیں۔ افسانے پڑھ کر یوں لگا جیسے یہ سب ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔ خالد انجم کا انٹرویو بہت اچھا لگا اور اوور آل پورا شمارہ ہی اے ون تھا۔ میری طرف سے آپ سب کو رمضان المبارک کی بہت بہت مبارک باد۔

ج: عاشفہ آپ نے ہمیں یاد کیا‘ بہت خوشی ہوئی خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سنعیہ عندلیب...... گاؤں درگاہی والا

خواتین ڈائجسٹ اس وقت سے پڑھ رہی ہوں۔ جب میں تھرڈ اسٹینڈرڈ میں پڑھتی تھی‘ اب میں B.A کر رہی ہوں۔ اور ٹیچنگ بھی کرتی ہوں۔
”محبت خواب سفر“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس میں تنزیل اور عائشہ کا کردار مجھے بہت پسند ہے تانیہ کے ساتھ میڈم یاقوت نے بہت برا کیا۔ میڈم یاقوت کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا‘ اس میں تانیہ کا کیا قصور۔ خیر مکمل ناول‘ ناولٹ اور افسانے بھی سب اچھے تھے۔
میں جب فرسٹ ایئر میں تھی تو میں نے شعاع یا خواتین میں ایک مکمل ناول پڑھا تھا۔ ناول کا نام ”مرگ برگ“ تھا مجھے یہ پتا کرنا ہے کہ وہ کہانی کس رسالے میں تھی

ج: سنعیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ‘ مرگ برگ ”تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول تھا یہ ستمبر 2006ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

ارم طیفور...... گوجرانوالہ

خواتین ڈائجسٹ اسکول کے زمانے سے ہمارے گھر کی زینت ہے اور آج دو بچوں کی ان گنت مصروفیات کے باوجود اس ڈائجسٹ سے کنی نہیں کترا سکتی۔ آپ کے ڈائجسٹ کے تمام سلسلے بہترین ہیں۔ صرف گزارش یہ ہے کہ اپنے ڈائجسٹ کے صفحات میں اضافہ کیجیے۔ ایک اور بات اگر میں اپنا لکھا کچھ بھیجوں تو کیا آپ توجہ دیں گی؟

ج: پیاری ارم! آپ کا پہلا خط ہمیں موصول نہیں ہوا ورنہ جواب ضرور دیتے۔ آپ طویل عرصہ سے باقاعدگی سے خواتین پڑھ رہی ہیں یہ جان کر خوشی ہوئی۔
خواتین ڈائجسٹ کے لیے ضرور لکھیں‘ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھی تحریروں کے لیے ہمارے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔

رفعت نوشین...... بھاولپور

”خواتین ڈائجسٹ‘ میرے لیے راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ میں نے اس ڈائجسٹ سے صبر‘ حوصلہ‘ شعور اور رشتوں کی پہچان سیکھی ہے۔“ محبت خواب سفر“ بہت خوب صورت ناول ہے۔
ڈاکٹر یونس بٹ کا انٹرویو بہت اچھا لگا‘ ”من و تو“ بھی

بہت اچھا تھا۔ "مجھے رنگ دے" میں لوگوں کے رویّوں اور ان کے ظاہر و باطن کے بارے میں سب کچھ اتنے خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا کہ دل خوش ہو گیا۔ سب سے اچھا مجھے "کرن کرن روشنی" لگتا ہے اور سب سے پہلے اس کو پڑھتی ہوں پھر "محبت خواب سفر" پڑھتی ہوں۔

ج رفعت نوشین! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ نے بہت بار خط لکھا لیکن ہمیں نہیں بھجوایا۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ کی رائے ہمارے لیے کتنی قیمتی ہے۔ شائع ہوں یا نہ ہوں ہم تمام خط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

رابعہ..... ای میل (ساہیوال)

ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ رخسانہ نگار جی کا "محبت خواب سفر" بھی زبردست جا رہا ہے اب اس کا اختتام ہو جانا چاہیے۔ "ٹھنڈی چائے" سدرہ سحر کا ایک سبق آموز افسانہ تھا۔ رخ چودھری کی اتنے عرصے بعد انٹری بہت اچھی لگی، جس کہانی کے لیے میں آج آپ کو میل کر رہی ہوں وہ ہے سعدیہ حمید چودھری کا "من وتو" اس قدر زبردست لکھا انہوں نے کہ بس۔ زینب کے کردار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ باقی کا پرچہ ابھی میں نے پڑھا نہیں ہے۔

ج رابعہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شعونہ شیخ..... نواب شاہ

نبیلہ ابرراجہ نے بہت اچھا لکھا۔ "محبت خواب سفر" بہت اچھا چل رہا ہے۔ لیکن بہت طویل ہو گیا ہے اب اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ یقیناً "تنزیل ہی لائبہ کا بھائی ہو گا؟ آسیہ جی نے بھی اچھا لکھا۔ رخ چوہدری نے بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ سعدیہ جی نے اچھا لکھا۔ محبت کی کہانی پھر محبت میں قربانی۔ آپ سے گزارش ہے پلیز عید سے پہلے مہندی کے نئے ڈیزائن شائع کریں۔ عید سے پہلے اور فرحت اشتیاق اور عمیرہ احمد سے لکھوائیں۔

ج پیاری شعونہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید مہندی کے ڈیزائن ان شاء اللہ ستمبر کے شمارے میں شامل ہوں گے۔ تھوڑا انتظار کر لیں، خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اسماء لیاقت علی..... کھوٹہ

آج تک خواتین کی محفل میں شرکت صرف اس لیے نہیں کی کیونکہ مجھے بہنوں کی محفل سے ہر بات کا جواب مل جاتا ہے۔ مگر ایک بات میں نے محسوس کی ہے جب بھی گھریلو حالات پر کوئی کہانی ہوتی ہے۔ قاری بہنیں کہتی ہیں وہی گھسا پٹا موضوع میں صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا ہم ان مسائل سے نکل چکے ہیں کیا یہ ہمارے گزرے ہوئے وقتوں کی کہانیاں ہیں نہیں بالکل بھی نہیں۔ چاہے کوئی امیر ہو یا غریب ہر کوئی گھریلو سیاست کا شکار ہے جب تک ان مسائل کو اجاگر کر کے ختم نہیں کیا جاتا، ہمارا معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔

اب آتی ہوں اس ماہ کے شمارے کی طرف سارا پرچہ ہی بیسٹ تھا۔ "پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں" سے ایمان فرذ ہونے کے بعد "محبت خواب سفر" کی طرف بڑھے۔ ارے یہ کیا، ادھر شروع کیا۔ ادھر ختم پلیز رخسانہ جی اب اس کا اینڈ کر دیں۔ نبیلہ ابرراجہ کا "مجھے رنگ دے" مجھے بہت پسند آیا ڈاکٹر آفتاب جیسے لوگ ہمارے معاشرے کا ناسور بن چکے ہیں۔ مسیحا کی آڑ میں یہ لوگ ڈاکو ہیں۔ "ٹھنڈی چائے" پڑھ کر ایسا لگا کہ سدرہ نے میری کہانی لکھ دی ہے۔ باقی تمام سلسلے ہی اچھے ہیں عدنان بھائی کے نفسیاتی مشورے اکثر بہت کام آتے ہیں۔

ج پیاری اسماء! ہم آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہیں۔ ایک گھر میں جہاں مختلف مزاج کے لوگ ساتھ رہتے ہیں، وہاں ہر قسم کی اچھی بری باتیں ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی فطرت مزاج اور عادتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایسے میں اگر تحمل، برداشت اور سمجھ داری سے کام نہ لیا جائے تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں علیحدہ گھر بنانا اور اس کے اخراجات سے نمٹنا آسان نہیں ہے، جبکہ ہمارے ملک میں آبادی کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہا ہے، جن کے لیے دو وقت کی روٹی بھی مسئلہ ہے۔ اس لیے مل جل کر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔ ضروری ہے کہ چھوٹی موٹی باتوں کو نظر انداز کیا جائے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہے گا۔

ارم رحمان..... سرگودھا

سب سے پہلے کرن کرن روشنی سے سرشار ہونے کے بعد افسانے پڑھے عطیہ عمر نے ایک کہانی بڑی پرانی کو بہت طریقے سے بیان کیا باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ ثمینہ عظمت کے افسانے کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گی کہ پڑھ کر عجیب سا رنج ہوا اور یہی الفاظ منہ سے ادا ہوئے کہ "کیا کیا جائے"

ناولٹ بھی ہلکے پھلکے سے انداز میں اچھے لگے۔ "من وتو" میں زینب نے ایک بہت اچھا فیصلہ کیا' شاید یہ بھی محبت جتانے کا ایک طریقہ تھا کہ اپنی بیٹی اپنے محبوب کے حوالے کردی۔

ناول دونوں ہی دل کو بھلے لگے۔ جو اسٹوری دل کو لگی۔ وہ آسیہ رزاقی کی جی کیلئے یہی بات ہے' عاشی کا کردار بہت اچھا لگا۔ واقعی اگر اللہ پر ہر چیز چھوڑ دی جائے تو وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

ج ارم! اپنی پوری کوشش اور محنت کے بعد انجام اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہی زندگی کی حقیقت ہے کیونکہ اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ لیکن کوشش اور محنت ضرور کرنا چاہیے' آسیہ رزاقی اور دیگر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شمیم صدر دین رحمانی..... صفدر آباد

جولائی کا ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ ٹائیٹل بھی خوب صورت تھا۔ مجھے رنگ دے' ٹھنڈی چائے' من وتو' "محبت خواب سفر" چراغ آخر شب" اچھی لگیں۔

ج پیاری شمیم! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

کرن ناصر..... ای میل (گوجرانوالہ)

میں میٹرک کی طالبہ تھی جب خواتین اور شعاع پڑھنا شروع کیا اور اب ماشاء اللہ ایک بیٹے کی اماں ہوں۔ اس بار سرورق کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ "کرن کرن روشنی" کا سلسلہ تو ہوتا ہی بہترین ہے "محبت خواب سفر" بہت اچھے انداز میں آخری مراحل سے گزر رہا ہے۔ "چراغ آخر شب" میں رفعت ناہید نے تعلیمی اداروں کے ماحول کی جس طرح عکاسی کی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ آج کل یہ تعلیمی ادارے کم اور سیاست کے میدان زیادہ ہیں۔ آسیہ رزاق کا "جی یہی بات ہے" پسند آیا نبیلہ ابر راجہ کا "مجھے رنگ دے" پرانی طرز کی تحریر تھی۔ البتہ سعدیٰ حمید نے "من وتو" لکھ کر محبت کے پاکیزہ جذبوں کی جس انداز میں عکاسی کی وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ رخ چودھری کی "شریکاں نوں اگ" ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ بہت اچھی لگی ایک کہانی میں عطیہ عمر کا انداز پسند آیا سلمیٰ یاسمین کا ہمارے حکمرانوں پہ طنزیہ تبصرہ بہت خوب رہا۔ سدرہ سحر نے ٹھنڈی چائے میں جس طرح زندگی میں محبت اور اظہار خیال کو ترجیح دی ہے' وہ واقعی بے مثال ہے۔ ثمینہ عظمت کا "کیا کیا جائے" ایک تلخ حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ کنیز نبوی آج کل نظر نہیں آرہیں۔ عمیرہ احمد سے بھی ریکویسٹ ہے کہ وہ ہمارے لیے کچھ لکھیں۔ باقی تمام شمارہ بھی زبردست تھا۔

ج کرن! یاد آوری کا شکریہ۔ کنیز نبوی شادی کے بعد نئی زندگی کی خوشیوں میں مگن ہو کر اپنے قارئین کو بھول گئی ہیں۔ ہم آپ کی فرمائش ان تک پہنچا رہے ہیں۔ تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ اب باقاعدگی سے اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔

نیلم ناز..... سکھر (سندھ)

چمکتے دمکتے سرورق نے دل کو من وعن پھولوں سے بھر دیا۔ ٹائٹل گرل بے پناہ خوب صورت لگی معصوم اور بھولی بھالی سی۔

سعدیٰ حمید جی پچھلے سال اگست میں شامل شعاع تھیں پورے ایک سال بعد شرکت! کیا ہم جیسوں کے ساتھ انصاف ہے۔

نبیلہ جی بھی بڑے عرصے بعد زینت بنی ہیں خواتین کی' یار! اتنے غیر کیوں ہو گئے ہو آپ دونوں ہمارے لیے۔ آپ تو وہ ستارے ہو جن سے ہماری زندگی کے دیے میں روشنی کی لو ہے پر اتنے زبردست ولاجواب ناولٹ اور ناول لکھے۔ بے حد شکریہ۔

"شریکاں نوں اگ لگ گئی" قہقہوں کی بوچھاڑ' ان گرم

دنوں میں ٹھنڈی ہوا کی طرح ہمارے دل پہ نقش کر گئی۔ ثمینہ جی نے پتہ نہیں کس موضوع کو اجاگر کیا سمجھ نہ آ سکی۔ "ٹھنڈی چائے" عنوان زبردست تھا مگر تحریر کچھ پھیکی سوکھی لگی۔

خاتون کی ڈائری میں نمرہ' اقراء کی شاعری زبردست تھی۔ تمام انٹرویوز بھی لاجواب تھے۔ رابعہ انجم میری دوست مجھ سے بہت ناراض ہے وجہ معمولی غلط فہمی ہے 'وہ میرے سامنے ہوتی ہے تو میں اسے منا نہیں پاتی۔

ج: نیلم! قیمتی موتیوں کی لڑی جتنی بار ٹوٹے موتی چن لیے جاتے ہیں اچھے دوست روٹھ جائیں تو کسی دوسرے کی مدد لینے کے بجائے آپ خود جا کر اس کی غلط فہمی دور کر دیں بہت چھوٹا سا کام ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔

صائمہ شریف ...... دھلے گوجرانوالہ

ماہ جولائی کا ٹائٹل اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ ماڈل کی ساڑھی کے کلرز بالکل بھی اچھے نہیں تھے اور نہ ہی جیولری اچھی تھی۔ جب میں 9th کلاس میں تھی تب سے خواتین و شعاع اور ہمارا ساتھ ہے۔ اب تو میں نے سیکنڈ ایئر کے پیپرز دیے ہوئے ہیں۔ مطلب پچھلے چار سالوں سے خواتین و شعاع پڑھ رہی ہوں۔

پہلے "محبت خواب سفر" پڑھا۔ بہت ہی زبردست ناول ہے۔ اس ناول کی پہلی قسط پڑھ کر میں جس طرح بے چین ہوئی تھی۔ آج بھی ہر قسط پڑھ کے ایسا ہی ہوتا ہے۔

"چراغ آخر شب" اس ناول کی پہلی قسط پڑھی تو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہ ناول اور اس کی رائٹر یعنی آنٹی رفعت ناہید سجاد اپنے اندر بہت گہرائی رکھتی ہیں۔ بہت زبردست ناول ہے۔ آپی آسیہ رزاقی کا مکمل ناول بھی بہت زبردست تھا۔ علی جیسے لوگ بعد میں پچھتاتے ہی ہیں "مجھے رنگ دے" نبیلہ ابر راجہ نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ڈاکٹر ... جیسے لوگوں کو تو سرعام سولی پہ لٹکا دینا چاہیے۔ "من و تو" سعدیٰ حمید کی بہت اچھی کاوش تھی اس ناول کو پڑھنے کے بعد میں کئی دن افسردہ رہی تھی۔

رخ چوہدری کا "شریکاں نوں" پڑھ کے موڈ خوشگوار ہو گیا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے مگر "کیا کیا جائے" ـــ ثمینہ آنٹی! مجھے اینڈ ـــ سمجھ نہیں آئی' جب صباحت طاہر کا بازو پکڑ کر کہتی ہے بھائی ..... جان ..... بھابھی' ڈاکٹر یونس بٹ سے ملاقات کر کے اچھا لگا۔

اوہ ہاں آپی سائرہ غلام نبی کو اپنی بک "مخاطب کی رونمائی کے لیے بہت بہت مبارک ہو۔ مسرت جبیں کے احساسات پڑھ کر خوشی ہوئی مگر حمیرا اطہر' جی ہاں یہ تو کرنیں صفحے کی ایڈیٹر ہیں' میں ان کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میں کرنیں صفحے میں کہانیاں اور لطائف اور پینٹنگز بھجواتی رہتی ہوں۔ واقعی بے باک اور حق گوئی کی مالک ہیں اور یہ خوبی صرف چند لوگوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ پتہ نہیں میں کہانیاں لکھ سکتی ہوں یا نہیں مگر میری دوستیں کہتی ہیں کہ میں لکھ سکتی ہوں۔

پیاری صائمہ! کہانیاں ضرور لکھیں' اس کے لیے عمر کی قید نہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حمیرا افتخار ..... ای میل (جہلم)

اس ماہ کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ "کرن کرن روشنی" ہمیشہ کی طرح اپنے اندر ہدایت کا چراغ لیے ہوئے تھا۔ پلیز اس میں حق مہر کی ادائیگی کے حوالے سے بھی تفصیل شائع کریں۔ رخسانہ نگار کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں "محبت خواب سفر" ایک بہترین تخلیق ہے اس ناول کے تمام ہی کردار دلچسپی سے خالی نہیں۔ رفعت ناہید سجاد بھی اچھا لکھتی ہیں۔ اور کہانی تو ہے ہی دلچسپ۔ آسیہ رزاقی کا ناول پڑھ کر اس بار میں نے بھی بہت سی نصیحتیں اپنی گرہ میں باندھ لیں۔ نبیلہ ابر راجہ نے پرانے موضوع کو نئے طریقے سے لکھا۔ افسانہ کیا کیا جائے کے آخر میں میرا قہقہہ بے ساختہ تھا اور سلمیٰ یاسمین نے تو دل باغ باغ کر دیا۔ اس بار پرچے کی بہترین تحریر سعدیٰ حمید چودھری کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح خوب صورت جذبوں کی عکاسی نئے انداز میں کی۔ شائستہ' طارق اور صبا اپنے اسکیچز کے لیے قابل تحسین ہیں۔ یونس بٹ سے ملاقات اچھی لگی۔ عفت سحر پاشا سے کہئے کہ ازمیرٹ بہت یاد آ رہا ہے۔ کنیز نبوی کی جدائی بھی اب محال ہوتی جا رہی ہے اور نمرہ جی کے جوادی اور شبلی سے تو یقیناً "ناولٹ نمبر" میں ملاقات ہو ہی جائے گی اور ہاں آپی! ذرا یہ تو بتا دیں کہ مریم عزیز کا تعلق کس شہر سے ہے؟

ج: ہماری میرا! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ حق مہر کی ادائیگی کے بارے میں ہم احادیث جلد شائع کریں گے۔ مہم عزیز کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔

ورده منیر بٹ..... ڈسکہ

خواتین کا جولائی کا شمارہ نئے رنگوں سے سجا سجایا ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ نئی ماڈل کے ساتھ کتنے سال بعد خواتین کی تمام کہانیاں زبردست آئی ہیں۔ آسیہ رزاقی کا جی یہی بات ہے" سعدیٰ حمید چودھری' رخ چودھری کے ناولٹ اور سب سے اچھا "مجھے رنگ دے نبیلہ ابر راجہ کا۔ فینٹاسٹک سارے کا سارا شمارہ زبردست تھا۔ انٹرویو خالد انعم اور یونس بٹ صاحب کا مزے لے لے کر پڑھا۔

ورده جی! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔

مہرگل..... کراچی

تعطیلات گرما کے علاوہ ہم صبح دوپہر دو اسکول میں پڑھاتے ہیں پھر کوچنگ پڑھا کر سات بجے فارغ ہوتے ہیں اور آٹھ بجے لینگوئج کی کلاس لینے جاتے ہیں جہاں سے دس بجے رات کو واپسی ہوتی ہے' جون جولائی میں بھی ہم ٹیوشن پڑھانے' سلائی سینٹر اور لینگوئج سینٹر جارہے ہیں۔ پوسٹ آفس ہمارے گھر سے ڈھائی اسٹاپ کی دوری پر ہے اور وہاں تک کوئی گاڑی ہمارے اسٹاپ سے نہیں جاتی۔ تبصرہ اور اپنی تحریریں لے کر اتنی دور پوسٹ آفس پیدل جاتے ہیں اور اس کے بعد بھی آپ ہماری کوئی تحریر حتیٰ کہ تبصرہ بھی نہیں شائع کرتیں۔

اک طرز تغافل ہے سو وہ تجھ کو مبارک
ایک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

حضور کے فرمان سے مستفید ہوتے ہوئے آگے دوڑے۔ رخسانہ صاحبہ جون 2009ء میں عائشہ تنزیل سے کہتی ہے کہ پرسوں میگا شو ہے اور وہ پرسوں آپ نے جولائی 2010ء میں کیا ہے۔ خدارا رحم کھائیں "چراغ آخر شب" اچھی چل رہی ہے "آسیہ رزاقی" نے دوہرے لوگوں کے منہ سے نقاب کھینچ کر دو محبت کرنے والوں کو ملا دیا۔ "مجھے رنگ دے" نبیلہ ابر راجہ نے پلاٹ تو اچھا لکھا مگر کہانی میں بہت جھول تھا۔ خالد انعم کا انٹرویو پڑھتے ہوئے ہم آٹھ سال پیچھے پہنچ گئے جب وہ افشاں احمد کے ساتھ بچوں کا پروگرام کرتے تھے' رخ چودھری نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

ج: مہرا آپ یقین کریں اس سے پہلے ہمیں آپ کا کوئی خط نہیں ملا ورنہ ضرور شائع کرتے۔ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر آپ نے خط لکھا بہت شکریہ آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ اب ہمیں باقاعدگی سے خط لکھیے گا۔

گل..... کراچی

اس بار خواتین نہایت خوب صورت و دلکش تھا۔ جس میں مجھے نبیلہ ابر راجہ کا مکمل "مجھے رنگ دے" بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ تمام مستقل سلسلے اچھے لگے اور میرے خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ فرحت اشتیاق ایک سال سے کہاں غائب ہیں۔ ایک سال سے میں ان کے ناول کا انتظار کر رہی ہوں۔

ج: گل! فرحت تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ ویسے فرحت نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ خواتین ڈائجسٹ کے لیے ناول لکھ رہی ہیں۔

سمیرا بانو ندیم..... اسلام آباد

رسالہ ماشاء اللہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ ایسے ہی ترقی کرتا رہے۔

ج: سمیرا پہلی بار خط لکھا اور وہ بھی اتنا مختصر۔ خواتین ڈائجسٹ پسند ہے اس کے لیے شکریہ۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔



خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

راحت اصغر ______ مظفر آباد

اک خواب ہے اس خواب کو کھونا بھی نہیں ہے
تعبیر کے دھاگوں میں پرونا بھی نہیں ہے
لپٹا ہوا ہے دل سے کسی راز کی طرح
وہ شخص جس کو میرا ہونا بھی نہیں ہے

شمیم صدسوین رحمانی ______ صفدر آباد

میں دھڑکتا ہوں تیرے سینے میں دل کی صورت
اے مرے دشمنِ جاں اور دعا دے مجھ کو
اُف شبِ غم کا وہ ٹھہرا ہوا لمحہ محسن
جب مرے وہم کی آہٹ بھی جگا دے مجھ کو

ملائکہ کوثر ______ بسم اللہ پور

وہ پیڑ جن پہ پرندوں کے گھر نہیں ہوتے
دراز جتنے بھی ہوں معتبر نہیں ہوتے
میرے قبیلے کی پہچان ہے فقط اتنی
کہ ان کے ذہنوں میں نفرت کے گھر نہیں ہوتے

درخشاں بی ______ چوٹالہ

میرے ہاتھ میں قلم ہے میرے ذہن میں اُجالا
مجھے کیا ڈرا سکے گا یہ ظلمتوں کا پالا
مجھے فکرِ امنِ عالم، تجھے اپنے آپ کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

ربیعہ شاہین ______ جھارانوالہ

کوئی موسم ہو دل میں ہے تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا نہیں جاناں تمہارے بعد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

فوزیہ کاشف ______ فیصل آباد

جو ہو سکے تو بھلا دینا رنجشیں دل کی
محبتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا
آپ کے طرزِ تغافل سے بھی کیا گلہ
ہمیں ہی آتا نہ تھا دلوں میں گھر کرنا

فوزیہ ______ کسووال

جب لوگ ہی جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دُکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دل چیرتا ہے کیسے لہجے کا روکھا پن
کرتی ہے زباں وہ کچھ جو تیر نہیں کرتے

آمنہ ______ کسووال

لوگ کیوں بس کے اُجڑ جاتے ہیں کبھی سوچا ہے
کس لیے جاں سے گزر جاتے ہیں کبھی سوچا ہے
جو نظر آتے ہیں آئینہ سی پوشاکوں میں
وہ بھی مٹی میں اُتر جاتے ہیں، کبھی سوچا ہے؟

صبا سلیم ______ ٹنڈو جان محمد

زمیں کا سانس رُکا ہے ترے اشارے پر
کبھی تو دیکھ ادھر اک نظر اُٹھا کر بھی
بگولے رقص کو اُٹھے، ہوا نے تالی دی
سکوں مل نہ سکا بستیوں سے جا کر بھی

مریم بلانا ______ ٹنڈو جان محمد

میرے شہرِ پریشاں، میں تری بے چاند راتوں میں
بہت ہی یاد کرتا ہوں تری بنیاد کا موسم
پرندوں کی زباں بدلی، کہیں سے ڈھونڈ لے تو بھی
نئی طرزِ فغاں اے دل کہ ہے ایجاد کا موسم

صبا سلیم ______ ٹنڈو جان محمد

میں تو ہلکان ہو گیا ناصر
مدتِ ہجر کتنی پھیل گئی

دنیا کا کوئی بھی انسان جذبات واحساسات سے خالی نہیں۔ نرم ونازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول فقط رنگ رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اظہار کے بنا جذبے اکثر بے مول رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا پیرایہ چاہے کوئی ہو، اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوبصورت ذریعہ۔ اکثر طویل گفتگو بھی آپ کے احساس کو اسطرح واضح نہیں کر پاتی جو شخص ایک شعر کر دیتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ "ارے یہی تو میرے دل میں تھا۔"

زندگی کی طویل دھوپ چھاؤں میں بہت سی یادیں، بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بن کر، کبھی لب پر پھول کھلائے۔ اپنی ان یادوں میں ہمیں بھی شریک کیجئے مگر صرف منظوم پیرائے میں۔ یہ کوئی شعر بھی ہوسکتا ہے، نظم بھی اور غزل بھی۔ اس ماہ سے ہم آپ کے لیے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں **"روشن حرف وہ سارے"**۔

سوالات یہ ہیں۔

(1) وہ شعر جو اکثر جو آپ کے لبوں پہ رہتا ہے؟

(2) وہ شعر، نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟

(3) کسی نے آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟

(4) وہ غزل جو آپ نے ٹی وی یا ریڈیو پر سنی تو گائیکی کی بنا پر آپ کو اچھی لگی؟

(5) کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

روشن حرف وہ سارے

قرۃ العین حنیف

1۔ شعر تو بے شمار ہیں جو مواقع اور حالات کی مناسبت سے لبوں پر آتے رہتے ہیں اور اپنی کہانی آپ سنا دیتے ہیں۔ اب اس شعر کی ہی مثال لے لیں۔ جب بھی اگر کوئی غلطی سے تعریف کر دے تو بے ساختہ ہی یہ شعر نوک زباں پہ آجاتا ہے۔

قسمت سے ہی لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا

شعر سننے کے فوراً بعد سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں۔ "بس رہنے دو۔"

2۔ یوں تو بہت سے شاعروں کو پڑھا ہے۔ لیکن جو بات امجد اسلام امجد کی شاعری میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ یہ نظم میں نے سب سے پہلے پڑھی تھی اور ثمرین کی بہن کی ڈائری میں سے پڑھی تھی اور یہی غزل امجد اسلام امجد سے تعارف کی بنیاد ہے ان کی کئی نظموں کی طرح اس میں بھی محبت کی ہی داستاں ہے۔ تھوڑی طویل پر بہت خوب صورت ہے۔

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے
کہ یہ جتنی پرانی، جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اسے تائید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے
یقین کی آخری حد تک
دلوں میں لہلہاتی ہو
نگاہوں سے ٹپکتی ہو
لہو میں جگمگاتی ہو
ہزاروں طرح کے دلکش حسین ہالے بناتی ہو
اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے
محبت مانگتی ہے یوں گواہی اپنے ہونے کی
کہ جیسے طفل سادہ شب میں کوئی بیج بوئے
اور شب میں بارہا اٹھے
زمین کو کھود کر دیکھے
کہ پودا اب کہاں تک ہے

محبت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خُو ہے
کہ جو اقرار کے لفظوں کو سننے نہیں تھکتی
بچھڑنے کی گھڑی یا ملنے کی کوئی ساعت ہو
اسے بس ایک ہی دھن ہے
کہو مجھ سے محبت ہے۔"
کہو مجھ سے محبت ہے۔"

کچھ ایسی بے سکونی ہے وفا کی سرزمینوں میں
کہ جو اہل محبت کو صدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے شام کا تارا
محبت کرنے والوں کی سحر راتوں میں رہتی ہے
گماں کے شاخچوں پہ آشیاں بنتا ہے الفت کا
یہ عین وصل میں بھی ہجر کے خدشوں میں رہتی ہے
محبت کے مسافر زندگی جب کاٹ چکتے ہیں
تھکن کی کرچیاں چنتے
وفا کی اجرکیں پہنے
سمے کی راہ گزر کی آخری سرحد پر رکتے ہیں
تو کوئی ڈوبتی سانسوں کی ڈوری تھام کر
دھیرے سے کہتا ہے 'یہ سچ ہے نا؟
ہماری زندگی ایک دوسرے کے نام لکھی تھی
دھندلکا سا جو آنکھوں کے قریب و دور پھیلا ہے
اسی کا نام چاہت ہے
تمہیں مجھ سے محبت تھی
تمہیں مجھ سے محبت ہے
محبت کی طبیعت میں عجیب اک بچپنا سا قدرت نے
رکھا ہے۔

3۔ یہ ہماری قسمت کہاں کہ ہمیں دیکھ کر کوئی شعر پڑھے۔ نہ بھولی صورت' نہ چاند چہرہ' نہ ستارہ آنکھیں۔ ویسے ہمارے آس پاس بسنے والے کافی بدذوق واقع ہوئے ہیں۔ تعریفی جملہ بول دیں بڑی بات ہے۔ دیکھ کر تو نہیں البتہ فائزہ مخاطب کرنے کے لیے یہ شعر اکثر پڑھتی ہے۔

اک بات کہوں گر سنتی ہو
تم مجھ کو اچھی لگتی ہو

4۔ F.M-101 کا گیت غزل ٹائم ہم سب فرینڈز کا فیورٹ ہے۔ ہم سب سہیلیاں ضرور سنتی ہیں۔ زیادہ تر غزلیں ریڈیو پر ہی سنی ہیں کیونکہ میرے پاس غزل کا کلیکشن نہیں ہے۔ یہ غزل جو کہ "نصرت فتح علی خان" نے گائی ہے اور بہترین گائی ہے۔ شاعر کا نام پتا نہیں لیکن مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ جس کو بھی شاعر کا نام پتہ ہو پلیز ضرور بتایئے۔

تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آ کر تو دیکھو

تڑپنے پہ میرے نہ پھر تم ہنسو گے
کبھی دل کسی سے لگا کر تو دیکھو

وفاؤں کی ہم سے توقع نہیں ہے
مگر ایک بار آزما کر تو دیکھو

زمانے کو اپنا بنا کر تو دیکھا
ہمیں بھی تم اپنا بنا کر تو دیکھو

ستاتے ہو دن رات جس طرح مجھ کو
کسی غیر کو یوں ستا کر تو دیکھو

5۔ کلاسیکل شاعری میں میرا انتخاب منیر نیازی کی یہ خوب صورت غزل ہے یقیناً" آپ سب کو بھی ضرور پسند آئے گی۔

اپنی ہی تیغ ادا سے آپ گھائل ہو گیا
چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہو گیا

وہ ہوا تھی شام ہی سے رستے خالی ہو گئے
وہ گھٹا برسی کہ سارا شہر جل تھل ہو گیا

میں اکیلا اور سفر کی شام رنگوں میں ڈھلی
پھر یہ منظر میری نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا

اب کہاں ہو گا وہ اور ہو گا بھی تو ویسا کہاں
سوچ کر یہ بات جی کچھ اور بوجھل ہو گیا

حسن کی دہشت عجب تھی وصل کی شب میں منیر
ہاتھ جیسے انتہائے شوق سے شل ہو گیا

خبریں و گپیں

غزل قمر

دس منٹ

تیری زلفوں سے رہائی تو نہیں مانگی تھی
قید مانگی تھی جدائی تو نہیں مانگی تھی

ماضی کے مشہور فلمی نغمہ نگار اور اس گیت کے خالق حسرت جے پوری نے عملی زندگی کا آغاز بس کنڈکٹری سے کیا تھا۔ وہ اوپیرا ہاؤس کے فٹ پاتھ پر کھلونے بھی بیچا کرتے تھے' یہ گانا بھی فٹ پاتھ پر کھلونے بیچتے ہوئے تخلیق ہوا تھا۔

یہ میرا پریم پتر پڑھ کر تم ناراض نہ ہونا
یہ گیت انہوں نے اپنی محبوبہ کے لیے لکھا تھا' جسے راج کپور نے فلم "سنگم" میں شامل کرلیا۔

فلم "میرا نام جوکر" کا گانا' جانے کہاں گئے وہ دن' دس منٹ میں لکھا گیا۔ اس گیت کی دُھن راج کپور نے حسرت کو سنائی تھی اور کہا کہ وہ اس دُھن پر گانا موزوں کردیں وہ



چلے گئے اور اسسٹنٹ سے کہہ گئے تھے' جب تک حسرت گانا مکمل نہ کریں انہیں جانے نہ دینا۔ حسرت نے دس منٹ میں یہ گیت مکمل کرلیا' جو آج برسوں گزر جانے پر بھی کانوں میں رس گھولتا ہے۔

افسوس

میرل "عروسہ" سے اپنی فنی زندگی کا آغاز کرنے والی مشی خان بے شمار ڈراموں میں کام کرچکی ہے۔ ایک خلیجی ایئرلائن امارات میں فضائی میزبان کے فرائض بھی انجام دیے۔ ایک عربی سے شادی کی اور پھر خاموشی سے طلاق بھی لے لی' آج کل ایک مقامی ٹی وی چینل پر میزبانی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ مشی خان کا کہنا ہے "جب میری سیریل "عروسہ" ہٹ ہوئی تو اس وقت پاکستان کی فلم انڈسٹری عروج پر تھی۔ مجھے بے شمار آفرز آئیں مگر میں نے انکار کردیا۔ مجھے آج بھی اس پر افسوس ہے۔ میرا یہ فیصلہ غلط تھا۔"

قابل تعریف

ریشم ان دنوں کافی برے حالات سے گزر رہی ہیں' ان



کے پاس ایک بھی فلم نہیں' پندرہ برس بعد جب وہ لوٹ کر دوبارہ ٹی وی پر آئیں تو شروع میں تو کافی کام تھا لیکن اب سناٹا ہے' بہرحال قابل تعریف بات یہ ہے کہ ریشم نے اپنی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا' اور اپنا لائف اسٹائل برقرار رکھا ہے۔ وہ اس عمر میں بھی فیشن شوز میں حصہ لے رہی ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ بھدی نظر آتی ہوں۔

میرا کا انکشاف

میرا نے ایک نیا انکشاف کیا ہے کہ شاہ رخ خان انہیں اپنی فلم میں کاسٹ کرنا چاہتا ہے' میرا کا کہنا ہے کہ انہوں نے شاہ رخ سے کہا کہ میں ایک فلم کے لیے دو کروڑ لوں گی اور تم لاہور آکر میڈیا کے سامنے مجھے سائن کرو گے' اب اس بات پر کسی کو یقین آئے نہ یا نہ آئے۔ میرا اس کی پروا نہیں کرتی خیر اس طرح کے مضحکہ خیز بیان پر اگر کسی کے لبوں پر مسکراہٹ آجائے تو یہ اس بیان کا اچھا پہلو ہے۔

منیشا کی شادی

منیشا کوئرالہ نے کئی منگنیاں کرنے اور توڑنے کے بعد کھٹمنڈو میں اپنے موجودہ بوائے فرینڈز 33 سالہ نیپالی بزنس مین سمرٹ سے بالآخر شادی کرلی ہے۔ نیپال کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی منیشا کا شوہر اس سے زیادہ امیر ہے۔

بری عورت

اداکارہ انجلینا جولی کا کہنا ہے کہ میں ایک بری عورت ہوں' مجھے اعتراف ہے کہ میں تمام منشیات استعمال کر





چکی ہوں۔ مجھے حشیش سب سے زیادہ واہیات اس لیے لگی کہ اس کے اثر سے انسان پاگلوں کی طرح بے مقصد کھی کھی کرتا رہتا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے ان سے نجات حاصل کرلی' مجھے لگتا ہے کہ میں بہت زیادہ دبلی ہوں لڑکیوں کو اس حد تک دبلا نہیں ہونا چاہیے' میں اپنے دبلے پن پر شرمندہ ہوں' انجلینا جولی کو کسی زمانے میں کالا جادو سیکھنے کا خبط بھی ہوا تھا لیکن اس نے جلد ہی توبہ کرلی۔

لوٹ کے بدھو

اداکار شاہد نے اپنے دور عروج میں اداکاری سے زیادہ شادیوں کے معاملے میں شہرت حاصل کی۔ وہ ایک زمین دار باپ کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے زمرد' عشرت چودھری اور بابرہ شریف سے شادیاں کیں' جبکہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھے۔ ان کی خاندانی بیوی منزہ تھی۔

شاہد کی ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔ بیٹی اداکارہ زمرد سے ہے جبکہ تین بیٹے منزہ سے ہیں۔ شاہد اب منزہ کے پاس لوٹ آئے ہیں اور اس کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں منزہ جیسی باوفا بیوی عطا کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ مجھ سے غلطیاں بھی ہوئیں مگر منزہ نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آج میں اپنے بچوں کے



ساتھ ایک مکمل گھریلو زندگی گزار رہا ہوں۔ میرا بڑا بیٹا پی ٹی وی سے منسلک ہے۔دوسرا بیٹا لندن میں ہے اور پی ایچ ڈی ہے' جبکہ چھوٹا بیٹا شوبز سے منسلک ہو گیا ہے اور اس نے اپنی ذاتی پروڈکشن شروع کی ہے۔ کارا فیسٹیول میں اس کا ڈرامہ نامزد بھی ہوا مگر اسے ایوارڈ نہ مل سکا۔

ادبی وراثت

مشہور ڈرامہ نگار اصغر ندیم سید کے تین بچے ہیں' بیٹا عدیل انجینئر ہے بیٹی ماہم ندیم نے کینئرڈ کالج سے ایم بی اے کیا ہے' جبکہ چھوٹی بیٹی فاطمہ ندیم نے میڈیکل کی میرٹ بننے کے باوجود انگریزی ادب اور سائیکالوجی کا انتخاب کیا ہے۔ اصغر ندیم سید کو امید ہے کہ ان کی یہ بیٹی ان کی ادبی وراثت کی امین ہو گی۔

اگر ایسا ہوا تو یقیناً" خوش آئند بات ہو گی کیونکہ عموماً" دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر اور انجینئر کا بیٹا انجینئر ہو سکتا ہے اور سیاست تو ہمارے ہاں موروثی ہی ہوتی ہے لیکن ادب اور شاعری میں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔

اصغر ندیم سید کا اپنی بیوی فرزانہ ندیم سید سے آئیڈیل تعلق تھا' ان کی کمی کو انہوں نے شدت سے محسوس کیا۔ تاہم ان کا کہنا ہے کہ ان کی دوسری بیوی بھی اردو ادب کی استاد اور ان کے جتنی ہی قابلیت کی حامل ہیں۔ شیبا عالم اس وقت کنیئرڈ کالج لاہور میں شعبہ اردو کی سربراہ ہیں۔

چیدہ چیدہ

☆ خود کو کرہ ارض کا لاشریک خداوند سمجھنے والے امریکہ کی دستاویزات وہ بھی 90 ہزار کی تعداد میں افشا ہو جائیں ۔ یہ بات ماننے والی نہیں۔ دستاویزات افشا کی گئی ہیں۔ امریکی عوام کو بتایا جا رہا ہے ہم تو جنگ جیت جاتے۔ لیکن کیا کریں پاکستان پورا تعاون ہی نہیں کر رہا' ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔

(عبداللہ طارق سہیل ایکسپریس نیوز)

☆ عامر خان کی عمر 45 برس ہے تھری ایڈیٹس میں کالج بوائے بننے کے لیے انہیں 22 کلو وزن کم کرنا پڑا۔ یہ معمولی بات نہیں لیکن انہوں نے کر دکھایا۔

(سپراسٹار ڈسٹ)

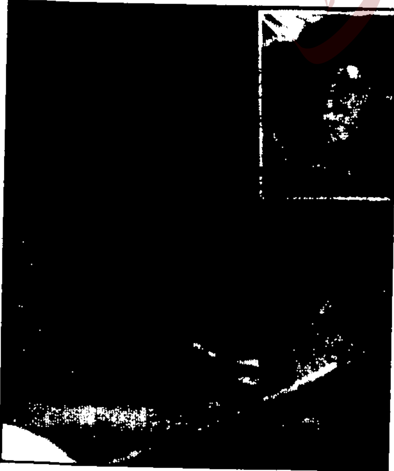
☆ جب امریکی فوج نے عراق پر حملہ کیا تھا تو وہ دس ارب ڈالر کیش کرنسی لے گئی تھی اس کا وزن 61 ٹن تھا۔ یہ کیش مقامی سیاسی لیڈروں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس دس ارب ڈالر کا کوئی حساب نہیں ہے۔

(امریکہ سے رپورٹ)

☆ میرا بھائی کہتا ہے تم جیسی بدتمیز اور نخریلی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔

(ملیکا شراوت)





خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ کے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں' سوالات یہ ہیں۔

کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند' غذائیت' گھر والوں کی صحت۔

گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کر سکیں۔

کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے' آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔

گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جارہا ہے' آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔

کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

کچن کی کوئی ٹپ' جو دینا چاہیں؟

ان سوالات کے جواب بھجوا کر آپ بھی اس سلسلہ میں شرکت کر سکتی ہیں' ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔ تصویر ضروری نہیں ہے۔

آپ کا باورچی خانہ

کرن شہزادی

1۔ ہمارے ابو جی کا کہنا ہے کہ "جو بھی کھاؤ غذائیت سے بھرپور ہو' ذائقے پہ مت جاؤ۔" اور امی جی کہتی ہیں "بھلا نمک مرچ تیز مسالے کے بغیر بھی کوئی بریانی کا مزا ہے۔"

ویسے بھی آج کل سب مزا دیکھتے ہیں غذائیت نہیں چونکہ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا میری ذمہ داری ہے آج کل تو میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ مزا اور غذائیت دونوں ساتھ ساتھ ہوں۔ صبح سب سے پہلے سب کے لیے لسی ضروری ہے اس کے بعد کوئی پراٹھا اور دہی لے رہا ہے تو کوئی چائے اور پراٹھا۔ راشد کی تو پوری کوشش ہوتی ہے لسی بھی نہ پینی پڑے صرف چائے وہ بھی تیز پتی والی۔

ہفتے میں ایک دن مچھلی تو دوسرے دن صرف سبزی (لیکن اس دن سب کا منہ دیکھنے والا ہوتا ہے) بہرحال بھابھی کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ جو بھی پکے غذائیت سے بھرپور ہو۔

2۔ ہم لوگ چونکہ کینٹ میں رہتے ہیں ہمارے ددھیال والے نزدیک ہی ہیں اس لیے کوئی دن بمشکل ہی مہمانوں کے بغیر گزرتا ہے۔ کچھ مہمان ایسے ہوتے ہیں کہ گھر میں جو بھی دال دلیہ ہو چل جاتا ہے مگر صرف چند ایک' زیادہ تر دال دلیے پر گزارہ نہیں کرپاتے اس لیے امی ہمیشہ کوئی نہ کوئی اسپیشل چیز ضرور رکھتی ہیں جو صرف مہمانوں کی آمد پر پتہ چلتا ہے کہ یہ گھر میں تھی (اگر پہلے پتہ چل جائے تو سب سے پہلے میرے پیٹ میں پہنچے) مہمانوں کی خیر ہے۔ ویسے میری بھابھی بہت سی ایسی چیزیں جھٹ پٹ تیار کرلیتی ہیں کہ کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ اکثر مہمانوں کی آمد پر جب کہ دال چاول کے علاوہ کچھ بھی موجود نہ ہو تو جلدی سے فریزر کھولیں' قیمہ تو ہوگا ہی ناں' جلدی سے نکالیں اور قیمہ کی

کھچڑی بنالیں اس کی ترکیب نوٹ کرلیں بے حد آسان ہے۔

قیمہ کی کھچڑی

آدھ سیر چاول بس اتنا ہی قیمہ ' مونگ کی دال اور باقی مسالے.... سب سے پہلے پیاز تل لیں بادامی ہونے پر نمک مرچ قیمہ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں پھر پانی ڈال دیں تاکہ تھوڑا گل جائے پھر دال ڈالیں اور اتنا پکنے دیں کہ دال گل جائے اس دوران سلاد وغیرہ بنالیں اب اس میں بڑی الائچی لونگ اور ہری مرچیں ڈال کر ساتھ ہی چاول ڈالیں دو چار بار چمچہ ہلائیں پھر اتنا پانی ڈالیں کہ چاول گل جائیں پانی خشک ہونے پر اس میں سیاہ زیرہ ڈال کر دم پر لگائیں ٹھیک دس منٹ بعد آپ کے مہمانوں کے لیے قیمہ کی کھچڑی تیار

3۔ پچھلے زمانہ میں لوگ لڑکی دیکھنے جاتے تو کچن کا ضرور جائزہ لیتے کہ کچن گھر کی عورت کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اب پہلے جیسی بات تو نہیں رہی لیکن میری امی جی بے حد نفاست پسند ہیں اسی لیے ہم لوگ بھی صفائی کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ کچن کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھنے کے لیے ہر کام کے ساتھ ساتھ صفائی بھی ہاتھ کے ہاتھ ہونا ضروری ہے میں صبح افراتفری میں ناشتہ بناتی اور دیتی ہوں لیکن ساتھ ہی صفائی بھی کرتی جاتی ہوں مثلاً ''لسی تیار کی ہے تو اسی وقت جگ گلاس دھو کر رکھ دیے۔ چائے بنی تو چینی پتی کا ڈبہ واپس کیبنٹ میں رکھ دیا تو نتیجتاً ''سب سے آخر میں جب ابو ناشتہ کرنے آتے ہیں تو کچن بالکل صاف ہوتا ہے لیکن صرف کچن.... باقی سارا گھر اوندھا پڑا ہوتا ہے (بھئی اس لیے کہ سب ماشاء اللہ سے اسکول' کالج' دفتر جاتے ہیں سوائے امی کے اور میرے کیونکہ میرے میٹرک کے پیپر ہوچکے ہیں (اسی لیے میں پھنسی ہوئی ہوں۔)

4۔ عام دنوں میں تو ہی سب سے پہلے لسی اس کے بعد جو جس کا جی چاہے کیونکہ سب کے مزاج مختلف ہیں اس لیے لوازمات بھی ہمارے گھر میں دکھرے ہی ہوتے ہیں ارم کو فل سائز چائے کا مگ ساتھ میں پراٹھا اچار' بھائی کا ناشتہ پراٹھا دہی اور سالن پر مشتمل ہوتا ہے ابو جی پراٹھا لیتے ہیں بھابھی کبھی صرف دودھ اور بریڈ کبھی جوس راشد اور مجھے تو سب کچھ ہی چاہیے ہوتا ہے۔ دہی ضروری ہے کہ بہت ساری چینی ڈال کر کھائی ہے پراٹھا بھی چاہیے اب یہ سوکھا نگلا نہیں جائے گا تو چائے بھی لازمی ہے اب یہ لیا کنٹراسٹ ہے چائے پراٹھا..... لہٰذا آملیٹ بھی ضروری ہے۔ یہ حال ہے۔ ہاں اتوار کو سب دس گیارہ بجے اٹھتے ہیں یہی دن ہوتا ہے جب سب گھر والے اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں۔ سو حلوہ پوری میں اور شبنم مل کر بناتی ہیں کبھی کبھار انڈے کے پراٹھے میں بناتی ہوں ہاں یاد آیا میرے ہاتھ کے بنے سات تہ والے پراٹھے ہمارے خاندان میں بڑے مشہور ہیں وہ تو سب کو ہی بنانے آتے ہیں اس لیے انڈے کے پراٹھے کی ترکیب یہ ہے۔

انڈے کا پراٹھا

دو انڈے لیں سفید آٹا تقریباً ''تین پراٹھوں کے حساب سے لیں ذرا سا نمک' دودھ ایک پاؤ گھی تھوڑا سا' آٹے میں گھی اور نمک ملا کر خوب ملیں۔ دودھ میں انڈے ڈال کر پھینٹیں پھر ان کے ساتھ آٹے کو گوندلیں پھر اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر پراٹھے بنالیں۔ بڑے مزے کے پراٹھے بنیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔

5۔ ہمارے ابو جی باہر کھانے کو سخت ناپسند کرتے ہیں اس لیے بہت کم باہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ کبھی کبھار لیکن اکثر آئس کریم کھانے کے لیے جاتے رہتے ہیں (میں اور شبنم تو تقریباً ''روز ہی جاتے ہیں)

6۔ ہاں جی یقیناً ''موسم کو ضرور مد نظر رکھنا چاہیے لیکن کبھی کبھی بہت گرمی میں آلو مٹر کھانا بھی اچھا لگتا ہے یا سخت سردیوں میں آئس کریم کیا کریں جی دل کا کوئی علاج نہیں اسے تو بہت کچھ اچھا لگتا ہے مگر.....

7۔ اچھا کھانا ہمیشہ شدید محنت سے بنتا ہے۔ محنت کے ساتھ ساتھ سلیقہ بھی ضروری ہے۔ اگر آپ خلوص دل سے 'نیک نیتی سے ہنسی خوشی دال بھی پکائیں گی تو لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔ (آزمودہ نسخہ) میں نے آج ہی پکائی ہے۔ ویسے تو آج کل بازار میں پیکٹ مسالے عام مل جاتے ہیں اور منٹوں میں ڈش تیار ہو جاتی ہے پر جو مزا سل بٹہ پر پسے مسالے میں ہے وہ پیکٹ مسالوں میں کہاں 'میری امی جی نمک اور گرم مسالا ہمیشہ گھر میں پیستی ہیں۔ پر مجھے اس وقت بڑا مزا آتا ہے جب پانچ منٹ میں رس ملائی بن جاتی ہے دس منٹ میں حلیم (ہے ناں) مزے کا مزا آرام کا آرام۔

8۔ ابھی تو ہم خود اس معاملے میں بڑے اناڑی ہیں ☆☆



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

رس ملائی

ضروری اجزا:

ملک پاؤڈر	ایک پیالی
انڈا	ایک عدد
بیکنگ پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
گھی	کھانے کا ایک چمچہ
سبز الائچی پسی ہوئی	چائے کا آدھا چمچہ
دودھ	ایک لیٹر
شکر	تین چوتھائی پیالی
ثابت سبز الائچی	۴ عدد
کیوڑہ	چائے کا ایک چمچہ
بادام اور پستے	ہوائیاں کاٹ لیں

ترکیب:

ملک پاؤڈر میں انڈا' بیکنگ پاؤڈر' گھی اور چائے کا نصف چمچہ سبز الائچی پاؤڈر ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں۔ بیضوی رس ملائی بنا کر ایک طرف رکھ دیں۔ دودھ ابال کر اس میں شکر ملا لیں اتنا پکائیں کہ شکر گھل جائے پھر اس میں ثابت سبز الائچیاں بھی ڈال دیں۔ جب دودھ کی مقدار پکنے کے بعد نصف رہ جائے تو تیار شدہ رس ملائیاں دودھ میں ڈال کر مزید 8 منٹ تک دودھ پکا لیں۔ خیال رہے آنچ دھیمی ہونی چاہیے۔ اس دوران پتیلی کو ایک دو بار کپڑے کی مدد سے ہلا لیں۔ تاکہ دودھ پیندے میں لگنے نہ پائے۔ جب رس ملائیوں کا سائز تقریباً" دوگنا ہو جائے تب پتیلی چولہے پر سے ہٹا کر اس میں کیوڑہ' بادام اور پستے کی ہوائیاں اور بقیہ نصف چمچہ الائچی پاؤڈر ڈال دیں۔ ٹھنڈا کھانے کے لیے پیش کریں۔

آلو اور دال کے پراٹھے

ضروری اجزا :

مونگ کی دال	آدھی پیالی
آلو	دو عدد
آٹا	دو پیالی
ہرا دھنیا	چند پتے
ہری مرچ (کتری ہوئی)	چائے کے دو چمچے
لیموں کا رس	حسب پسند
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	چائے کا آدھا چمچہ
چائنیز نمک	چائے کا آدھا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

آٹے میں تھوڑا نمک ڈال کر گوندھ لیں۔ آلو کو ابال کر چھیل کر میش کر لیں۔ دال کو ابال کر آلو کے ساتھ اچھی طرح ملا لیں۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ، لیموں کا رس، سیاہ مرچ پاؤڈر، چائنیز نمک کے ساتھ عام نمک بھی ملا دیں۔ جب اچھی طرح مکس ہو جائے تو آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر ایک پیڑے کے اوپر آلو اور دال کا آمیزہ رکھیں۔ دوسرے پیڑے کو اس کے اوپر رکھیں۔ اس کے بعد کنارے دبا کر روٹی کی طرح بیل لیں۔ توے پر تیل سے پراٹھے کی طرح سینک لیں۔ سحری کے لیے چٹنی اور رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

قیمے کے پراٹھے

ضروری اجزا :

میدہ	دو پیالی
قیمہ (ابلا ہوا)	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد (درمیانی)
لہسن کے جوے	چھ عدد
انار دانہ	چائے کا ایک چمچہ
دال چنا	ایک چھٹانک
پسی (سرخ مرچ)	حسب ذائقہ
ادرک	دو انچ کا ٹکڑا
ہری مرچیں	دو سے تین عدد
ہرا دھنیا	کھانے کا ایک چمچہ
مکھن	کھانے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

دال دھو لیں اور ایک گھنٹہ تک بھیگی رہنے دیں۔ اب اسے قیمہ میں ڈال دیں اور اس میں نمک، سرخ مرچ، لہسن، آدھی ادرک اور آدھی پیاز سب کچھ نصف ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں، جب دال گل جائے تو قیمے کا پانی خشک کر لیں اور اتار کر باریک پیس لیں۔ اب اس میں باقی ادرک، پیاز، باریک کاٹ کر ملا دیں۔ انار دانہ اور گرم مسالا بھی پیس کر ملا دیں۔ ہرا مسالا بھی ملا دیں۔ اب آٹے میں میدہ ملا کر گوندھ لیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر اس میں تیار شدہ قیمہ بھر کر اس کے پراٹھے آلوؤں کے پراٹھوں کی طرح تل لیں۔

شربت آلو بخارا

ضروری اجزا :

آلو بخارے	ایک کلو
چینی	ڈیڑھ کلو
آلو بخارے کا ایسنس	چائے کا ایک چمچہ
پانی	ایک کلو

ترکیب :

آلو بخارے پانی میں دھو کر ڈال دیں اور پکنے کے لیے رکھ دیں۔ دو، چار جوش آنے کے بعد اتار لیں، تاکہ گٹھلی اور چھلکا علیحدہ ہو جائے۔ اب اس رس میں چینی ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب ایک تار کا شربت ہو جائے تو اس میں ایسنس ڈال دیں اور اگر پسند کریں تو ذرا سا زرد رنگ خوردنی بھی ڈال دیں۔ پھر اتار کر ٹھنڈا ہونے دیں اور بوتلوں کو خشک کر کے بھر لیں۔



لکھنے والے ہی جان سکتے ہیں
لفظ لکھنے میں جو قیامت ہے

تخلیق کار عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں' ان کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ بے کنار و بے انتہا اس دنیا میں ان کی قدریں سوچ اور فکری زاویے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک تخلیق کار زندگی کی حقیقتوں کو بڑی گہری نظر سے دیکھتا' محسوس کرتا ہے۔ وہ زندگی کو ایسے زاویے سے دیکھتا ہے جس پر دوسرا کوئی قادر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے تخیل سے سامنے کے مناظر سے وہ سچائی کھوج لیتا ہے جو عام نظر سے چھپی رہتی ہے۔

تخلیق کا عمل آسان نہیں' تضادات سے گھری زندگی کی سچائیوں کو بے نقاب کرنے کے دوران حسن توازن قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خواتین کے ساتھ تو اور مسئلہ ہے کہ انہیں بہت کچھ کہنا بھی ہے اور چھپانا بھی۔ ایک زمانے تک تو ان کے لیے لکھنا پڑھنا ہی ممنوع تھا پھر وقت کے ساتھ کچھ تبدیلی آئی اور انہیں لکھنے پڑھنے کی آزادی ملی تو بھی اپنے نام سے لکھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ فرضی ناموں سے لکھا۔

حقیقت تو یہی ہے خواتین نے اور شعبوں کی طرح ادب میں بھی خود کو منوالیا ہے' ان میں کہانیاں سننے کی فطری صلاحیت ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص تہذیبی رچاؤ' گہری حساسیت اور معاشرتی اتار چڑھاؤ اور نرم و نازک جذبات کا اظہار ہے۔ زبان و بیان میں محاورہ کے ساتھ بڑی فطری بے ساختگی نظر آتی ہے۔

سالگرہ نمبر کی روایت رہی ہے کہ ہم اپنی مصنفین سے مختلف سوالات کر کے آپ کو ان کے خیالات و احساسات کے نئے گوشوں سے متعارف کراتے ہیں۔ اس بار ہم نے مصنفین کے تخلیقی سفر کے حوالے سے سوالات کیے ہیں۔

(1) تخلیق کے سفر میں بہت سے اچھے برے تجربات ہوئے ہوں گے' تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ کبھی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا ہو گا۔ آپ کے تخلیقی سفر کا آغاز کب ہوا اور اب تک کیا تجربے ہوئے؟

(2) تخلیق کے سفر میں کیا پایا؟

(3) کوئی واقعہ یا کردار جس پر لکھنے کی خواہش کے باوجود نہ لکھ پائی ہوں؟

آیئے دیکھتے ہیں' ہماری مصنفین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

اس کارِ ہنر میں

ادارہ

سیما یاسمین مجتبیٰ

1 بہت ساری دلی دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ مجھے سالگرہ کے ساتھ وہ زمانہ بھی یاد آگیا' جب ریاض صاحب (مرحوم) محمود بابر فیصل (مرحوم) کی موجودگی میں کتنی رونقیں بکھر جاتی تھیں۔ کتنی خوب صورت ادبی باتیں' ہنسی' مذاق ہوتا تھا' کیا دن تھے وہ بھی۔

ہاں! تو بات ہو رہی تھی تخلیق کے سفر کے آغاز کی! تو بس اسی طرح بولتے باتیں کرتے ایک دن لکھنے بیٹھ گئے۔ وہ اس طرح کہ کونونٹ میں اردو کی ٹیچر نے ایک مضمون لکھنے کو دیا۔ اس پکنک پر جو کچھ روز پہلے اسکول کی طرف سے ہم نے منائی تھی۔ یہ کلاس V کے ساتھ انہوں نے اسے پوری کلاس کو خود پڑھ کر سنایا اور بڑی کلاسز میں بھی یہ کہہ کر کہ' اس میں تحریر کی خوب صورتی کے ساتھ پکنک کی پکچر کتنی دلکشی سے پیش کی گئی ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ خود بھی وہاں موجود ہے اور انجوائے کر رہا ہے۔

بس پھر تو جیسے مضامین کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ انعامات ملتے رہے اور ہم بھی بڑے ہوتے رہے' پاپا (مرحوم) اور امی بھی بہت سراہتے۔ اگر کوئی کمی محسوس کرتے تو اس کو

ڈسکس کرتے' یوں ان کی رہنمائی سے تحریریں نکھرتی گئیں۔

پھر جب میٹرک کے امتحان کے بعد چھٹیاں ہوئیں تو فرصت کے لمحات میں بیتا وقت بہت یاد آتا اور ہم خاموشی سے عادتاً" کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتے اور کبھی مضامین' تو کبھی کہانیاں لکھتے اور اپنی رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیتے۔

ایک بار وہ رائٹنگ فائل امی اور پاپا کے ہاتھ لگ گئی' وہ دونوں حیران رہ گئے کہ ان کی بیٹی تنہائی میں سوچتی ہے' غور و فکر کر کے مضامین اور افسانے لکھتی ہے' اور بس خاموشی سے پہلا مضمون اخبار جنگ اور افسانہ خواتین ڈائجسٹ میں بھیج دیا۔

اور پھر خوشی و حیرت کے ساتھ جب ہم نے پہلے ہی ہفتے جنگ میں اپنا مضمون اور خواتین ڈائجسٹ کے اگلے ہی شمارے میں افسانہ دیکھا تو آنسو آ گئے۔ یقین نہیں آیا کہ ہماری تحریر میں ایسا بھی کچھ ہے کہ محمود ریاض صاحب

اسے خواتین ڈائجسٹ میں جگہ دیں اور فون کر کے خوب صورت افسانہ لکھنے کی نہ صرف مبارک باد دی۔ فوراً "پاپا کے ساتھ ہم سے بھی ملاقات کی دعوت دے ڈالی۔

اور پھر ایک سلسلہ مضامین و افسانوں کا چل پڑا۔ ادبی رسائل' محمود شام صاحب کے "معیار" وغیرہ میں چھپنے لگے اور اس وقت کے بڑے بڑے رائٹرز جیسے غلام عباس' ڈاکٹر جمیل جالبی' احسان دانش اور انور سدید وغیرہ نے بھرپور تبصرے کیے کہ نوجوان نسل (ہاں بھئی نوجوان ہی تھے تب' سویٹ ففٹین کے) میں حقیقت نگاری پر منفرد انداز میں افسانے تحریر کرنے والی رائٹر سامنے آئی ہے' وغیرہ وغیرہ۔

ہاں اس بات پر ضرور تنقید کی گئی کہ افسانے طویل ہیں۔ جو نہیں ہونا چاہیے۔

ناولٹ بھی لکھے اور ناول تو بس دو مگر ان سب پر پاکستان اور انڈیا کی اردو نواز اس وقت کی معروف تنظیموں سے بے حد پذیرائی ملی۔ رئیس امروہوی مرحوم نے تو اپنے کالم میں تعریف کی میری تحریروں کی اور غلام عباس مرحوم نے تو یہاں تک کہا۔

"بہت مشکلات کا سامنا ہو گا تمہیں' کیونکہ تم نے زمانے سے ہٹ کر لکھا ہے۔ بہت کچھ ہے تمہارے افسانے اور انداز تحریر میں' اس لیے شاید ایک وقت ایسا آئے کہ تم لکھنا چھوڑ دو' کیونکہ افسانہ کمرشلائزڈ ہو جائے گا اور تم ان لوگوں میں سے نہیں' اندر کی آواز سے لکھتی ہو۔"

پتا نہیں کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اب وہ زمانہ' وہ پیارے لوگ ہی نہیں رہے' وہ قاری نہیں رہے' جو سچائی حقیقت نگاری وغیرہ کو پسند کرتے تھے۔ آج کل تو ہر پہلا شخص افسانے لکھتا ہے اور کتابیں چھپوا لیتا ہے۔ اسی لیے رسالوں' ڈائجسٹوں میں بھی معیار گر رہا ہے۔

یہ سب کچھ تلخ سہی' لیکن میرے مشاہدے اور تجربے سے گزر رہا ہے۔ اس لیے لکھ دیا۔

ہاں! اپنے خوش گوار تجربات میں پہلے افسانے کی کتاب کی اشاعت بھی شامل ہے۔ جسے خواتین ڈائجسٹ کے روح رواں و سربراہ محمود ریاض صاحب نے شائع کیا تھا۔ پاکستان اور بیرون پاکستان زبردست پذیرائی اور ایوارڈز بھی ملے' براہ راست لوگوں نے بتایا کہ ان افسانوں کا کوئی نہ کوئی پہلو ان کی زندگی پر اتنے مثبت انداز میں اثر انداز ہوا کہ زندگی سنور گئی اور دلوں میں اپنے لیے یہ پیار' یہ خلوص دیکھ کر احساس ہوا طمانیت کا' اللہ کی بے حد شکر گزار رہی' بہت سارے دانش ور' اہل قلم' نقاد ان افسانوں کی وجہ سے ہی میرے دوست بنے۔

تجربات تو اتنے بے شمار ہیں' خوب صورت بھی اور تلخ بھی اگر لکھنے بیٹھوں تو بھرپور ایک کتاب بن جائے گی۔ میرے تجربات کا سمندر ملک سے باہر تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی جھلک میرے عزیز قارئین کو میری تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔

2۔ خوب صورت اور ذہنی سوچ کا حامل سوال ہے۔ اگر آپ مادی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو مجھے نہیں لگتا کہ یہ بات اہم ہے' کیونکہ جو تھوک کے بھاؤ لکھتے ہیں اور ہر میڈیا میں نظر آتے ہیں' ظاہر ہے انہوں نے پیسہ ہی پیسہ پایا ہوتا ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں سوچتی' پیسہ ضرورت ہے' لیکن حاصل زندگی نہیں۔

ڈھیر ساری خلوص محبتوں کا ادراک ہوا' خود سے فاصلوں پر کھڑے سلگتے وجود بھی نظر آنے لگے' دنیا اور اس کی پہلی

مال کی اہمیت نہ رہی۔ بس ایک احساس دل میں بیٹھ گیا کہ زندگی فانی ہے‘ اس کی کیا پروا کرنا۔ ہاں‘ جو لافانی ہے‘ ابدی ہے‘ خوب صورت اسے بنانا چاہیے۔

ویسے جرمنی میں رائٹر ہونے کی حیثیت سے حکومت کی طرف سے ہمیں بڑا اور خوب صورت گھر اور اضافی الاؤنس (مارک / یورو) ملے تھے۔ کیونکہ وہاں کی حکومت رائٹرز کا بہت احترام کرتی ہے اور ان کے سکون دل و ذہن کا بھی خیال رکھتی ہے۔ یہ سب پیپرز پر ثبوت کے طور پر موجود ہے۔

اور ایک یہ مشکل بھی بطور تحفہ ملی کہ کوئی کہانی لکھو تو لوگ اس میں اپنی شکل دیکھنے لگتے ہیں اور یقین کریں‘ جس کے دل میں چور ہو وہ تو باقاعدہ لڑائی‘ جھگڑے پر اتر آتی ہیں۔ (خواتین بطورِ خاص) شاید اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں اپنے کردار اسی دنیا کے انسانوں سے لیتی ہوں‘ کوئی ماورائی نہیں ہوتے۔ یوں جو منفی سوچ کے لوگ ہیں‘ وہ پھر تلملا اٹھتے ہیں اور مجھے یہ حیرت ہوتی ہے کہ دیگر نیک خوبصورت کرداروں میں ان کو اپنی شکل نظر کیوں نہیں آتی۔ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

3 : ہاں‘ ایسے کردار اور واقعات کافی ہیں‘ جن کو چاہتے ہوئے بھی میں تحریر نہیں کر پائی۔ کبھی ان کی شدت میں کھو جاتی ہوں اور کبھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھرپور طریقے سے گرفت میں نہیں آرہے۔

مثال کے طور پر‘ میری ایک ترک دوست تھیں۔ بہت خوبصورت اور پیاری سی۔ ان کو ایک پاکستانی سے محبت ہوگئی۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ بظاہر دیکھنے میں چھوٹے سے قد کے‘ کالے رنگ کے نہایت عام سے آدمی تھے اور میری دوست..... جیسے پری۔

قصہ مختصر‘ دونوں کی شادی ہوئی اور اپنی زندگی کے بائیس سال انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں بالکل اجنبی ماحول‘ میں صرف شوہر کی محبت میں گزارے۔ ان کے بچے نہیں تھے‘ وہ بہت اچھے خاندان سے تھیں اور جب پروفیسر صاحب ریٹائر ہوئے تو میری دوست نے ان سے کہا کہ اب وہ ترکی چلیں‘ تاکہ وہ بھی اپنے والدین‘ بہن بھائیوں کے ساتھ رہ سکیں اور وہ یونیورسٹی میں جاب کرسکتے ہیں مگر انہوں نے صاف انکار کردیا۔

”میں اجنبی زبان‘ ملک میں اپنے لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

وہ بولیں۔ ”میں بھی تو آئی تھی۔“

لیکن وہ نہ مانے اور بائیس سال بعد طلاق ہوگئی ان دونوں کی اور وہ روتی ہوئی واپس گئیں۔ یہ حقیقت ہے زندگی کی۔

انہوں نے لاتعداد بلیاں پال رکھی تھیں اور اپنے بچوں کی طرح ان کو چاہتی تھیں۔ یہ کہانی شاید کسی کے لیے لکھنا بہت آسان ہو لیکن میرے لیے نہیں۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی کہانیاں اور کردار ہیں جن پر لکھنا چاہتی ہوں مگر قلم ساتھ نہیں دیتا اور سب سے بڑھ کر جو کردار‘ واقعات ہیں جن پر میں لکھنا چاہتی ہوں‘ وہ نادان مسلمانوں کی امریکیوں کی غلامی کے واقعات ہیں۔ اتنے حالات خراب ہونے پر بھی لوگ امریکہ جانے پر تیار رہتے ہیں۔ ہمیں تو بیس سال باہر رہ کر کے ان لوگوں کی چائے کی پیالیوں‘ گلاسوں وغیرہ سے گھن آتی ہے۔ تلخی بڑھ گئی ہے‘ اس لیے یہاں اختتام کرتے ہیں۔

نادیہ جہانگیر

1 بے شک زندگی تجربات ہی کا نام ہے اور انسان کا تو کام ہی لمحہ بہ لمحہ نئے سے نیا تجربہ کرنا ہے۔

ہم لکھاری جب بھی کچھ نیا سوچتے ہیں..... لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو یہ بھی ہمارا تجربہ ہی ہوتا ہے‘ کوئی نیا‘ کوئی انوکھا۔ کبھی کبھی ہم پرانے تجربات کو ہی نئے اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لفظوں کا ساتھ اپنا کر صدیوں پرانے موضوعات کو پھر سے نیا کرکے جیسے پھر سے جوان کرتے ہیں اور یہی بات ہوتی ہے کہ پڑھنے والے ہمارے تجربات کو سراہتے بھی ہیں اور داد بھی دیتے ہیں۔

جہاں تک میرے تخلیقی سفر کے آغاز کا سوال ہے تو اس کا جواب کافی لمبا چوڑا ہے۔ میں نے لکھنے کا آغاز اس وقت کیا تھا‘ جب نہ تو مجھے لفظ بننے آتے تھے اور نہ جملوں کو ایک ساتھ پرونا آتا تھا۔ اور یہ شوق صرف مجھے نہیں تھا‘ میرے پیچھے موجود اس ہستی کا بھی تھا جو میرا نام چاہتی تھی‘ میری پہچان چاہتی تھی اور مجھے ایک نہ ایک دن اونچے مقام پر دیکھنا چاہتی تھی۔

اور جب میرا نام بننے لگا' میری پہچان ہونے لگی تو
بدقسمتی سے وہ میری پشت سے ہٹ گئی' غائب ہوگئی۔
ثوبیہ جہانگیر' نادیہ جہانگیر کی ذات کو ادھورا کر گئی۔
شاید میں تب میٹرک کر رہی تھی' جب ثوبیہ کے تھپکی دینے پر لکھنے بیٹھ گئی تھی۔ تب کامیاب تو نہ ہو سکی اور نہ ہی کہیں سے مثبت جواب مل سکا' مگر یہ ثوبیہ ہی کی شہہ اور اس کی حوصلہ افزائی تھی کہ میں نے ہمت ہارنے کی بجائے ہمت مجتمع کرنا شروع کر دی اور اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب میری اور ثوبیہ کی محنت رنگ لائی جب "شعاع" اور "کرن" میں بیک وقت میرے دو افسانے "کیا کہنا" اور "سائبان" شائع ہوئے۔ جن کی اشاعت پہ میں کم اور ثوبیہ مجھ سے زیادہ خوش تھی۔

میرا یہ لکھنے کا تجربہ ثوبیہ ہی کی وجہ سے کامیاب ہوا' اسی کی وجہ سے آگے تک پہنچا اور اسی کی وجہ سے آج نادیہ جہانگیر افسانہ نگاروں میں "چھوٹا سا" نام بنانے میں کامیاب ہوئی۔

میری تعریف' توصیف اور ملامت مجھ سے زیادہ ثوبیہ کے لیے اہمیت رکھتی تھی اور آج تک جتنے بھی روکھے' پھیکے' رومانوی اور آسودہ سے تجربات کر چکی ہوں' اس کی تھپکی اور اس کی حوصلہ افزائی کی بنا پہ کیے۔

2 :

لفظوں سے کھیلنے میں کیا بیٹھی
میں نے زندگی کو پا لیا

بظاہر تو اسی چھوٹے سے شعر میں' میں نے تمام بات کہہ دی ہے مگر اس کے باوجود میں یہ بھی کہوں گی کہ تخلیق کے سفر میں تھوڑی بہت شہرت' بہت زیادہ عزت اور ان کے علاوہ بہت ساری محبتیں لوٹانے والی دوستیں پائی ہیں اور یہ دوستیں بھی وہ ہیں' جنہوں نے نادیہ جہانگیر کو بے سہارا نہیں ہونے دیا' ہر مشکل کی گھڑی میں نادیہ کے سامنے اپنے مضبوط کندھے کر دیے۔ ان کا خلوص' ان کی محبت' اپنائیت اور چاہت میرا کل اثاثہ ہے۔ جتنا یہ مجھ سے محبت کرتی ہیں' میں اس سے بڑھ کر ان سے محبت کرتی ہوں۔ مگر یہ بھی ہے کہ میں اظہار بہت کم کرتی ہوں۔ اور آج مجھے تھوڑا سا موقع ملا ہے تو میں ان سب سے ہی یہ کہوں گی۔ "مجھے تم سے بہت محبت ہے.... تم ہو تو نادیہ ہے' تم نہیں تو نادیہ بھی نہیں۔"

3 : مجھے یاد ہے میں اور ثوبیہ ایف۔ ایم بہت شوق سے سنتے تھے۔ ایف ایم پہ آنے والا ہر پریزینٹر ہمیں اپنے گھر کا فرد لگتا تھا۔ پریزینٹرز کو کالز کرنا اور لمبے لمبے خطوط لکھنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میں شاید ایف۔ اے کر رہی تھی' جب ہمارے ایک پسندیدہ ڈی جے "کاشف خان" کی ڈیتھ ہو گئی میں اور ثوبیہ بہت غمگین ہوئے' بہت روئے تھے اور تب ثوبیہ نے میری توجہ "کاشف خان" کے کردار کی طرف مبذول کرائی اور میں نے قلم کاغذ پکڑ لیا۔

میں نے اس شخص پہ ایک ناول لکھا جو "کرن" کی زینت بنا اور پڑھنے والے ہر قارئین نے اسے نہ صرف سراہا بلکہ اسے پسندیدگی کی سند بھی بخشی۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے واقعات اور بے شمار کردار ہیں جن پہ میں لکھنا چاہتی ہوں' مگر اپنی ازلی سستی اور کاہلی کی بنا پر اپنی اپنی خواہشات کو دبائے ہوئے ہوں۔
کبھی کبھی میرے من میں یہ خواہش شدید قسم کی انگڑائی لے کر جاگتی ہے.... کاش! مجھ میں پھرتی آجائے۔ کاش! میں لکھنے بیٹھوں تو جو من میں ہے تمام تر لکھ دوں۔
مگر کیا کروں یہ انگڑائی کسی کسی وقت آتی ہے اور میں ایسی انگڑائیوں کو کم ہی لفٹ کراتی ہوں۔ لیکن کبھی کبھار ایسی بھی خواہش سر اٹھاتی ہے کہ کاش! کوئی ایسا آلہ ہوتا کہ میں صرف سوچتی اور وہ سارے کا سارا لکھ دیتا۔ یہی وجہ ہے خواہش کے باوجود بہت سے کردار اور بہت سارے واقعات جوں کے توں پڑے ہیں۔

باقی آئندہ شمارے میں

اعتذار

بہن رفعت ناہید سجاد کا ناول "چراغ آخر شب" تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل اشاعت نہ ہو سکا۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ قارئین ناول کی قسط پڑھ سکیں گی۔

باتیں کتابوں کی

سائرہ غلام نبی

کتاب — گیتا گیت
گیت نگار — احمد عمر شریف
ناشر — پاکستان رائٹرز گلڈ
قیمت — 150 روپے

ما قبل تاریخ کا واقعہ ہے کہ آدمی نے اندھیرے غاروں سے نکل کر زندگی کی سرسبزی میں قدم رکھا تو احساس حیرت اس کے ہم قدم ہولیا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو اس نے دیکھا شفاف فضاؤں میں زمین سے پھوٹنے والے چشمے گنگنا رہے تھے' سرسر کرتی باد صبا اس کے بہت قریب سے گزر رہی تھی' موسم بدلتے تھے تو کن من گرتی بارشوں کی بوندیں' اس کے اندر سیرابی پیدا کرتی تھی' پی کہاں' پی کہاں' پپیہا بے قرار پکارتا تھا۔ کوئل کی درد بھری کوک اس کے اندر ہوک بھر دیتی تھی۔ زرد موسموں میں "چرمر" کرتے پتے عجب اداسی کا رنگ بکھیر دیتے۔ پہلی بار انسان نے آوازوں کی تکرار سے باطن کے آہنگ کو آمیز کیا تو اس نے فطرت سے غم اور خوشی کے احساس کو پایا اور مختلف رتوں میں مختلف لحن کو اپنایا اور گنگناتے ہوئے اپنے جذبوں کا اظہار کا سلیقہ سیکھ گیا۔ لوک گیتوں کی ابتدا کب ہوئی اور کہاں سے ہوئی۔ اس کا سراغ نہیں ملتا۔ غالباً "غیر ارادی طور پر خود بخود لبوں سے بے ساختہ نکلے اور رواج پا گئے۔ یہی گیت کسی بھی شعر و ادب کی بنیاد ٹھہرے ان گیتوں کے موضوعات آس پاس کی زندگی تھی جو انسان کی سادگی سچائی اور بھولپن کی سرشت کو ظاہر کرتی ہے۔ فصلوں کی کٹائی کرتے ہوئے' بوجھ ڈھوتے ہوئے' ڈولی اٹھاتے ہوئے' دھان کوٹتے ہوئے' چکی پیستے ہوئے' موسم کے پکوان پکاتے ہوئے' میلوں ٹھیلوں میں جاتے ہوئے' جھولے کی پینگیں لیتے ہوئے گائے جاتے رہے۔

آج کے شہری منظرنامے میں جہاں شور کا ہنگام ہے۔ ... کی پاں ہے پہیوں کی چرچراہٹ ہے' بریکوں کی چیخیں ہیں' ایمبولنسوں کی کراہ ہے' موبائل فونوں کی رنگنگ ٹونز ہیں' ان مشینی آوازوں کے بیچ فرد کے حواس جواب دے رہے ہیں۔ اسی فرد کو طمانیت کے' عافیت کے لمحات درکار ہیں۔ غنیمت ہے کہ اس شہری فضا میں آج بھی احمد عمر شریف جیسے گیت نگار ہیں' جو شور شرابے میں گیتوں کی مدھرتا کا' موسیقی کی سندرتا کا من موہنا سا احساس عطا کرتے ہیں۔ اور سبک جذبوں کا اظہار کرتے ہیں۔

احمد عمر شریف ایسے کوی ہیں جو لفظوں کی مترنم ترتیب سے اس کی مدھرتا سے' خوب صورت نرماہٹ سے' شیرنی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ جو کانوں سے اترتے ہیں تو سننے والا بے ساختہ استھائی گنگنانے لگتا ہے۔ کچھ عرصے قبل ان کی گیتوں پر مشتمل مجموعہ "گیتا گیت" شائع ہوا ہے۔ جو پچھلے دنوں میرے زیر مطالعہ رہا۔ سچ پوچھیے تو میں نے اس مجموعے کے ساتھ زندگی کے کچھ عافیت کے لمحات پائے' خیال کی مالا' لفظوں میں ایسا پرویا گیا ہے کہ سریلے پن کے احساس نے اندر جوت جگادی اور بے اختیار جی چاہا کہ لے سے لے ملا کر دور انجانے سفر پر نکلا جائے اور زندگی کے بوجھ کو ہلکا کیا جائے۔

اس مجموعے کا پہلا گیت جس کا انہوں نے عنوان دیا ہے "گیتا گیت" اس گیت کو پڑھ کر گویا یا تمہید بنتی ہے کہ احمد عمر شریف کی گیتوں کا کیا رنگ ہے۔ کتنے زاویے ہیں' کتنی باریکیاں ہیں' اور وہ کومل سروں میں شعور کی کن گرہوں کو کھولنا چاہتے ہیں۔ گیت دیکھیے

میرے گیتوں کی وہ پوتھی ہے
جس کی اوٹ میں
دھرتی کے رنگ منچ پر
کوک کی ہوک سے
آکاش کے انجانے سرے تلک
ہر پل ایک سرگم کھوج ہے

وہ شعور کی ربط سے سریلا راگ الاپتے ہیں تو زندگی کو اندر تک جاننے کی جستجو میں سردھننے لگتے ہیں' اندھیروں میں یقین کے جگنو تلاشتے ہیں۔ وہ باہر کی وحشتوں سے اندر کی دنیا آباد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خارزاروں سے گزرتے ہوئے اپنے اندر مزید گداختگی سمو لیتے ہیں۔ جس سے گیت کار کا لہجہ نرم' کومل اور سندر ہو جاتا ہے۔

پاپ اور پن کے راگ چھپے ہیں
من بستی کے اندر
راگی بس وہ راگ الاپے
جو بھیتر وہ باہر

عموماً" گیتوں کی فضا بہت رومان انگیز ہوتی ہے' احمد عمر شریف اس رومان انگیز فضا میں یوں تو موجود ہیں۔ زندگی کی رنگارنگی سے لطف کشید کرتے ہیں تو زندگی کے نئے معنی اپنی گرہیں کھولنے لگتی ہے اور عارضی خوشی کا سرا ابدی غم سے جیسے جڑ جاتا ہے۔ وصال کی گھڑی' جدائی کو لیے کھڑی ہے۔ لڑکی کی "رخصتی" کا گیت گاتے گاتے عارضی جدائی کے غم کو ابدی غم سے جوڑ دیتے ہیں۔ یہ انتراد یکھیے

مکھڑا تھا میکے میں جھلمل روپہلا
ساجن کی انکھین میں میلا کچیلا
سکھیو نہلاؤ' بساؤ "اگر" سے
سنوارو دلہن کو پیا کی نجر سے
نگوڑی ' ابھاگن ' ہو جلدی سوار

احمد عمر شریف نے "گیتا گیت" میں انسان کی اداسیوں کو اس کے دکھوں کو بھی رقم کیا ہے اور یہی ان کے گیتوں کا خاص لہجہ ہے' جو آج کے منظر نامے میں انہیں الگ کر رہا ہے۔

✡ ✡ ✡

شعری و عکسی مجموعہ ـــــ پورے تن کا ادھورا پن
شاعر و مصور ـــــ ندیم سبطین
قیمت ـــــ 199 روپے

ندیم سبطین سے میرا پہلا تعارف ان کے قطعات سے ہوا۔ وہ اپنے قطعات ۔ یعنی چار مصرعوں میں' معاملات زندگی کو شعر کرتے ہیں۔ وہ ایک پرجوش ' حساس دل اور فنکارانہ صلاحیت رکھتے ہیں' حالات حاضرہ پر کڑھتے ہیں اور اس کڑھن سے جو دکھن پیدا ہوتی ہے۔ اسے قطعات میں ڈھال لیتے ہیں۔ حال ہی میں ان کا مجموعہ کلام "پورے تن کا ادھورا پن" مجھے موصول ہوا۔ جس کے سرورق کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف اپنے احساسات کو لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ بلکہ وہ رنگوں سے بھی اپنے جذبوں کا اظہار کرتے ہیں۔ یعنی وہ شاعر بھی ہیں اور مصور بھی' اس مجموعے میں ان کی شاعری بھی ہے اور ان کی بنائی ہوئی تصویروں کا عکس بھی۔

ندیم سبطین کی شاعری میں جبر استحصال کا احتجاج ملتا ہے۔ وہ صورت حال کو باشعور فرد کے طور پر دیکھتے ہیں اور حساسیت سے نظموں میں ڈھال دیتے ہیں۔ شاعری میں ان کا لہجہ دو ٹوک ہو جاتا ہے' جبکہ اپنی مصوری میں قدرے تجریدی انداز میں رنگوں سے کیفیات ابھارتے ہیں۔ اور کم لکیروں میں اپنا اظہار کر دیتے ہیں۔ کہیں تیز اور کہیں مدھم رنگ ان کی کیفیات کے زیروبم کو ظاہر کرتے ہیں۔

"پورے تن کا ادھورا پن" سے چند اشعار۔

بے فیض منزلوں کی طرف جا رہا ہوں میں
کیسے کہوں کہ ترے پاس آ رہا ہوں میں

خواب کیا کیا نہ سہانے ہیں بہت
زندہ رہنے کے بہانے ہیں بہت

✡ ✡ ✡

کتاب ـــــ بسم اللہ کا جن
مصنفہ ـــــ قانتہ رابعہ
ناشر ـــــ منشورات ملتان روڈ
قیمت ـــــ 35 روپے

قانتہ رابعہ کا اسلوب اصلاحی ہے۔ وہ ایسی استاد کی مانند ہیں۔ جو بھٹکے ہوؤں کو بہتری کی تعلیم دینے کا عزم رکھتی ہیں ۔ جو صورت حال کو بدل دینے کا مصمم ارادہ رکھتی ہیں۔ وہ اسی شعور کے ساتھ افسانہ نگاری بھی کرتی ہیں۔ اور بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھتی ہیں۔ حال ہی میں بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ "بسم اللہ کا جن" شائع ہوا ہے۔ جس کے پیش لفظ میں ان کا کہنا ہے۔ "ہر ایک ان کہانیوں کو پڑھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھے کہ ان کہانیوں میں ایک پیغام چھپا ہوا ہے۔ اس پیغام کو تلاش کرنا' سمجھنا اور عمل کی کوشش کرنا آپ کا کام ہے۔" قانتہ رابعہ کی کہانیوں کے عنوانات سے ہی ان کی اصلاحی کوششوں کا احوال مل جاتا ہے کہ وہ دور حاضر کی برائیوں سے بچوں کو محفوظ رکھنا چاہتی ہیں۔ کہانیاں سادہ اور آسان زبان میں ہیں۔ بچے با آسانی پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔

عدنانہ

نفسیاتی الجھنیں اور ان کا حل

پہلے بھی کئی بار لکھا جا چکا ہے کہ احساس برتری دراصل احساس کمتری کی دوسری شکل ہے اور پہلی کے مقابلے میں زیادہ بری اور خوفناک' احساس کمتری ــــــــــــ کسی طور بری چیز نہیں ہے بشرط انسان اسے اپنے اوپر مسلط نہ کرلے کیونکہ ہر انسان کسی نہ کسی سے کمتر اور کسی نہ کسی سے برتر ہے۔

لیکن وہ شخص جو احساس کمتری کو احساس برتری کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے وہ دراصل احساس کمتری کا شکار ہے۔

احساس برتری کا شکار جھوٹ' غلط بیانی اور ظاہری نمائش سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن اس کی باتوں میں معقولیت کم اور غلط بیانی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے خاطر رہن سہن' دکھاوا' ظاہرداری سے کام لیتا ہے' تاکہ دیکھنے والے اس کی آن بان دیکھ کر متاثر ہوں بلکہ اکثر اوقات دعوتیں اس انداز سے کرتا ہے جس کا مقصد تواضع کم گھربار کی نمائش زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے احساس کمتری کو چھپانے کی خاطر سخاوت دکھاتا ہے۔ یا دکھاوے کی خاطر تحائف دیتا ہے کہ سامنے والے پر اپنی بڑائی ثابت کرسکے حالانکہ اس کے پیچھے خلوص نہیں ریاکاری' ظاہرداری اور دکھاوا ہوتا ہے اور سامنے والے کو اپنی امارت کا احساس دلانا بھی۔

احساس برتری کا شکار لوگوں میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ بے حد حاسد اور ابن الوقت ہوتے ہیں۔ نقالی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ کسی کو کھاتا پیتا ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے جس کی وجہ سے وہ ہر وقت ذہنی طور پر الجھے اور پریشان رہتے ہیں حالانکہ وہ لوگوں پہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بالکل مطمئن زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی بڑائی کرتے وقت اپنی اصلیت کو بھول جاتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں اور برائیوں کی پردہ پوشی کی خاطر دوسروں پر الزام تراشی' نکتہ چینی کرکے ان کی انا کو تسکین ملتی ہے کسی کی خوبیاں ان سے برداشت نہیں ہوتیں بلکہ یہ دوسروں کی کمزوریوں کی تلاش میں اپنا ذہن اور وقت برباد کرتے ہیں اور نتیجے کے طور پر زود رنج ہوتے ہیں۔ حقیقت کا سامنا کرتے گھبراتے ہیں۔ تصورات میں کھوئے رہتے ہیں۔

دوسروں کے بارے میں باتیں کرکے' ان پر جھوٹے الزامات دھر کر وہ اپنی بڑائی ثابت کرنے کی سعی رائیگاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگ لاشعوری طور پر اپنی کمی کی تلافی چاہتے ہیں یا اپنی کسی کمی یا کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں تاکہ ایک تو ان کی پول نہ کھل جائے' دوسرے لوگ ان کے تصنع سے متاثر ہوجائیں اور ان کی برائیوں کی طرف نہ دیکھ سکیں حالانکہ ہوتا اس کے برعکس ہے لوگ ایسے لوگوں کے منہ پر مروتاً خاموش رہتے ہیں' ان کی ہاں میں ہاں بھی ملاتے ہیں لیکن دل ہی دل میں اصل حقیقت کو سمجھتے ہیں اس طرح احساس برتری کا شکار بیشتر اوقات اپنی کوشش میں ناکام رہتا ہے حالانکہ اسے یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

ا م س..... گوجرانوالہ

خاتون! آپ نے اپنی بیٹی کے متعلق لکھا ہے۔ مختصراً" کچھ اس طرح ہے کہ اس کی عمر پندرہ سال ہے۔ وہ میٹرک کا امتحان دے چکی ہے۔ جسمانی طور پر صحت منداور خوش شکل ہے۔ گھر کا کام کاج ذمہ داری سے سرانجام دیتی ہے' بااعتماد ہے' بڑوں کی عزت و احترام بھی کرتی ہے۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال میں آپ کا ہاتھ بٹاتی ہے قرآن شریف ترجمہ کے ساتھ پڑھ رہی ہے۔ دینی کتب کا مطالعہ بھی کرتی ہے۔

خرابی (اگر اسے خرابی کہا جائے) صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنا مافی الضمیر صحیح طریقہ سے بیان نہیں کر سکتی۔ اپنی بات کے لیے دلیل نہیں دے سکتی۔ آپ خود سوچیں کیا یہ اتنی بڑی بات ہے کہ آپ اس کا رشتہ خاندان میں نہ کرنے کا سوچ رہی ہیں؟ آپ کی بیٹی میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک اچھی لڑکی میں ہوتی ہیں۔ بولنے میں نقص کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو حل نہ کیا جا سکتا ہو۔ لیکن اس کے لیے سائیکاٹرسٹ سے مشورہ بے حد ضروری ہے۔

آپ کی بڑی بیٹی چھوٹی بیٹی سے مختلف ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں کچھ کمی ہے۔ جو چھوٹی چھوٹی باتیں آپ نے لکھی ہیں۔ وہ اتنی اہم نہیں۔ آپ تو تعلیم یافتہ ہیں' ٹیچنگ کر چکی ہیں۔ آپ کو بخوبی اندازہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو یکساں صلاحیتیں نہیں دی ہیں۔

م..... لاہور

ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے مختلف صلاحیتیں دی ہیں اگر ایسی ذہنی قوتوں کو کسی کام میں نہ لایا جائے تو یہ ذہنی قوتیں پلٹ کر حملہ کر دیتی ہیں اور ڈپریشن کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ابھی آپ بہت کم عمر ہیں۔ اس عمر میں کرنے کے بے شمار کام ہوتے ہیں' کسی کام میں دل لگائیں۔ آپ نے اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اگر تعلیم حاصل میں کوئی مسئلہ ہے تو کوئی کورس شروع کر دیں۔ کمپیوٹر' سلائی' پکوان وغیرہ آج کل تو بے شمار کورس کرائے جا رہے ہیں' آپ کسی میں بھی داخلہ لے سکتی ہیں۔

دوسرا مسئلہ جسمانی صحت ہے اگر کوئی تکلیف ہے تو اس پر توجہ دیں' تنہائی میں اپنا تجزیہ کریں جن باتوں پر غصہ آیا تھا۔ ان کے بارے میں سوچیں کہ غصہ کیوں آیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ جو کچھ چاہتی ہیں وہ آپ کو حاصل نہیں؟ اچھی! بہن زندگی میں کسی کو بھی خواہش کے مطابق مکمل سب کچھ نہیں ملتا' اس کے لیے کوشش محنت کرنا پڑتی ہے اور آپ کے سامنے تو ابھی زندگی پڑی ہے۔ مایوس ہونے کی تو بات ہی نہیں ہے۔ وقت آنے پر شادی بھی ہو گی اور ان شاء اللہ کامیاب بھی ہو گی۔

زیادہ اچھی بات ہے کہ آپ ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں۔ ایسی دوائیں آچکی ہیں جن کے استعمال سے آپ پر خوشگوار اثرات ہوں گے۔

ب۔ع..... شاہ کوٹ

ج : بہن کی شادی اب تک نہ ہونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ جادو یا بندش ہے۔ آپ کی بہن کی عمر بھی اتنی زیادہ نہیں ہے کہ آپ مایوس یا پریشان ہو جائیں' اپنی بہن سے کہیں کہ وہ تعلیم جاری رکھیں اور اگر تعلیم مکمل کر چکی ہیں تو کہیں جاب کر لیں یا کوئی کورس وغیرہ کر لیں وہ لوگوں سے ملیں گی تو اس سے ان کی شخصیت پر خوشگوار اثرات ہوں گے۔ خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ ورنہ صرف شادی کے بارے میں سوچ سوچ کر ڈپریشن کا شکار ہو جائیں گی۔ آپ اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھیں' مقررہ وقت پر آپ کی بہن کی شادی ضرور ہو گی (ان شاء اللہ)

جہاں تک امی کی بیماری کا تعلق ہے' وہ سراسر ذہنی مسئلہ ہے اس کی وجہ بہن کی شادی نہ ہونا نہیں ہے انہیں باقاعدہ کسی سائیکاٹرسٹ سے علاج کرانے کی ضرورت ہے۔ لاہور میں کافی بڑے اسپتال ہیں۔ وہاں سے اچھے سائیکاٹرسٹ کے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔



امت الصبور

بیوٹی بکس

سونیا افضل ـــــ دینہ

س : میں ایک گاؤں میں رہتی ہوں' یہاں کوئی بیوٹی پارلر نہیں ہے جہاں جا کر کسی سے مشورہ کرلوں۔ میرے بال بہت چھوٹے ہیں۔ کافی عرصے سے بڑھنے کا تو نام ہی نہیں لے رہے۔ خشکی بھی بہت ہے۔ اس علاقے کا پانی کھارا ہے اس لیے ہر روز شیمپو کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ حالت ہو جاتی ہے کہ دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا۔ مجھے بہت شوق ہے کہ میرے بال لمبے سلکی ہو جائیں؟

ج : کھارے پانی سے بال نہ دھوئیں سر دھونے کے لیے میٹھے پانی کا کہیں سے انتظام کرلیں۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو آپ رات کو پانی ابال کر کسی برتن میں رکھ لیں رات بھر میں نمکیات تہہ میں بیٹھ جائیں گے۔ صبح اس پانی سے سر دھوئیں۔

خشک بالوں میں شیمپو کم سے کم کریں صرف ہفتے میں ایک بار کریں۔ شیمپو سر پر لگانے سے پہلے اس میں دو چمچے پانی ملالیں پھر پتلا کرکے سر پر لگائیں۔

خشک بالوں کے لیے ذیل میں چند نسخے دیے جارہے ہیں

۔ ایک کپ مکھن نکلے دودھ میں ایک انڈا پھینٹ لیں۔ خوب جھاگ نکل آنے کے بعد اسے سر کی جلد پر مل لیں۔ پانچ منٹ تک لگا رہنے دیں پھر سر دھوئیں۔ یہ عمل ہفتے میں ایک بار کریں۔

ناریل کو اچھی طرح گرائنڈ کریں۔ پھر اسے صاف کپڑے سے چھان لیں۔ ناریل کا دودھ نکل آئے گا۔ اس میں کھانے کے دو چمچے بیسن ملا کر پیسٹ بنالیں اسے سر پر لگا کر ہلکے ہلکے مساج کریں دس منٹ بعد سر دھولیں۔

بالوں میں تیل ضرور لگائیں۔ سرسوں یا ناریل کا تیل بالوں کے لیے مناسب رہتا ہے۔ سوہنی ہیئر آئل بھی بالوں کے لیے مفید ہے۔ تیل کو چند گھنٹوں سے زیادہ نہ لگائیں۔ رات کو لگائیں' صبح سر دھولیں تاکہ مسام بند نہ ہوں۔

بالوں کے لیے وٹامن اے اور ای بھی بہت ضروری ہیں۔ سبزیاں اور پھل زیادہ مقدار میں کھائیں' خصوصاً گاجر اور سیب۔

وٹامن ای کے کیپسول بھی بازار میں دستیاب ہیں آپ ڈاکٹر کے مشورے سے استعمال کر سکتی ہیں۔

ثمینہ حکیم ـــــ کراچی

س : میرے ہونٹ کالے ہیں' میں چاہتی ہوں میرے ہونٹ گلابی ہو جائیں؟

ج : ثمینہ! ہونٹوں کو گلابی کرنے کے لیے آپ ناریل کا ایک چھٹانک تیل لے کر اس میں ایک عدد لیموں نچوڑ لیں اور اس کو کسی کھلے منہ کی شیشی میں ٹھنڈی جگہ پر رکھ دیں۔ دن میں کئی بار وہ محلول ہونٹوں پر لگائیں۔ انشاء اللہ ہونٹ گلابی ہو جائیں گے۔

